قیدِ حیات
محی الدین نواب

قیدِ حیات

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کھیتوں میں فصل پک رہی تھی۔ابھی وہ نہیں پکی تھی۔صرف سات برس کی تھی۔ اس کا قد کھڑی فصل سے بھی چھوٹا تھا۔وہ کھیت میں آ کر ساری دنیا سے چھپ گئی تھی۔چاروں طرف گھوم کر دیکھا' کوئی اسے دیکھنے والا نہیں تھا۔وہ مطمئن ہو گئی۔شلوار اتار کر بیٹھ گئی۔

ابھی بے لباسی اور بے حیائی کو نہیں سمجھتی تھی۔اس کی ماں نے اور بڑی بہن نے سمجھایا تھا۔"اب تیرے ننگے گھومنے کی عمر نہیں ہے۔کپڑے بدلنے ہوں تو دروازہ بند کر لیا کر۔"

پنڈ کے بچے ہوں یا بوڑھے۔عورتیں ہوں یا مرد سب کھیتوں میں ہی رفع حاجت کے لئے جاتے ہیں۔عورتیں تنہا نہیں جاتیں۔ ماں بیٹیاں' بہنیں یا پڑوسنیں ایک دوسرے

کے ساتھ جایا کرتی ہیں۔ اس وقت دن کے دو بجے تھے۔ سورج جیسے سوا نیزے پر تھا۔ ایسی دھوپ، ایسی گرم لُو چل رہی تھی، جیسے جہنم کی آگ برس رہی ہو۔

پنڈ کے سب ہی لوگ اپنے گھروں میں یا گھنے درختوں کے سائے میں منجیوں پر پڑے ہوئے تھے۔ رانو نے پہلے ماں سے پھر بہن سے کہا۔ "میرے ساتھ کھیت میں چلو۔"

وہ سب ہی دوپہر کو کھانے پینے کے بعد آرام سے لیٹی ہوئی تھیں۔ تپتی ہوئی دھوپ میں جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ماں نے کہا۔ "دن کا وقت ہے، ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ اکیلی جا سکتی ہے۔"

رانو نے بڑی بہن سے کہا۔ "بکی...! تم میرے ساتھ چلو۔"

اس کا پورا نام بلوری تھا۔ سب اسے پیار سے بکی کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ بہت ہی گوری چٹی تھی۔ موسم گرما کی آنچ اسے گلابی گلابی سرخی مائل کر دیتی تھی۔ وہ اپنے رنگ روپ کا بڑا خیال رکھتی تھی۔ دھوپ میں نہیں نکلتی تھی۔ اس نے رانو کا ہاتھ محبت سے پکڑ کر کہا۔ "میری بہنا...! اماں کی بات مان لے۔ دن کا وقت ہے۔ میں اتنی دھوپ میں نہیں نکلوں گی۔ تو زیادہ دور نہ جا۔ بس سامنے ہی کھیت سے ہو کر چلی آ۔"

رانو نے بھی ضد نہیں کی۔ اس نے سوچا، کھیت سے لوٹ کر اپنی ہم جولیوں کے پاس جائے گی۔ پھر ان کے ساتھ پیل دُوج یا کوکلا شپاکی کھیلے گی۔ کچی زمین پر لکیریں کھینچ کر کئی خانے بنائے جاتے ہیں۔ لڑکیاں ایک چپٹے پتھر کو یا لکڑی کے ٹکڑے کو ان خانوں میں سے کسی ایک خانے میں پھینکتی ہیں۔ پھر اسے اٹھانے کے لئے ایک ٹانگ سے پھدک پھدک کر ان خانوں میں جاتی ہیں۔ اس کھیل کو پیل دوج کہتے ہیں۔

کوکلا شپاکی کے کھیل میں کئی لڑکیاں ایک دائرے میں سر جھکا کر منہ چھپا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ایک لڑکی ان کے چاروں طرف دوپٹہ لہراتے ہوئے گزرتی ہے اور کہتی ہے۔

کوکلا شپاکی جمعرات آئی جے
جنے اُگے پچھے ویکھا
اودی شامت آئی جے...

رانو خیالات سے چونک گئی۔ کھڑی فصلوں میں سرسراہٹ سی ہو رہی تھی۔ کوئی

ادھر آ رہا تھا۔ وہ شلوار ہاتھ میں اٹھائے دبے قدموں وہاں سے دور جانے لگی۔ آگے چل کر جب کہیں رکتی تو ایسا ہی لگتا، جیسے کوئی آ رہا ہو۔ سرسراہٹ سنائی دیتی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھتی تو آواز رک جاتی تھی۔ یوں وہ بھٹکتی ہوئی دور کھیتوں میں چلی آئی۔ پھر اس نے دیکھا، ہر طرف خاموشی تھی۔ وہ زیادہ دور نہیں جانا چاہتی تھی۔ اسے کچھ اطمینان ہوا۔ وہ وہیں بیٹھنے لگی۔ مگر بیٹھتے بیٹھتے ڈر کر کھڑی ہو گئی۔

ایک شخص گھنی فصلوں کو ہٹاتا ہوا اس کے سامنے آ گیا۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ "ارے یہ تو اپنی رانو ہے، اوئے بھولو...! آ جا اپنی ہی چیز ہے۔"

دور فصلوں میں سرسراہٹ ہونے لگی۔ وہ کچھ گھبرا گئی تھی، شرما گئی تھی۔ جلدی سے شلوار پہننا چاہتی تھی۔ اس نے شلوار چھینتے ہوئے کہا۔ "اری ہم سے کیا پردہ کرتی ہے؟"

بھولو وہاں آ گیا تھا۔ اسے بازوؤں میں اٹھا کر بولا۔ "تجھے یاد نہیں ہے۔ جب تُو ننھی سی تھی، تب ہماری گود میں کھیلا کرتی تھی۔"

وہ اسے بتانے لگے کہ بچی ہو تو کیسے کھلایا جاتا ہے اور بڑی ہو تو کیسے کھیل بدل جاتا ہے؟ جبکہ وہ نہ بچی تھی، نہ بڑی تھی۔ مگر یہ سمجھ گئی تھی کہ جو بھی ہو رہا ہے، شرمناک ہے۔ وہ بری طرح خوفزدہ ہو کر چیخنا چاہتی تھی۔ مگر ایک نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر آواز کو ابھرنے سے پہلے ہی دبوچ لیا۔

آسمان پر سورج جل رہا تھا۔ کھیت گم صم سے ہو کر رہ گئے تھے۔ جو کچھ ہو رہا تھا، اس پر زمین پسینہ پسینہ ہو رہی ہو گی۔ ایک کلی کو کھلنے کی بے کلی نہیں تھی۔ لیکن کھیلنے کھلانے والے پتیاں نوچ نوچ کر اسے پھول کی طرح برت رہے تھے۔

یہ لڑکیوں کا مقدر ہے، وہ پیدا ہوتے ہی عیاشوں کے نام لکھ دی جاتی ہیں۔ بہت کم خوش نصیب ہوتی ہیں، جو ایک ہی کے نام رہ کر ساری زندگی گزار دیتی ہیں۔ ورنہ جو شامت کی ماریاں ہوتی ہیں، وہ ہوس کے کچرا گھر سے گزرتی رہتی ہیں۔ ایسی لڑکیوں سے پوچھا جائے۔ "کیا آئندہ اس دنیا میں جنم لو گی؟"

تو ان کا جواب یہی ہو گا۔

"کوکلا شپا کی جمعرات آئی جے

جنے دنیا وِچ جنم لیا

اودی شامت آئی جے..."

☆☆☆

دوپہر سے شام ہونے لگی۔ پہلے تو ماں باپ نے یہی سمجھا کہ وہ کھیت سے نکل کر اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے چلی گئی ہے۔ جب دھوپ ڈھلنے لگی تو ماں اسے تلاش کرنے نکلی۔ معلوم ہوا' وہ کسی سہیلی کے گھر میں نہیں ہے۔ وہ پریشان ہو کر ایک ایک دروازے پر جا کر اس کے بارے میں پوچھنے لگی۔ وہاں گھر ہی کتنے تھے؟ کسانوں اور شہر جا کر کام کرنے والے مزدوروں کے ساٹھ ستر مکانات تھے۔ رانو کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

گاؤں کے کتنے ہی لوگ اسے کھیتوں میں جا کر تلاش کرنے لگے۔ اس کا باپ بشیر کریانہ والا شہر میں دکانداری کرتا تھا۔ وہ بھی بیٹی کو ڈھونڈنے دوڑا چلا آیا تھا۔

ایک کھیت کی خشک زمین پر اچھا خاصا پھیلا ہوا خون دکھائی دیا۔ فوراً ہی تھانے میں اطلاع دی گئی۔ شہر وہاں سے صرف دو میل کے فاصلے پر تھا۔ تھانیدار کفیل احمد سپاہیوں کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے زمین پر پھیلے ہوئے انسانی لہو کو دیکھ کر بشیر سے کہا۔ "تمہاری بیٹی کو قتل کیا گیا ہے۔"

باپ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ماں سینہ پیٹ کر رونے لگی۔ سپاہی ادھر ادھر کھیتوں میں جا رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر شلوار کا ازار بند ملا۔ ماں اسے دیکھتے ہی دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ سپاہی کے ہاتھ سے لے کر اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔ "یہ میری رانو کی شلوار میں تھا۔ ہائے میری دھی رانی کہاں ہے؟ کون اسے لے گیا ہے؟"

تھانیدار کفیل احمد اس کی آہ و بکا سن رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ "لہو بہت تھوڑی سی مقدار میں ہے۔ اگر بچی کو چھرے سے ہلاک کیا جاتا' اس کے جسم سے لہو بہتا تو وہ اچھی خاصی مقدار میں ہوتا۔ پھر یہ کہ قاتل لاش چھوڑ کر چلا جاتا۔ اسے اٹھا کر کیوں لے گیا ہے؟ کیا ابھی اس کا قتل نہیں کیا گیا ہے؟ کیا اسے اغوا کیا گیا ہے؟"

یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ قاتل اسی پنڈ سے یا آس پاس کے کسی علاقے سے

تعلق رکھتا ہے۔ پولیس کے علاوہ پنڈ کے لوگ بھی اندازہ کرنے لگے کہ کون اس بچی کو لے گیا ہوگا؟

تھانیدار نے ماں باپ کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "صبر کرو۔ رانو شاید زندہ ہے۔ اسے صرف اغوا کیا گیا ہے۔"

اس واردات کی خبر شہر میں پھیل گئی تھی۔ جگہ جگہ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ قتل نہیں کیا گیا ہے تو سالم بچی کو لباس سمیت اغوا کرنے والا اس کا ازار بند کیوں پھینک کر چلا گیا ہے؟

اسی پنڈ کا ایک بندہ دوپہر کو ساہیوال گیا تھا۔ رات دس بجے واپس آیا تو اس نے بیان دیا۔ "میں تقریباً ڈھائی بجے ساہیوال کی بس پکڑنے جا رہا تھا۔ تب میں نے رانو کو کھیت میں جاتے دیکھا تھا اور جب بس میں سوار ہو کر ذرا آگے گیا تو بھولو ٹکڑی کی ایک جھلک دیکھی۔ وہ اسی کھیت میں جا رہا تھا۔"

بھولو ٹکڑی کو بے شمار لوگ جانتے تھے۔ وہ ہڈحرام تھا۔ لاری اڈے اور ہوٹلوں میں بیٹھ کر لوگوں کو گانے سناتا تھا اور سگریٹ کے ٹوٹے مانگ کر پیتا تھا۔ ان ٹوٹوں کے حوالے سے لوگ اسے بھولو ٹکڑی کہا کرتے تھے۔

سپاہی اسے پکڑ کر تھانے میں لے آئے۔ تھانیدار کفیل احمد نے اسے دیکھتے ہی ایک زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے پوچھا۔ "دوپہر کو ڈھائی بجے تُو کہاں تھا؟"

یہ سوال سنتے ہی وہ ایک دم سے گھبرا گیا۔ یہ وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تھانیدار اس کی دوپہر والی مصروفیت کا حساب لے گا۔ اس نے کہا۔ "میں دوپہر کو لاری اڈے کے ایک چائے خانے میں تھا۔"

تھانیدار اس سے زیادہ گھاگھ اور تجربہ کار تھا۔ اس کی گھبراہٹ سے سمجھ گیا کہ واردات کرنے والا ہاتھ آ گیا ہے۔ اس نے لاری اڈے کے چائے خانے والوں سے دریافت کیا۔ ہوٹل کے مالک اور ملازموں نے کہا۔ "یہ آج دوپہر سے ادھر نہیں آیا۔ رات کے آٹھ بجے ہم نے اس کی صورت دیکھی ہے۔"

تھانے میں لا کر اس کی اچھی طرح درگت بنائی گئی۔ کفیل احمد نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "میں قانون کے معاملے میں خود کفیل ہوں۔ قانون کو ہاتھ میں لے کر مجرموں

کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہوں۔ عدالت تک پہنچنے نہیں دیتا۔ زندہ رہنا چاہتا ہے تو سچ اگل دے۔ ہوسکتا ہے عدالت میں پہنچ کر تجھے نئی زندگی مل جائے۔ یہاں تو نہیں ملے گی۔"

وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ امید تھی کہ اس کے ساتھی پر بھی بات آئے گی تو وہ اپنے وسیع اور مضبوط ذرائع سے اسے بچالے گا۔ اس نے کہا۔ "میرا کوئی قصور نہیں ہے... میں نے تو طافو کا ساتھ دیا تھا۔ اس نے جو کہا میں نے وہی کیا۔"

تھانیدار نے چونک کر پوچھا۔ "طافو...؟ کون طافو؟ کیا وہی جو چوہدری دلاور حیات کا کارندہ ہے؟"

وہ جلدی جلدی ہاں کے انداز میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ "ہاں۔ وہی جو چوہدری صاحب کا خاص بندہ ہے۔ مجھے کھلاتا پلاتا رہتا ہے۔ جیب خرچ بھی دیتا ہے۔ اسی لئے جو کہتا ہے میں وہی کرتا ہوں۔"

تھانیدار نے اسے ایک لات مارتے ہوئے پوچھا۔ "رانو کہاں ہے؟"

زوردار لات پیٹ پر پڑی تھی۔ وہ تکلیف سے دہرا ہوگیا۔ کراہتے ہوئے بولا۔ "میں نے اسے نہیں مارا ہے۔ میں نے تو صرف اسے پکڑا تھا۔ طافو نے اس کے گلے میں ازار بند کا پھندا ڈال کر مار ڈالا ہے۔"

اس کے بیان کے مطابق انہوں نے اس کمسن بچی سے زیادتی کی تھی۔ وہ رو رہی تھی، پھڑپھڑا رہی تھی۔ مگر اس درندگی سے انہیں ایسا مزہ آرہا تھا، جیسے بہت زیادہ پی رہے ہوں۔ بدمست ہو رہے ہوں۔

اشرف المخلوقات کہلانے والوں کی درندگی ناقابل فہم ہے۔ بہت زیادہ خوشی حاصل ہو تو کہتے ہیں، روحانی خوشی حاصل ہو رہی ہے۔ وہ ایک معصوم بچی کو شرمناک اذیتیں پہنچاتے ہوئے روحانی تو نہیں، شیطانی مسرتیں حاصل کر رہے تھے۔

وہ بے ہوش تھی۔ طافو نے کہا۔ "یہ ہوش میں آئے گی پھر ہمارے لئے مصیبت بن جائے گی۔ پولیس کیس ہوگا تو ہمیں پہچان لے گی۔"

اس وقت ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ انہوں نے شلوار کے نیفے سے ازار بند نکال کر گلے کا پھندا بنا کر اسے مار ڈالا۔ اس سات برس کی کمسن بچی پر ایک ذرا رحم نہیں آیا۔

تھانیدار کفیل احمد سوچ میں پڑ گیا۔ چوہدری دلاور حیات صرف ایک زمیندار اور قومی اسمبلی کا ممبر ہی نہیں، ایک شعبے کا وزیر بھی تھا۔ طافو اس کا بہت ہی خاص کارندہ تھا۔ جو واردات ہو چکی تھی، اسے چوہدری کے علم میں لائے بغیر طافو کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا جاسکتا تھا۔ کفیل احمد نے جلدی سے اپنی وردی اتارتے ہوئے ایک سپاہی سے کہا۔ "اسے اچھی طرح پریس کرو۔ چوہدری صاحب کے پاس جانا ہے۔"

پھر اس نے دوسرے سپاہی سے کہا۔ "مالی سے کہو، پھولوں کا بڑا سا گل دستہ بنائے۔ چوہدری صاحب کو پھول بہت پسند ہیں۔"

ایک مدت کے بعد تھانیدار کو اپنی پسند کا کیس ملا تھا۔ اس کے لئے ترقی کا راستہ کھلنے والا تھا۔ اسے بیک وقت ایک زمیندار سے، ایک ایم این اے سے اور ایک شعبے کے وزیر سے ملاقات کرنی تھی۔ اس لئے وہ ایک ایس ایچ او کی حیثیت سے پورے ڈسپلن کے ساتھ اس کے سامنے حاضر ہونا چاہتا تھا۔

☆☆☆

چوہدری دلاور حیات ایک شاہانہ طرز کے صوفے پر بیٹھا حقے کا کش لگا رہا تھا اور دھواں چھوڑ رہا تھا۔ اسمبلی میں اور وزارت کے شعبے میں حقہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر وہاں بھی وہ اپنے اندر کا دھواں نکالتا تھا اور اپنے شعبے سے تعلق رکھنے والے ملک و قوم کے مسائل کو دھوئیں کی طرح اڑا دیا کرتا تھا۔

طافو اس سے کچھ فاصلے پر دونوں ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑا ہوا تھا۔ چوہدری نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "کتے...! اگر تیرا وہ ساتھی پکڑا نہ جاتا تو تُو مجھ سے بھی یہ باتیں چھپاتا۔ اب اپنی جان بچانے کے لئے میرے تلوے چاٹنے آیا ہے۔"

وہ بولا۔ "اپنی ماں کی قسم کھا کے کہتا ہوں، آپ کو صبح بتانے والا تھا۔ مگر اس سے پہلے ہی معاملہ بگڑ گیا ہے۔ پتہ نہیں، وہ کم بخت بھولوکڑی کیسے پولیس والوں کے ہاتھ لگ گیا؟ پتہ نہیں وہاں کیا بیان دے رہا ہوگا؟"

وہ ناگواری سے بولا۔ "میں خواہ مخواہ تجھ جیسے کتوں کو پالتا ہوں۔ تم لوگوں کی ذرا سی غلطی پولیس والوں کو میرے خلاف کیچڑ اچھالنے کا موقع دے دیتی ہے۔ اب تیری غلطی

پر پردہ ڈالنے کے لئے کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔"

اس نے حقے کا ایک کش لیا۔ پھر پوچھا۔ "وہ کس کی بچی تھی؟"

"بشیر کریانہ والے کی... وہ جو اپوزیشن والوں کا بہت بڑا چمچہ ہے۔ پچھلے الیکشن میں آپ کے خلاف زہر اگلتا رہا تھا۔"

بشیر کا نام سنتے ہی چوہدری کی نگاہوں کے سامنے بلوری عرف بکی کا چہرہ گلاب کی طرح کھل گیا۔ پچھلے دو برسوں سے وہ اس کے لئے للچا رہا تھا۔ اپنے علاقے کی کسی لڑکی کو حاصل کر لینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ لیکن ایک سیاستدان کی حیثیت سے اسے شہرت مل رہی تھی۔ ایک شعبے کی وزارت مل گئی تھی۔ ایسے میں وہ کوئی مجرمانہ واردات نہیں کرا سکتا تھا۔ اپوزیشن والے تاک میں رہتے تھے۔ اس کی کسی بھی کمزوری کو اچھال سکتے تھے۔ اس لئے وہ بلوری کے معاملے میں صبر کر رہا تھا۔

پچھلے برس اس کا بڑا بھائی چوہدری یاور حیات لندن سے آیا تھا۔ اس نے بلوری کو دیکھا تو اس پر ہزار جان سے عاشق ہوگیا۔ اس نے چھوٹے بھائی سے کہا۔ "دلاور...! یہ تو بڑا ہی زبردست آئٹم ہے۔ میں نے یورپ کے ملکوں میں گوری چٹی حسینائیں دیکھی ہیں۔ لیکن ایسی سنگ مرمر کی مورت نہیں دیکھی۔ کوئی صورت نکالو اور اسے میرے پاس پہنچاؤ۔"

چوہدری دلاور حیات نے کہا۔ "پہلے ہم جسے چاہتے تھے' اٹھوا لیتے تھے۔ اب ایسا ممکن نہیں ہے۔ مجھے سیاسی عروج حاصل ہو رہا ہے۔ میری ایک ذرا سی غلطی پر طوفان کھڑا ہو جائے گا۔ جتنی بلندی پر ہوں' وہاں سے نیچے گرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ میں بھی اس کے لئے للچا رہا ہوں۔ مگر صبر کر رہا ہوں۔ تم بھی صبر کرو۔"

یاور حیات نے کہا۔ "تم کیسے سیاستدان ہو؟ کیا ذرا سی ہیرا پھیری نہیں کر سکتے؟ وہ جبراً حاصل نہیں ہو سکے گی۔ کوئی بات نہیں' محبت سے تو حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے باپ سے میرے لئے رشتہ مانگو۔ میں اسے حاصل کرنے کی خاطر دوسری شادی کر سکتا ہوں۔ اس کے لئے شہر میں کوٹھی بنا دوں گا۔ کبھی کبھی پاکستان آ کر دل بہلا لیا کروں گا۔"

"بھائی جان! آپ بوڑھے ہوگئے ہیں۔ وہاں لندن میں بچے جوان ہیں۔ بہو بھی آ گئی ہے۔ ایک پوتا بھی ہوگیا ہے۔ کم بخت بشیر آپ کا رشتہ قبول نہیں کرے گا۔ پھر وہ

اپوزیشن پارٹی کا بندہ ہے۔ اس سے رشتہ داری نہیں ہو سکے گی۔"

یاور حیات نے کہا۔ "اگر ہوگئی تو فائدہ تمہارا بھی ہے۔ تم ہی کہہ رہے تھے' اس کی برادری میں تقریباً دو سو ووٹرز ہیں۔ رشتہ داری ہوگی تو وہ سب تمہارے ووٹ بینک میں اضافہ کریں گے۔"

بڑے بھائی نے مجبور کیا تو چوہدری دلاور حیات نے اس کے لئے بلوری کا پیغام بھیجا۔ لیکن بشیر نے بڑی ناگواری سے رشتے کو ٹھکرا دیا۔ صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ بیٹی کو کنویں میں ڈال دے گا۔ مگر ایک بوڑھے کے پلے نہیں باندھے گا۔

اس کا یہ انکار چوہدری بھائیوں کے لئے بہت بڑا چیلنج بن گیا تھا۔ یاور حیات یہ کہہ کر لندن چلا گیا تھا۔ "آج تک کسی نے ہماری کسی بات کو ٹھکرانے کی ہمت نہیں کی۔ تمہیں بشیر سے انتقام لینا ہے۔ اگلے برس آؤں گا۔ تم نے انتقام نہ لیا تو میں اسے گولی مار کر چلا جاؤں گا۔"

یہ پچھلے برس کی باتیں تھیں۔ اس وقت طافو اس کے سامنے ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے دشمن بشیر کی کمسن بیٹی سے زیادتی کی تھی۔ اسے ہلاک کیا تھا۔ یوں کہنا چاہئے کہ اس نے چوہدری بھائیوں کا انتقام لے لیا تھا۔

چوہدری نے ریسیور اٹھا کر لندن میں بڑے بھائی سے رابطہ کیا۔ اس سے کہا۔ "میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی ہے۔ بشیر کریانہ والے سے زبردست انتقام لیا ہے۔"

اس نے فون پر بتایا کہ اپنے دشمن کی ایک کمسن بیٹی کے ساتھ کیسی واردات کی گئی ہے؟ چوہدری یاور حیات نے سن کر کہا۔ "یہ واردات اس کی بڑی بیٹی کے ساتھ ہوتی تو مجھے خوشی ہوتی۔ جسے ہم حاصل نہ کر سکے۔ اس کی عزت کے تو چیتھڑے اڑا دینے چاہئیں۔ اسے بازار میں بٹھا دینا چاہئے۔ پتہ نہیں' وہ کم بخت کیا چیز ہے؟ یہاں لندن میں بھی میری نیندیں اڑاتی رہتی ہے۔ جب اس کی اچھی طرح ایسی کی تیسی ہو جائے گی۔ تب ہی میں سکون سے سو سکوں گا۔"

ایسے وقت ایک ملازم نے آ کر کہا۔ "علاقے کا تھانیدار آپ سے ملنے آیا ہے۔"

طافو یہ سنتے ہی سہم کر چوہدری کو دیکھنے لگا۔ چوہدری نے فون پر بڑے بھائی سے

کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں کچھ ایسا کروں گا کہ بشیر کریانہ والے کی کمر ہی ٹوٹ جائے۔ وہ آئندہ الیکشن میں میرے خلاف زہر اگلنے کے قابل نہ رہے۔ میں تم سے بعد میں باتیں کروں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ طافو سے کہا۔ ”تُو پچھلے دروازے سے باہر چلا جا۔ میں تھانیدار سے بات کرتا ہوں۔“

وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد تھانیدار کفیل احمد پھولوں کا ایک بڑا سا گلدستہ اٹھائے اندر آیا۔ چوہدری حقے کے کش لے رہا تھا۔ کفیل نے دور ہی سے اسے سلام کرتے ہوئے' سر جھکاتے ہوئے قریب آ کر رکوع میں جاتے ہوئے اسے گلدستہ پیش کیا۔ چوہدری نے قبول نہیں کیا۔ ایک ایس ایچ او کے مقابلے میں برسراقتدار پارٹی کا لیڈر تھا۔ ایک شعبے کا وزیر اور اس ملک کے حکمرانوں میں سے ایک حکمران تھا۔ اس نے بڑے ہی شاہانہ انداز میں صوفے کے پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔ ”ادھر رکھ دو۔“

تھانیدار گلدستے کو سینٹر ٹیبل پر رکھ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا۔ ”آپ سے کچھ عرض کرنے آیا ہوں۔“

چوہدری نے پوچھا۔ ”کیا میرے کارندے کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟“
”جی ہاں۔ طافو نے بڑی ہی شرمناک واردات کی ہے۔ اگر وہ آپ کا کارندہ نہ ہوتا تو...“

”وہ میرا خاص آدمی ہے۔ آگے بولو! کیا چاہتے ہو؟“
”حضور! میں کیا چاہوں گا؟ جب ادھر آ رہا تھا تو اسلامی جمعیت والے اور اپوزیشن والے تھانے میں گھس آنا چاہتے تھے۔ ہم نے بڑی مشکل سے انہیں روکا ہے اور یقین دلایا ہے کہ مجرموں کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ یہ بات بہت دور تک پھیل گئی ہے جناب!“

”ہوں... تمہارا کیا خیال ہے' مجرموں کے خلاف کارروائی لازمی ہو گی؟ یا اس معاملے کو کسی طرح دبایا جا سکتا ہے؟“
”کیس کو دبانا یا اسے توڑ مروڑ کر کسی طرح ختم کر دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

لیکن اپوزیشن والے آپ کے خلاف نعرے لگا رہے ہیں۔ جو حمایتی ہیں' وہ کہہ رہے ہیں' آپ ضرور انصاف کریں گے۔ اپنے کارندے کو قانون کے حوالے کر دیں گے۔“
”تعجب ہے۔ یہ بات اتنی جلدی کیسے پھیل گئی؟“
”کوئی بات سیاسی رنگ اختیار کر لے تو جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے جی! میں آپ کی اجازت سے ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔“
وہ ایک ذرا بے چینی سے پہلو بدل کر بولا۔ ”ہوں... بولو...“
وہ ذرا قریب ہو کر بولا۔ ”آپ اپنے کارندے کی قربانی دیں۔ پریس رپورٹرز اور فوٹو گرافرز کو کال کریں۔ انہیں بیان دیں کہ آپ کس قدر قانون کی بالادستی قائم رکھتے ہیں؟ ایک غریب اور معصوم بچی کے والدین سے انصاف کرنے کے لئے اپنے جانثار کارندوں کو بھی قانون کے حوالے کر دیتے ہیں۔ خدانخواستہ کبھی آپ پر کوئی الزام آیا تو خود کو بھی عدالت میں پیش کر سکتے ہیں۔ ایسا بیان اور قانونی عمل آپ کی شہرت میں مزید اضافہ کرے گا۔“

چوہدری سوچتی ہوئی نظروں سے تھانیدار کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”میں ایسا کر سکتا ہوں پر...“

وہ ذرا چپ ہوا۔ پھر ناگواری سے بولا۔ ”یہ کارندے ہمارے رازدار ہوتے ہیں۔ جب تک وفادار رہتے ہیں' تب تک اپنی جان پر کھیلتے رہتے ہیں۔ ہمارا کوئی راز پیٹ سے نہیں نکالتے۔ اگر میں طافو کو تمہارے حوالے کروں گا تو وہ کم بخت مجھ سے بدظن ہو جائے گا۔ پریس والوں کے سامنے گھر کا بھیدی بن کر ایسے راز اگل دے گا جن سے میری پوزیشن بہت ہی کمزور ہو جائے گی۔“
وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”میں ابھی عروج حاصل کر رہا ہوں۔ بدنامی کی ایک ذرا سی بھی آنچ اپنی طرف نہیں آنے دوں گا۔“
تھانیدار نے کہا۔ ”ہم ایسے گھر کے بھیدیوں سے اور مجرموں سے نمٹنا جانتے ہیں۔ میں ایسی تدبیر کروں گا کہ یہ کسی کے سامنے آپ کے خلاف زبان کھولنے کے قابل نہیں رہے گا۔“

چوہدری نے کہا۔ ”پھر تو تم بہت کام کے آدمی ہو۔“

وہ سر جھکا کر بولا۔ ”جی ہاں۔ آپ اس ناچیز کو خدمت کا موقع دیتے رہیں گے تو میں اپنی قابلیت ثابت کرتا رہوں گا۔ یہ میری بدنصیبی ہے کہ اعلیٰ افسران میری ترقی کی درخواستیں فائلوں میں دبا کر رکھ دیتے ہیں۔ ورنہ اب تک تو میں ایس پی اور ڈی آئی جی بن چکا ہوتا۔“

چوہدری نے کہا۔ ”ہُوں... اس معاملے کو کنٹرول کرو۔ تمہاری ترقی بھی ہوگی اور جس بڑے شہر میں چاہو گے وہاں ٹرانسفر بھی ہو جائے گا۔“

”تو پھر حضور مجھ پر بھروسہ کریں اور طافو کو میرے حوالے کر دیں۔ میں کسی بھی پریس رپورٹر کو اس کے قریب پھٹکنے نہیں دوں گا۔“

چوہدری نے طافو کو بلا کر سمجھایا۔ ”فی الحال گرفتاری پیش کر دے۔ تجھ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ تجھے اس مرڈر کیس سے مکھن کے بال کی طرح نکال لیا جائے گا۔“

وہ تابعدار تھا۔ چوہدری کے حکم کے مطابق ہتھکڑیاں پہن کر تھانیدار اور سپاہیوں کے ساتھ حوالات میں پہنچ گیا۔ یہ بات شہر میں دور دور تک پھیل گئی کہ فرض شناس تھانیدار نے معصوم رانو کے دونوں قاتلوں کو گرفتار کر لیا ہے۔

ادھر چوہدری نے فون کے ذریعے تمام اخبارات کے رپورٹرز سے رابطہ کیا۔ انہیں بیان دیا کہ اس نے قانون کی بالادستی قائم رکھنے کے لئے اپنے ایک مجرم کارندے کو قانون کے حوالے کیا ہے۔ دو قاتلوں کو حوالات میں رکھا گیا ہے۔ وہ تمام رپورٹرز چاہیں تو دوسری صبح آ کر ان سے مل سکتے ہیں اور ان کے بارے میں خبریں شائع کر سکتے ہیں۔

طافو اور بھولو لنگڑی آہنی سلاخوں کے پیچھے تھے۔ تھانیدار کفیل احمد نے ان کے پاس آ کر کہا۔ ”صبح ہونے میں ابھی دیر ہے۔ چوہدری صاحب نے دکھاوے کے لئے تمہیں گرفتار کرایا ہے۔ منصوبہ یہ ہے کہ تم دونوں یہاں سے فرار ہو جاؤ گے۔ اپنی جانیں بچانے کے لئے کہاں جا کر پناہ لو گے یا کس طرح سرحد پار جا سکو گے یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے۔“

اس نے طافو کو ایک ریوالور دیتے ہوئے کہا۔ ”چوہدری صاحب تجھے بہت چاہتے ہیں۔ اسے رکھ لے۔ تجھے زندہ سلامت رکھنے کے لئے ہی انہوں نے یہ ہتھیار بھیجا

ہے۔ سویرے اذان سے پہلے یہ آہنی دروازہ کھلا رہے گا۔ دونوں یہاں سے نکل جانا۔“

بھولو لنگڑی نے پریشان ہو کر کہا۔ ”ہم بھاگ کر کہاں جائیں گے؟“

طافو نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ ”ابے چپ ہو جا.... تیری وجہ سے میں پھنس گیا ہوں۔ یہاں سے نکلنے کے بعد جیوندا رہا تو چوہدری صاحب کسی بھی طرح اس کیس پر مٹی ڈال کر پھر مجھے اپنے پاس بلا لیں گے۔“

تھانیدار نے کہا۔ ”جب تم دونوں یہاں سے نکل بھاگو گے تو ہم تمہارا تعاقب کریں گے اور ہوائی فائر کرتے رہیں گے۔ فائر سننے والوں کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہم نے تمہارا تعاقب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس کے باوجود تم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے... میری بات سمجھ رہے ہو نا کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور تمہیں کیا کرنا ہے؟“

دونوں نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ ان دنوں ملک میں ایک ہی پی ٹی وی چینل تھا۔ آج کی طرح کثیرالاشاعت اخبارات نہیں تھے۔ جرائم کے مختلف ہتھکنڈوں کے متعلق کم سے کم لوگ معلومات رکھتے تھے۔ دور دراز کے علاقوں میں رہنے والے یہ نہیں جانتے تھے کہ پولیس والے بھی کس طرح مجرمانہ کارروائیاں کرتے ہیں؟

بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں۔ بڑے مجرم کبھی کبھی ماتحت مجرموں سے نجات پانے کے لئے پولیس والوں کا تعاون حاصل کرتے ہیں۔ اپنے لئے واردات کرنے والوں کو بڑے اعتماد میں لے کر گرفتار کراتے ہیں پھر حوالات سے فرار کرا دیتے ہیں۔ یوں وہ بے چارے پولیس مقابلے میں مارے جاتے ہیں۔ یہ باتیں طافو اور بھولو لنگڑی نہیں جانتے تھے۔

صبح اذان سے پہلے جب وہ حوالات سے فرار ہوئے تو اس علاقے میں فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ کتنے ہی نمازی مسجدوں کی طرف جا رہے تھے۔ جو گہری نیند میں تھے وہ بھی فائرنگ کی آوازیں سن کر اٹھ بیٹھے تھے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ فرض شناس پولیس نے فرار ہونے والے مجرموں کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں بھی جوابی فائرنگ کر رہے تھے اور پولیس والوں نے اپنے بچاؤ کی خاطر انہیں گولی مار دی تھی۔

ایک سات سالہ معصوم بچی سے زیادتی کرنے اور اسے بڑی درندگی سے ہلاک

کرنے والے حرام موت مارے گئے۔ تھانیدار کفیل احمد ترقی پا کر اے ایس پی بن گیا۔
بظاہر کمسن رانو سے انصاف ہوا تھا۔ لیکن اس کے باپ بشیر کریانہ والے کے اصل دشمن
چوہدری برادران زندہ تھے۔ ان پر نہ کوئی آنچ آئی تھی' نہ آئندہ کسی طرح کی آنچ لگنے کے
امکانات تھے۔ ان کے انتقام کی آگ ابھی بجھی نہیں تھی۔ دونوں بھائیوں نے بلوری پر
دانت گاڑ رکھے تھے۔

بشیر اپنے ملازم کے ساتھ دکان میں گاہکوں کو سودا دے رہا تھا۔ ایسے وقت فون کی
گھنٹی نے اسے متوجہ کیا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے چوہدری دلاور
حیات کی آواز سنائی دی۔ ''بشیرے....! تیری چھوٹی بیٹی ماری گئی۔ جبکہ بڑی کو مرنا تھا۔ جوان
بیٹی پکی ہوئی ہانڈی کی طرح ہوتی ہے۔ آج تازہ ہے' کل باسی ہو جائے گی۔ تُو رشتے سے
انکار کر کے اسے باسی اور سڑی گلی بناتا جا رہا ہے۔''

بشیر نے غصے سے پوچھا۔ ''یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟ تیری اس بات کا مطلب کیا
ہے کہ بڑی کو مرنا تھا اور چھوٹی مر گئی...؟''

''کچھ باتیں سمجھائی نہیں جاتیں۔ خود سمجھی جاتی ہیں۔ چھوٹی ماری گئی ہے۔ اس کی
ماں صدمے سے پاگل ہو کر لاہور کے مینٹل ہوسپٹل میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم تو محبت کرنے
والے لوگ ہیں۔ پیار سے سمجھاتے ہیں' رشتہ داری کر لے۔ بڑی کو میرے بڑے بھائی کی
جھولی میں ڈال دے۔ تیرے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ تجھ پر کبھی کوئی آفت نہیں
آئے گی۔''

بشیر نے کہا۔ ''تُو ایک نہیں... ہزار بار رشتہ مانگے گا' میں ہزار بار تجھ پر
تھوکوں گا... آخ تھو....''

اس نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ عقل سمجھاتی ہے' آسمان کی طرف منہ اٹھا کر
تھوکنا نہیں چاہئے۔ وہ پلٹ کر اپنے ہی منہ پر آتا ہے۔ چوہدری آسمان تھا اور وہ زمین
تھا۔ اپنی کمزور حیثیت کو نہیں سمجھتا تھا۔ یوں بھی کسی پر تھوکنا نہیں چاہئے۔ دشمن سے نفرت کرنا
ہی تھوکنے کے برابر ہوتا ہے۔ لہٰذا صبر کرنا چاہئے۔

چوہدری اب صبر نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی اس کے سامنے اونچی آواز میں بولنے کی

جرات نہیں کرتا تھا۔ کجا یہ کہ ایک جوان بیٹی کے باپ نے... اپوزیشن کے بندے نے اس پر
تھوکا تھا۔ وہ غصے کے مارے پاؤں پٹخ پٹخ کر اسے گالیاں دینے لگا۔

اُس کا تھوک اِس کے پاس نہیں آیا تھا۔ نہ اِس کی گالیاں اُس کے پاس پہنچ رہی
تھیں۔ اپنے ہی گھر کی دیواریں سن رہی تھیں۔ گویا وہ اپنے ہی گھر کی دیواروں کو گالیاں
دے رہا تھا... لوگ غصے میں ایسے ہی احمقانہ تماشے کرتے ہیں۔

وہ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ جلد سے جلد بشیر کی عزت اور نیک نامی کی دھجیاں اڑا کر
اپنے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچانا چاہتا تھا۔ غصے میں اور جلد بازی میں کوئی تدبیر سجھائی نہیں دے
رہی تھی۔ مختلف وزارت کے شعبے میں بڑے گھاگھ مشیر ہوا کرتے ہیں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی
پینے کے بعد شاطرانہ مشاورت کے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔

اس نے اپنے شعبے کے ایک مشیر سے مشورہ کیا۔ مشیر نے کہا۔ ''جب تک اقتدار کی
کرسی اپنے نیچے ہے' یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ ایسے کھیل تو ہمارے بچے کھیل سکتے ہیں۔''

دوسری رات ہی کھیل شروع ہو گیا۔ بشیر کی دکان شہر میں تھی۔ جس روز وہ دکان
دیر سے بند کرتا اور رات ہو جاتی تو وہ شہر سے گھر نہیں آتا تھا۔ ایسے وقت ماں بیٹی تنہا رہتی
تھیں۔ کسی طرح کا خوف نہیں تھا۔ باپ دادا کے زمانے سے پنڈ والوں کے ساتھ رہتے
آئے تھے۔ وہاں کبھی کسی کے گھر چوری یا کسی طرح کی مجرمانہ واردات نہیں ہوتی تھی۔

بوڑھے کہتے تھے۔ ''اب سے کوئی پچاس برس پہلے اس پنڈ کی ایک عورت کے
ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ اس کے بعد پھر کبھی کوئی واردات نہیں ہوئی۔''

وہاں رہنے والے ایک دوسرے کو اتنی اچھی طرح جانتے' پہچانتے تھے اور ایک
دوسرے کے دکھ سکھ میں کام آتے تھے' جیسے سگے رشتہ دار ہوں۔ کسی مشکل کے وقت کوئی
اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھتا تھا۔

بشیر ہفتے میں دو چار راتوں کو گھر نہیں آتا تھا۔ بلوری اور اس کی ماں خود کو تنہا محسوس
نہیں کرتی تھیں۔ اپنے سرپرست کے بغیر رہنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ رانو کے ساتھ جو
زیادتی ہوئی تھی' اس کے نتیجے میں ماں پاگل ہو گئی تھی۔ اس کا علاج ہوتا رہا تھا۔ اب وہ کبھی
ہوش میں رہتی تھی اور کبھی بہکی بہکی سی باتیں کرنے لگتی تھی۔ ایک رات چند ڈاکو اس کے گھر

میں گھس آئے۔

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا' اس چھوٹے سے پنڈ میں ڈاکو بھی آ سکتے ہیں۔ چھوٹی موٹی چوری کرنے والوں کو چور کہتے ہیں۔ وہ ہر چھوٹی بڑی آبادی میں پائے جاتے ہیں۔ مگر ڈاکو تو بڑی واردات کرنے والوں کو کہا جاتا ہے۔ وہ جدید ہتھیاروں سے لیس ہو کر بینکوں اور گھروں میں جبراً گھس آتے ہیں۔ اس پنڈ میں ایسے ڈاکوؤں کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جو کبھی سوچا نہیں جاتا' وہ ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ منہ پر ڈھاٹا باندھ کر آئے تھے۔ ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ ماں بیٹی ایک ہی کمرے میں تھیں۔ انہوں نے وہاں آتے ہی دونوں کو نشانے پر رکھتے ہوئے دھمکی دی۔ ''ذرا بھی کھپ پاؤ گی تو ہم گولی مار کر چلے جائیں گے۔ زندہ رہنا چاہتی ہو تو ایک آواز بھی منہ سے نہ نکالو۔''

بلوری ہکا بکا سی رہ گئی تھی۔ دہشت کے مارے چیخ تو نہیں نکل رہی تھی۔ مگر حلق سے سہمی سہمی سی کراہیں نکل رہی تھیں۔ نیم پاگل ماں یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ لوگ کون ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ وہ آرام سے منجھی پر بیٹھی اپنا سر کھجا رہی تھی۔ بیٹی سے پوچھ رہی تھی۔ ''یہ ہمارے گھر میں آ کر ہم سے پردہ کیوں کر رہی ہیں؟ منہ کیوں چھپا رہی ہیں؟''

بیٹی بری طرح سہمی ہوئی تھی۔ ماں کی باتیں نہ سن رہی تھی' نہ سمجھ رہی تھی۔ اس کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ''آج خیر نہیں ہے۔ یہ لوگ میری عزت لوٹیں گے۔ میں کسی کو منہ دکھانے کی قابل نہیں رہوں گی۔ جو شریف زادیاں جوان اور خوبصورت ہوتی ہیں' وہ لڑکپن سے یہی دیکھتی آتی ہیں کہ جو بھی ان پر نظر ڈالتا ہے' بری نظر ڈالتا ہے۔ بری نظر ڈالنے والوں کے لئے رانو جوان نہیں تھی' بچی تھی۔ پھر بھی وہ برائی سے باز نہیں آئے۔ میں تو جوان ہوں میرا کیا ہوگا...؟''

ایک بندوق بردار نے کہا۔ ''ہم تمہارے گھر سے ایک تنکا بھی چرا کر نہیں لے جائیں گے۔ تم ماں بیٹی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ مگر جو ہم کہیں گے' وہ کرتی رہو گی تو ہم تمہاری چند تصویریں اتار کر یہاں سے چلے جائیں گے۔''

عجیب ڈاکو تھے' لوٹنے نہیں آئے تھے۔ فوٹو گرافی کا شوق پورا کرنے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک قد آور گبرو جوان تھا۔ وہ اس کے ساتھ بلوری کی کچھ رومانی اور کچھ سنسنی

خیز تصویریں اتارنا چاہتے تھے۔ پہلے تو بلوری نے انکار کیا۔ جب انہوں نے اس کی ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کے گلے پر چاقو کا چمکتا ہوا پھل رکھا تو وہ مجبور ہو گئی۔

انہوں نے سختی سے دھمکیاں دیں کہ فوٹو گرافی کے دوران وہ روئے گی یا منہ بنائے گی تو اس کی ماں کو اس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کر دیا جائے گا۔ انہوں نے قسم کھا کر یقین دلایا کہ اس کی عزت نہیں لوٹی جائے گی۔ تب اسے راضی ہونا پڑا۔

ایک تو عزت محفوظ رہنے والی تھی' دوسرے یہ کہ ماں کو اس کے سامنے ذبح نہ کیا جاتا۔ وہ نیم پاگل ہی سہی مگر بچپن سے بیٹی کے دل کی دھڑکن تھی۔ اسے زندہ رکھنا تھا۔ اس کے دودھ کا قرض چکانا تھا۔

وہ پیشہ ور ڈاکو نہیں تھے۔ ان میں ایک عاشق مزاج نوجوان اور دو پیشہ ور فوٹو گرافر تھے۔ جب تصویریں اتارنے کے لئے اس جوان نے منہ پر سے ڈھاٹا ہٹایا تو بلوری اسے دیکھ کر چونک گئی۔ اس کا نام رفیق عرف فیقے تھا۔ وہ اس کے باپ کی دکان میں ملازمت کرتا تھا۔ گھریلو سامان پہنچانے کے لئے اکثر وہاں آیا کرتا تھا۔

فیقے میں اتنی کشش تھی کہ وہ اسے دل ہی دل میں چاہنے لگی تھی۔ اس نے کہا۔ ''بلوری! مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔ میں کوئی جواب نہیں دے سکوں گا۔ یہ لوگ جو کہہ رہے ہیں' وہی کرتی رہو۔ اگر میرے ساتھ شرماؤ گی تو ماں کو زندہ نہیں پاؤ گی۔''

فیقے ایسا نہ کہتا' تب بھی اسے وہی کرنا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس بند کمرے میں فلیش لائیٹس جلنے بجھنے لگیں۔ بلوری اور فیقے کی رومانی اور جذباتی تصویریں اتاری جانے لگیں۔ وہ بے حیائی پر شرما رہی تھی' مگر خود کو سمجھا رہی تھی کہ اس حد تک تصویریں اتروانے کے باوجود عزت محفوظ ہے۔ ماں بھی محفوظ رہے گی۔

یہ سوال بھی ذہن میں چیخ رہا تھا کہ ایسی تصویریں کیوں اتاری جا رہی ہیں؟ یہ کہیں نہ کہیں تو پہنچیں گی۔ انہیں کوئی نہ کوئی تو دیکھے گا۔ آخر ان کا مقصد کیا ہے؟

اس کے ذہن میں جو بھی سوالات ابھر رہے تھے۔ ان کے جوابات دینے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ پتہ نہیں آگے جا کر کیا ہونے والا تھا؟ بہر حال اس وقت تو عزت بھی محفوظ تھی اور اس کی ماں بھی...

تصویریں اتارنے کا سلسلہ ختم ہوا تو وہ سب کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے چلے گئے۔ صرف فیقے اس کے پاس رہ گیا۔ بلوری نے پوچھا۔ ”فیقے! اب تو بتاؤ یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟“

اس نے جواب نہیں دیا۔ دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں اے ایس پی کفیل احمد کھڑا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے چند سپاہی تھے‘ وہ سب اندر آ گئے۔ باہر کسی کی آواز آ رہی تھی۔ ”لوگو...! اٹھو اپنے گھر سے باہر آؤ اور دیکھو.... بشیر کریانہ والے کے گھر میں کیا ہو رہا ہے؟“

”کیا ہو رہا ہے؟“

”کیا ہو رہا ہے؟“

کتنے ہی گھروں سے عورتوں اور مردوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ سب اٹھ کر ادھر آ رہے تھے۔ اے ایس پی کفیل احمد نے ان سب کے سامنے کہا۔ ”یہ فیقے اس گھر میں آتا جاتا رہتا ہے۔ کہنے کو تو دکان کا نوکر ہے۔ مگر دکان والے کی بیٹی سے پکی یاری ہے۔ ابھی ہم نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔“

سارا پنڈ جانتا تھا کہ فیقے اس گھر میں آتا جاتا رہتا ہے۔ کبھی وہاں گھنٹوں بیٹھتا ہے اور ایک وقت کی روٹی بھی کھا کر جاتا ہے۔ ان سیدھے سادے لوگوں کے ذہنوں میں گندگی نہیں تھی۔ اس لئے وہ بلوری اور فیقے کے متعلق کوئی غلط رائے قائم نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس وقت وہ دونوں گناہ کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ اگرچہ انہوں نے آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن پولیس افسر اور سپاہی چشم دید گواہ تھے۔

بلوری بھی انکار نہیں کر پا رہی تھی۔ یہ جانتی تھی کہ اس کے خلاف ثبوت حاصل کرنے کے لئے اچھی خاصی تصویریں اتاری گئی ہیں۔ اب وہ لاکھ انکار کرے‘ اپنی پارسائی بیان کرے‘ قسمیں کھا کر یقین دلائے کہ اس کی عزت محفوظ ہے۔ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے‘ تب بھی اس کے علاقے کی پنچائیت سے لے کر عدالت تک کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔

پنڈ کی عورتوں نے کانوں کو چھو کر گالوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ”ہائے ری بلی...! جوانی صرف تجھ پر نہیں آئی ہے۔ ہم پر بھی آئی تھی۔ آج ہماری جوان بیٹیاں ہیں۔ ہم نے تو کبھی

باپ دادا کا نام نہیں اُچھالا... یہ تُو نے کیا کیا ہے؟ پورے پنڈ کو بدنام کر دیا ہے؟“

مردوں نے سنا تو انہوں نے بھی ناگواری سے منہ بنا لیا۔ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ بعض اوقات کوئی بات نہیں ہوتی۔ پھر بھی سر سے آنچل کھینچ لینے والی باتیں دور تک اُچھال دی جاتی ہیں۔

ایک شریف زادی کی عزت اُچھال دی گئی تھی۔ بشیر یہ صدمہ سہہ نہ سکا۔ پہلے چھوٹی بیٹی رانو گئی اور اب بڑی بیٹی کو بدنامیاں جیتے جی مار رہی تھیں۔ اس کی نیم پاگل بیوی کوئی صحیح بیان دینے کے قابل نہیں تھی۔ بیٹی نے جو بیان دیا تھا‘ اس پر باپ کو یقین تھا۔ مگر دنیا ٹھوس ثبوت کے پیش نظر کبھی یقین کرنے والی نہیں تھی۔ حدود آرڈیننس کے تحت بیٹی کو پہلے حوالات لے جایا گیا۔ پھر جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا گیا۔

بشیر اپوزیشن پارٹی کا بہت اہم رکن تھا۔ اس پارٹی کو اس کی برادری والوں سے سینکڑوں ووٹ حاصل ہوتے تھے۔ اپوزیشن کے کئی لیڈر بلوری کو ضمانت پر رہا کرانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ لیکن الزام بہت ہی سخت تھا۔ وہ ایک گناہ گار کی حیثیت سے پکڑی گئی تھی۔ فیقے بھی جیل میں تھا۔ اس کا بیان یہی تھا کہ بلوری سے اس کے ناجائز تعلقات تھے۔ اس رات بھی وہ اس کے ساتھ منہ کالا کرنے آیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اسے بلوری کے ساتھ کوڑے مارے جائیں گے۔ سنگسار بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود وہ غلط بیانی پر ڈٹا ہوا تھا۔ اس کے باپ امام دین نے چوہدری دلاور حیات سے سودا کیا تھا۔

قصہ کچھ یوں تھا کہ امام دین الیکٹریکل ڈیپارٹمنٹ میں رہ کر بجلی کا کام سیکھ گیا تھا اور بجلی مستری کہلاتا تھا۔ بیوی مر چکی تھی۔ بڑا بیٹا رفیق عرف فیقے نااہل تھا۔ نہ اس نے تعلیم حاصل کی تھی‘ نہ ہی کوئی ہنر سیکھا تھا۔ اس لئے بشیر کی دکان میں نوکری کرتا تھا۔ اس کی کمائی سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے۔

اہم اخراجات یہ تھے کہ امام دین جلد سے جلد جوان بیٹی کی شادی کر کے خود اپنی شادی کرنا چاہتا تھا۔ کسی جوان چھوکری کو دلہن بنا کر لانا چاہتا تھا۔

چوہدری دلاور حیات نے ان باپ بیٹے کو بلا کر کہا۔ ”امام دین! میں تمہارے

تمام مسائل حل کر دوں گا۔ بیٹی کی شادی کے لئے ایک لاکھ روپے دوں گا۔ تمہاری شادی کے لئے بھی ایک لاکھ دے سکتا ہوں۔ تمہارے بیٹے کو دبئی بھیج کر نوکری سے لگا سکتا ہوں۔ یہ ہر مہینے وہاں دس پندرہ ہزار روپے کما لیا کرے گا۔"

امام دین نے چوہدری کے پاؤں چھو لئے پھر بیٹے سے کہا۔ "ابے ادھر کھڑا منہ کیا تک رہا ہے؟ چوہدری صاحب کے پاؤں پکڑ لے۔ ہمارے دن پھرنے والے ہیں۔"

فیقے نے بھی جھک کر چوہدری کے پاؤں پکڑ لئے۔ اس نے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ ادھر بیٹھو اور میری باتیں غور سے سنو۔ بہت کچھ کمانے کے لئے تھوڑی سی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ فیقے کو کچھ دنوں کے لئے جیل جانا پڑے گا۔"

فیقے نے پریشان ہو کر باپ کو دیکھا۔ چوہدری نے کہا۔ "تم جانتے ہو' میرے ہاتھوں میں کتنی پاور ہے؟ میں اس ملک میں سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنا سکتا ہوں۔ تمہیں جیل میں پہنچا کر وہاں سے مکھن کے بال کی طرح نکال لاؤں گا۔"

امام دین نے کہا۔ "ہم جانتے ہیں' آپ حاکم ہیں۔ مائی باپ ہیں مگر فیقے کو جیل کیوں بھیجنا چاہتے ہیں؟"

"میں اپنے ذاتی معاملات کسی کو نہیں بتاتا۔ یہ میرا ایک اہم کام کرے گا۔ ایک دو مہینے کے لئے جیل جائے گا۔ پھر میں اسے وہاں سے دبئی بھیج دوں گا۔ منظور ہے تو ابھی اپنی بیٹی کی شادی کے لئے ایک لاکھ روپے لے جاؤ۔ جس دن فیقے میرا کام کر کے جیل جائے گا۔ اس دن میں تمہاری شادی کے لئے ایک لاکھ دوں گا۔ فیقے کا پاسپورٹ وغیرہ تیار رکھو۔ یہ کسی بھی دن اچانک جیل سے باہر آئے گا پھر اسی دن ملک سے باہر چلا جائے گا۔"

ایسی منصوبہ بندی اور سودے بازی کے نتیجے میں فیقے کے ذریعے بلوری کو اور اس کے پورے خاندان کو بدنام کیا گیا تھا اور فیقے جیل میں پہنچ کر مقدمہ شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ یقین تھا کہ چوہدری اسے سزا پانے نہیں دے گا۔ اس سے پہلے ہی وہاں سے نکال کر ملک سے باہر بھیج دے گا۔

چوہدری نے فون کے ذریعے اپنے بڑے بھائی چوہدری یاور حیات سے رابطہ کیا۔ پھر کہا۔ "ایک خوشخبری ہے۔ جو چڑیا ہمارے ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔ اسے میں نے

پنجرے میں بند کر دیا ہے۔"

وہ بڑے بھائی کو بتانے لگا کہ کس طرح اس نے بلوری کو گناہ گار ثابت کر کے حدود آرڈیننس کے تحت جیل بھجوا دیا ہے؟

چوہدری یاور حیات نے کہا۔ "تم نے اسے اور اس کے خاندان کو بدنام کر کے انتقام لیا ہے۔ مگر جو چیز میں حاصل کرنا چاہتا ہوں' اسے تو تم نے جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا ہے۔ وہ تو وہاں سزا پائے گی۔ ہمارے ہاتھ کیسے آئے گی؟"

"اپوزیشن والے اسے رہائی دلانے کی سر توڑ کوششیں کر رہے ہیں۔ مگر اقتدار تو ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ قانون کو توڑنا مروڑنا ہمارے اختیار میں ہے۔ میری مرضی کے مطابق بلوری کی ضمانت بھی منظور نہیں ہو رہی ہے۔ وہ اس وقت تک باہر نہیں آسکے گی۔ جب تک ہماری ہوس پوری نہیں ہوگی۔ آپ پاکستان آنے کے لئے تیار رہیں۔ میں کسی بھی دن فون کر کے بلا سکتا ہوں۔ بلوری آپ کو پھولوں کی سیج پر ملے گی۔"

بلوری پر تو بعد میں تباہی آنے والی تھی۔ اس سے پہلے اس کا خاندان تباہ ہو رہا تھا۔ پہلے سات سال کی معصوم رانو کو بڑی درندگی سے ہلاک کیا گیا۔ پھر بڑی بیٹی کی پاکیزگی اور شرم و حیا کو خاک میں ملایا گیا۔ چھوٹی بیٹی کی موت نے ماں کو نیم پاگل بنا دیا تھا۔ اگر وہ پوری طرح پاگل ہی رہتی تو جوان بیٹی کا صدمہ برداشت کر لیتی۔ لیکن وہ کبھی کبھی ہوش و حواس میں بھی رہتی تھی۔ جب اس نے جوان بیٹی کو جیل جاتے دیکھا تو یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ اپنے بدن پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگائی۔ پھر چیختی چلاتی بلوری کو پکارتی ہوئی جان سے گزر گئی۔

اس ملک خداداد میں آئے دن ایسی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اخبارات میں خبریں شائع ہوتی ہیں۔ پڑھنے والے ایسی دل سوز خبریں پڑھنے کے بعد اخبار ایک طرف رکھ کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

طاقت اور اختیارات کے غرور میں مبتلا رہنے والوں کا محاسبہ نہ پہلے کبھی کیا گیا' نہ آئندہ کبھی کیا جائے گا۔ مانا کہ قانون کے محافظ' قوم کے جیالے اور جان کی بازی لگانے کا دعویٰ کرنے والے محب وطن اس ملک کی تقدیر سنوار نہیں سکتے۔ کوئی بات نہیں' وہ اسی طرح خاموش

تماشائی بنے رہیں۔ مگر کم از کم پاکستان کو ملک خداداد کہتے ہوئے کبھی تو شرمانا چاہئے۔

ایک بندہ اپنی ذات میں کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن بے انتہا طاقت اور بے جا اختیارات حاصل ہونے کے بعد وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ سیاسی ہتھکنڈوں سے صرف ملک کے اندر ہی نہیں' جیل کے اندر بھی بغاوت کی آگ بھڑکا دیتا ہے۔

فیقے جس جیل میں تھا' وہاں چند شاطر مجرموں نے فرار ہونے کے لئے قیدیوں کو جیل کے ناقص انتظامات کے خلاف بھڑکایا۔ انہیں واقعی ناقص کھانا اور غیر معیاری دوائیں دی جاتی تھیں۔ ان قیدیوں نے اچانک ہی جیلر اور سپاہیوں پر حملہ بول دیا۔

جیلر کی یہ مجبوری تھی کہ وہ فوراً ہی گولیاں چلانے کا حکم نہیں دے سکتا تھا۔ اگر قیدی ہلاک ہوتے تو اسے یہ ثابت کرنا پڑتا کہ فائرنگ لازمی ہوگئی تھی۔ یوں بھی تمام قیدی نہتے تھے۔ صرف توڑ پھوڑ اور ہاتھا پائی کررہے تھے۔ ان نہتوں پر گولیاں نہیں چلائی جاسکتی تھیں۔

جتنی دیر تک ہنگامہ جاری رہا' اتنی دیر میں وہ چالباز قیدی کچھ دوسرے قیدیوں کے ساتھ جیل کے ایک حصے سے فرار ہوگئے۔ ان فرار ہونے والوں میں فیقے بھی تھا۔ اس ملک کے پولیس اور انٹیلی جنس والے مجرموں سے زیادہ تیز رفتار نہیں ہیں۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان قیدیوں میں سے کسی ایک کے پیچھے سیاسی قوت کام کررہی ہوگی۔

ان کا خیال تھا' ان بے یار ومددگار اور نہتے قیدیوں کے پاس نہ تو رقم ہے' نہ ہی ہتھیار ہیں۔ وہ کہیں دور تک فرار نہیں ہوسکیں گے۔ جبکہ فیقے کے لئے رقم اور پاسپورٹ وغیرہ کا انتظام پہلے ہی ہوچکا تھا۔ ملک سے باہر جانے کے لئے ایک فلائٹ میں سیٹ بھی مل گئی تھی۔ یوں چوہدری نے ان باپ بیٹے سے جو وعدہ کیا تھا' اسے پورا کر دکھایا۔

اس نے بلوری کو جیل سے نکلنے نہیں دیا۔ بشیر دل کا مریض تھا۔ چھوٹی بیٹی کی المناک موت' بڑی بیٹی کی بدنامی اور بیوی کی خودسوزی نے ایسا صدمہ پہنچایا کہ بس ایک ہی دل کا دورہ پڑا اور وہ آخری ثابت ہوا۔ وہ بھی اس دنیا سے اٹھ گیا۔ بلوری تنہا بے یار ومددگار رہ گئی۔ اس کی موت کے بعد اپوزیشن والے بھی کمزور سی کوششیں کرتے رہے۔ پھر انہوں نے بھی چپ سادھ لی۔

بدنصیبی کے پے درپے حملے ہوئے تھے۔ بلوری ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ پہلے سوچتی تھی'

مقدمہ چلے گا۔ اگر خوش قسمتی سے اس کی بے گناہی ثابت ہوگی تو رہائی ملے گی۔ وہ اپنے ماں باپ سے ملتے ہی لپٹ کر خوب روئے گی۔ پھر بے گناہی ثابت ہونے کے بعد دنیا والے بھی اسے بدنام نہیں کریں گے۔ شاید آئندہ نیک نامی سے زندگی گزار سکے گی۔

اُمیدیں صرف عارضی طور پر سہارا دینے کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔

یہ انسان کے اندر زندہ رہنے کا حوصلہ پیدا کرتی رہتی ہیں۔

یہ امیدیں اپنے طور پر کچھ نہیں ہوتیں۔ کبھی کسی دکھ کا علاج نہیں کرتیں' کبھی کسی مسئلے کا حل پیش نہیں کرتیں۔

قسمت مہربان ہو تو یہ برآتی ہیں۔ نامہربان ہو تو کہا یہی جاسکتا ہے کہ یہ سبز باغ دکھاتی ہیں۔

بلوری آہنی سلاخوں کے پیچھے سبز باغ دیکھتے دیکھتے مایوس ہوچکی تھی۔ اب جیل کے باہر اس کی کوئی دنیا نہیں تھی۔ کہیں سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ کسی رشتے' کسی محبت' کسی سہارے کے بغیر وہ باہر جاکر ٹھوکریں کھاتی۔ اسے بے چاری کہنا چاہئے۔ وہ بہت کم وقت میں بدنصیبی سے مانوس ہوچکی تھی۔ آئندہ ایسی ہی بدنصیبی کے حصار میں رہنے والی تھی۔

اسے جس کوٹھری میں رکھا گیا تھا' وہاں چھ قیدی عورتیں تھیں۔ وہ باتیں کرتی تھیں تو یہ جواب دیتی تھی۔ ورنہ چپ رہتی تھی۔ مجرمانہ واردات کرنے والی عورتوں سے کتراتی تھی۔ یہ امید تھی کہ جلد ہی رہا ہو کر وہاں سے چلی جائے گی۔ مگر اب یہ خوش فہمی ختم ہوچکی تھی۔

اس نے پہلی رات جیل میں دیکھا تھا۔ دو سپاہی آکر اس کوٹھری سے تین جوان عورتوں کو کہیں لے گئے تھے۔ وہاں فرش پر سونے کے لئے چٹائیاں تھیں۔ بلوری کے قریب ہی ایک ادھیڑ عمر کی عورت چٹائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''شروع میں ہر آنے والی عورت تیری طرح چپ رہتی ہے۔ جب یقین ہوجاتا ہے کہ یہیں مرنا جینا ہے تو پھر بولنے لگتی ہے۔''

وہ جواباً کچھ نہ بولی۔ خاموش رہی۔ وہ عورت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کچھ بے چین سے تھی۔ ذرا قریب آکر اسے چھو کر بولی۔ ''تیرا حسن تو غضب کا ہے۔ بالکل کوری کنواری لگتی ہیں۔ تعجب ہے' جیلر نے تجھے کیوں نہیں بلایا؟''

بلوری نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''کیا رات کو بھی حاضری کے لئے بلایا جاتا ہے؟''

اس نے ہنستے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''جائے گی تو پتہ چلے گا۔ بڑی لمبی حاضری ہوتی ہے۔ صبح چھٹی ملتی ہے۔''

وہ اس ادھیڑ عمر کی عورت کو گھور کر دیکھنے لگی۔ اس کی باتیں کچھ سمجھ میں آئی تھیں۔ وہ کچھ اور سمجھنا چاہتی تھی۔ اس نے افسوسناک لہجے میں کہا۔ ''میری عمر ڈھل گئی ہے۔ میرا بلاوا نہیں آتا۔ اگر آتا تو میں بھی فائدے میں رہتی۔ جیلر کے مہمان اچھی خاصی بخشش دیتے ہیں۔ رقم بھی ملتی ہے۔ اچھا کھانے کو بھی ملتا ہے۔ یہ جو بھی گئی ہیں' بڑے فائدے میں رہتی ہیں۔ جیلر ان پر مہربان رہتا ہے۔ دن کو ان سے زیادہ مشقت نہیں کرواتا۔''

بلوری بڑی حد تک سمجھ گئی کہ وہاں قیدی عورتوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہے؟ جن سے راتوں کو مشقت لی جاتی ہے' انہیں دن کو آرام سے رہنے دیا جاتا ہے۔ پھر اچھا کھانے اور پہننے کو بھی ملتا رہتا ہے۔

وہ اندر سے سہمی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں' اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جانے والا تھا؟ وہ رات گزر گئی۔ جب دوسری رات آئی تو اس عورت نے کہا۔ ''آج تجھے ضرور بلایا جائے گا۔''

وہ بری طرح گھبرا رہی تھی۔ رات کو جب سپاہی نے آہنی دروازہ کھولا اور صرف ایک عورت کو وہاں سے لے گیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ اس عورت نے شدید حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے' ایسا پکا پکایا تازہ پھل چھوڑ کر وہ باسی اٹھا کر کیوں لے جا رہے ہیں؟''

وہ تھوڑی دیر تک سر کھجاتے ہوئے سوچتی رہی۔ پھر ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''تُو ضرور کوئی الگ سی خاص چیز ہے۔ سپاہیوں نے یہاں کی ساری قیدی عورتوں کو تاکید کی ہے۔ جیلر کا حکم سنایا ہے کہ یہاں کی کوئی عورت تجھ سے لڑائی جھگڑا یا گالی گلوچ نہ کرے۔ تُو بتاتی کیوں نہیں' آخر کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ ایسی کون سی واردات کی ہے کہ جیلر تجھ سے خوش ہو کر یہاں آرام پہنچا رہا ہے؟ راتوں کو بلاتا نہیں ہے۔ دن کو مشقت نہیں لیتا ہے۔ کوئی تو بات ہے تجھ میں...''

بلوری پریشان ہو کر بولی۔ ''مجھ میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کیوں اس قدر بولتی رہتی ہو؟ میں تو جیلر کو جانتی بھی نہیں... یہاں آتے وقت ایک ہی بار اسے دیکھا تھا۔ تمہاری باتیں سن سن کر دل ہولتا رہتا ہے۔ آج نہیں تو کل میرے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہو سکتا ہے۔''

یہ کہتے ہی وہ رونے لگی۔ ''میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ ہائے ربّا...! کیا ہم عورتوں کو تُو اسی دن کے لئے پیدا کرتا ہے؟''

اسے اوپر سے بھی جواب ملنے والا نہیں تھا۔ یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ خدا کی اس بنائی ہوئی دنیا میں کچھ نہ کرو۔ اپنے لئے اور دوسروں کے لئے برا نہ کرو' تب بھی برے نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ معصوم رانو نے کسی قاتل کو ایک کنکر بھی نہیں مارا تھا۔ مگر وہ ماری گئی تھی۔

ماں نے دو بیٹیاں پیدا کی تھیں۔ کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ مگر آگ میں جل کر مر گئی تھی۔ باپ بھی صدمے سے دنیا چھوڑ گیا تھا اور وہ خود کیا تھی؟ ایک اَن چھوئی کنواری لڑکی... کسی نے اس کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ پھر بھی گناہ گار کہلاتی ہوئی اس جہنم میں پہنچ گئی تھی' جہاں قیدی عورتیں راتوں کو گناہ کا کھیل کھیلنے جاتی تھیں۔ اسے اسی جیل سے نکال کر عدالت میں پہنچا کر ایک ناکردہ گناہ کی سزا سنائی جانے والی تھی۔

پتہ نہیں' کب مقدمہ شروع ہونے والا تھا؟ کب پیشی ہونے والی تھی؟ ابھی تو یہ ہیبت طاری تھی کہ آئندہ جیل کی چار دیواری میں اس کے ساتھ نہ جانے کیسا سلوک کیا جانے والا ہے؟ اسے جس سیل میں رکھا گیا تھا' وہاں کی قیدی عورتیں بہت ہی خطرناک تھیں۔ ان میں سے ایک عورت نے اپنے شوہر کو قتل کیا تھا۔

دوسری عورت کا شوہر اس سے چھ ماہ کے بیٹے کو چھین کر طلاق دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس نے صرف اولاد کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اس سے شادی کی تھی۔ اس عورت نے اسے سمجھایا تھا کہ طلاق نہ دے۔ وہ آئندہ بھی اس کے لئے بچے پیدا کرے گی۔

مگر وہ شخص پہلے سے شادی شدہ تھا۔ پہلی بیوی بانجھ تھی۔ اسی لئے اس نے دوسری شادی کی تھی۔ اب اولاد ہونے کے بعد دوسری کو طلاق دینا چاہتا تھا۔ اس دوسری سے یہ توہین برداشت نہ ہو سکی۔ شوہر اسے زوجیت سے محروم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اسے

اولاد سے محروم کر دیا۔ اپنی ہی کوکھ سے پیدا ہونے والے بیٹے کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔

ان قیدیوں میں سے ایک عورت بڑے پیمانے پر چرس بیچنے کا دھندہ کرتی تھی۔ اس نے ایک بڑے پولیس افسر کو ماہانہ بھتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ افسر ریٹائرڈ ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا آنے والا تھا۔ لیکن کسی کے آنے سے پہلے ہی اس سابقہ پولیس افسر کی ملازمت کی مدت بڑھا دی گئی۔ اس نے ڈیوٹی جوائن کرتے ہی اس عورت کے تمام خفیہ اڈوں پر چھاپے مارے۔ اس کی اچھی طرح پٹائی کی۔ پھر اسے جیل میں پہنچا دیا۔

جیسے جیسے دن گزر رہے تھے۔ بلوری کو وہاں کی ایک ایک قیدی عورت کی ہسٹری معلوم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سب ہی گرم مزاج تھیں۔ ایک دوسرے سے لڑتی جھگڑتی اور گالیاں دیتی رہتی تھیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بلوری کی طرف رخ نہیں کرتی تھی۔ نہ اس سے دوستی کرتی تھیں' نہ دشمنی کرتی تھیں۔ اس ادھیڑ عمر کی عورت نے درست کہا تھا۔ اسے جیل کی چار دیواری میں خاص اہمیت دی جا رہی ہے۔ واقعی جیلر نے حکم دیا ہوگا کہ کوئی قیدی عورت بلوری سے بدتمیزی نہ کرے۔

اگرچہ یہ حکم اس کے حق میں تھا۔ مگر نا قابل فہم تھا۔ بری طرح بدنام ہو کر آنے والی کو جیل میں عزت مل رہی تھی۔ ذہن میں یہ بات کھٹک رہی تھی کہ اسے جو عزت اور سہولتیں وہاں مل رہی ہیں' ان کے پیچھے چوہدری دلاور حیات کی بدنیتی چھپی ہوئی ہے۔

اب سے تین برس پہلے چوہدری کی حویلی میں شادی کی تقریب تھی۔ اس کی بہن دلہن بن کر اپنے سسرال جانے والی تھی۔ پنڈ کی عورتوں کو بھی کھانے کی دعوت دی گئی تھی۔ وہاں ناچ گانا ہو رہا تھا' خوب جشن منایا جا رہا تھا۔ بلوری اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس حویلی میں ہنستی' بولتی' ناچتی' گاتی پھر رہی تھی۔ ایسے ہی وقت ایک جگہ تنہائی میں چوہدری نے اُسے دبوچ لیا تھا۔

اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ اسے تھوڑی دیر تک جھنجھوڑتا رہا۔ پھر ڈھیل دیتے ہوئے بولا۔ "رب دی سوں... آج تک تیری جیسی مٹیار نہیں دیکھی۔ ایک رات کے لئے بھی آئے گی تو تجھے مالا مال کر دوں گا۔"

وہ "اُونہہ" کہہ کر جانا چاہتی تھی۔ چوہدری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "ہم چوہدری

ضد کے پکے ہوتے ہیں۔ جو دل میں ٹھک جائے اور ہاتھ نہ آئے۔ اسے اٹھوا لیتے ہیں۔ جا..... جتنی دور بھاگ سکتی ہے۔ بھاگتی جا... میں جب چاہوں گا' تجھے آ کر دبوچ لوں گا۔"

کچھ دنوں کے بعد اس کی خاص ملازمہ بلوری کے پاس آئی تھی۔ اس نے بڑی رازداری سے کہا۔ "چوہدری تجھے یاد کرتا ہے۔ اس نے کہا ہے' راضی ہو جا... چھپ چھپا کر آئے گی تو بدنامی نہیں ہوگی۔ جو مانگے گی' وہ تجھے ملے گا۔"

بلوری نے کہا۔ "چوہدری سے جا کر بول... میں ایک عورت کا حق مانگتی ہوں۔ اس بات کی حق دار ہوں کہ مجھے محبت ملے' عزت ملے۔ وہ یہاں آ کر میرا رشتہ مانگے۔ مجھے اپنی دلہن بنا کر لے جائے۔ پھر میں راضی ہوں۔"

چوہدری اسے شریک حیات نہیں' داشتہ بنانا چاہتا تھا۔ سیاست کے میدان میں عروج حاصل کر رہا تھا۔ ایک حسین لڑکی کے لئے کوئی غلط قدم اٹھا کر اپنی شہرت کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ اس لئے صبر کر رہا تھا۔ بعد میں اس نے اپنے بڑے بھائی کے لئے بلوری کا رشتہ مانگا تھا۔ بشیر نے اس مطالبے کو بری طرح ٹھکرا دیا تھا۔ بلوری کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چوہدری اس سے کس طرح انتقام لے گا؟

یہ جانتی تھی کہ چوہدری نے اسے فیقے کے ساتھ بدنام کیا ہے اور جیل کی چار دیواری میں پہنچا دیا ہے۔ اس کی یہ بات ذہن میں گونجتی رہتی تھی۔ "جا... جتنی دور بھاگ سکتی ہے۔ بھاگتی جا... میں جب چاہوں گا' تجھے آ کر دبوچ لوں گا۔"

وہ ایک کامیاب سیاست دان تھا۔ بڑے وسیع اختیارات کا مالک تھا۔ ایک کمزور بے گناہ لڑکی کو جیل کی چار دیواری میں پہنچانے والا انتقاماً کسی وقت بھی آ کر اسے دبوچ سکتا تھا۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی کہ اس وزیر با تدبیر کے حکم سے جیل میں اسے سہولتیں پہنچائی جا رہی تھیں۔

ایک رات اس کا اندازہ درست نکلا۔ ایک سپاہی نے آہنی دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "بلوری...! تیری ملاقات آئی ہے۔"

اس نے چونک کر سپاہی کو پھر اپنے آس پاس بیٹھی ہوئی اور لیٹی ہوئی قیدی عورتوں کو دیکھا۔ ان میں سے کوئی مسکرانے لگی۔ کسی نے کروٹ بدل کر منہ پھیر لیا۔ پاس بیٹھی ہوئی ادھیڑ

عمر کی عورت نے کہا۔ ''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟ سوچتی کیا ہے؟ جا...آج تیری باری ہے۔''

وہ جانے کے لئے اٹھی۔ اس کے دونوں پاؤں کانپ رہے تھے۔ دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ اس وقت جان بھی جاتی رہتی' تب بھی اسے جانا ہی تھا۔ وہ سپاہی کے پیچھے چلتی ہوئی جیل کے ایک کھلے ہوئے حصے میں آئی۔ وہاں ایک بہت ہی شاندار قیمتی کار کھڑی ہوئی تھی۔ جیلر چند سپاہیوں کے ساتھ موجود تھا۔ ایک سپاہی نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ جیلر نے بلوری سے کہا۔ ''چل اندر بیٹھ جا...''

اس نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

جیلر کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ اس سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ بالالفاظ دیگر اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے کوئی سوال نہ کر۔ گاڑی میں بیٹھ جا۔ آگے جا کر تجھے سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

جیلر کے غصے اور رعب دبدبے سے سب ہی خوف زدہ رہتے تھے۔ مگر اس وقت وہ بھیگی بلی بنا ہوا تھا۔ بڑی نرمی سے بول رہا تھا۔ اس سے نظریں بھی نہیں ملا رہا تھا۔ وہ چپ چاپ پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے دائیں بائیں دو گن مین آ گئے۔ اگلی سیٹ پر بھی ڈرائیور کے ساتھ ایک گن مین بیٹھا ہوا تھا۔ پچھلی سیٹ کے دونوں طرف کے دروازے بند ہو گئے۔ گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔

اس کے شیشے کلرڈ تھے۔ اندر بیٹھنے والے باہر والوں کو نظر نہیں آ سکتے تھے۔ اندر والوں کو باہر کے مناظر کسی حد تک دکھائی دیتے تھے۔ لیکن رات کا وقت تھا۔ دکانیں بند تھیں۔ سڑکوں پر کہیں کہیں روشنی تھی۔ بلوری اتنا جانتی تھی کہ اسے ملتان کی سینٹرل جیل میں رکھا گیا ہے۔

اس وقت وہ اسی شہر کی سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ کوئی پانچ برس پہلے اس نے لاہور شہر دیکھا تھا۔ ملتان بھی دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کی یہ خواہش اب پوری ہو رہی تھی۔ سزا پانے کے لئے ہی سہی... وہ پچھلے تین مہینوں سے اسی شہر میں سانسیں لے رہی تھی۔

وہ کار ایک عالیشان کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی۔ پھر پورچ میں آ کر رک گئی۔ دونوں گن مین اسے اپنے درمیان لے کر کوٹھی کے اندر ایک وسیع و عریض ڈرائنگ

روم میں آ گئے۔ وہاں ایک بوڑھی ملازمہ تھی۔ اس نے بلوری سے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

وہ اس کے پیچھے چلتی ہوئی ایک شاہانہ طرز کے بیڈ روم میں پہنچ گئی۔ بوڑھی خادمہ اسے چھوڑ کر باہر چلی گئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ دوسری طرف ایک اور دروازہ تھا۔ جب وہ کھلا تو کھلی ہوئی چوکھٹ پر چوہدری دلاور حیات نظر آیا۔

اسے دیکھتے ہی بلوری کا سر چکرانے لگا۔ وہ کھڑی نہ رہ سکی۔ پاس ہی ایک صوفہ تھا۔ وہ گرنے کے انداز میں اس پر بیٹھ گئی۔ چوہدری فاتحانہ انداز میں اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ''میری باتیں یاد ہیں یا بھول چکی ہے...؟ میں نے کہا تھا' مجھ سے بھاگ رہی ہے تو جا... بھاگتی چلی جا... میں جب چاہوں گا' تجھے دبوچ لوں گا۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس نے کہا۔ ''میں تجھ پر کوئی ظلم نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے تجھے گناہ گار ثابت کیا۔ بدنام کیا۔ مگر تیری عزت پر آنچ نہیں آنے دی۔ میرے زرخرید فیقے نے تجھے ہاتھ لگانے کی بھی جرات نہیں کی۔''

وہ اس کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں جھوٹا نہیں کھاتا۔ اس لئے تیرے گھر سے جیل کی چار دیواری تک ایسی پابندیاں عائد کرتا رہا کہ کوئی تجھے چھو بھی نہ سکا۔ تجھے تو میرا احسان مند ہونا چاہئے۔ ایک طرح سے میں تیری عزت و آبرو کا محافظ بنتا آیا ہوں۔''

وہ رو رہی تھی۔ چوہدری نے اس کے گورے گورے گلابی مکھڑے کو انگلیوں سے چھو کر کہا۔ ''تجھے اپنی حماقت پر رونا چاہئے۔ پہلے ہی دن مجھے قبول کر لیتی تو تیری بہن اور تیرے ماں باپ زندہ رہتے۔ تیرا گھر برباد نہ ہوتا۔ اپنے پنڈ سے اتنی دور جیل کی چار دیواری میں نہ آتی۔ تُو خالص گھی ہے۔ سیدھی انگلی سے نہیں نکل رہی تھی۔ اب ٹیڑھی انگلی سے نکال رہا ہوں۔''

اس نے فاتحانہ انداز میں اسے اپنی طرف کھینچا۔ پھر دونوں بازوؤں میں دبوچ لیا۔ فرعونی قوتیں رکھنے والے پوری قوم کو دبوچ لیتے ہیں۔ ایک بے بس اور کمزور سی لڑکی بھلا کس گنتی میں تھی؟

یا خدا...! گناہ گاروں کو دی جانے والی سزائیں سمجھ میں آتی ہیں۔ لیکن کسی بے

گناہ کو دی جانے والی سزا کا کیا جواز ہے؟
جو حاکم' جو منصف خطا کاروں کو سزا دیتا ہے' وہی ایک بے گناہ کے ساتھ گناہوں کا مرتکب ہو رہا تھا۔ کیا دنیا کا یا قدرت کا کوئی قانون اسے سزا دے سکتا ہے...؟
اے معبود...! ہمیں معاف کر دے۔ بعض حالات میں تیری قدرت' تیرا قانون سمجھ میں نہیں آتا۔

صبح ہونے سے پہلے اسے جیل کی چار دیواری میں پہنچا دیا گیا۔ وہ اپنی کوٹھری میں آہنی سلاخوں کے پیچھے آ کر بیٹھ گئی۔ پھر گھٹنوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ صبح اذان سے پہلے قیدیوں کو جگانے کے لئے گھنٹا بجایا جا رہا تھا۔
وہاں کی قیدی عورتیں بھی معمول کے مطابق اٹھ بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ رہی تھیں۔ لیکن کوئی اس کے قریب نہیں آئی۔ سب ہی جانتی تھیں کہ اس کے ساتھ کیا کچھ ہوا ہے؟ جو کچھ بھی ہوا تھا' وہ کوئی نئی اور افسوس کرنے والی بات نہیں تھی۔ آبرو کی اہمیت شریف گھرانوں میں ہوتی ہوگی۔ وہاں عورت کا بدن دو کوڑی کا سمجھا جاتا تھا۔ وہ ننگے الفاظ میں کہتی تھیں کہ انہیں اسی لئے پیدا کیا گیا ہے۔ پھر رونا کس بات کا....؟
اس کے قریب چٹائی پر بیٹھنے لیٹنے والی اس ادھیڑ عمر کی عورت نے کہا۔ "نی کڑیئے...! نئے نئے زخم ہیں۔ نئے نئے آنسو ہیں۔ رو لے... خوب رو لے۔ پھر تجھے صبر کرنا اور کسبی بن کر رہنا آ جائے گا۔"

دوسری رات پھر اسے چوہدری کے پاس پہنچا دیا گیا۔ اس نے بڑے پیار سے آغوش میں لیتے ہوئے کہا۔ "تو بڑی عجیب شے ہے۔ کل رات روتے روتے مجھے خوش کرتی رہی۔ میں وہ ساری ادائیں بھول نہیں پاؤں گا۔ سوچتا ہوں' جب راضی خوشی آتی رہے گی تو نہ جانے اور کیسی اداؤں سے خوش کرتی رہے گی؟ میں تجھے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ بس یہ سمجھ لے کہ اب میں نے تجھے نہیں پکڑا ہے' تُو نے مجھے پکڑ لیا ہے۔"
وہ اس سے زیادہ بولنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر دل میں جو باتیں تھیں' انہیں بیان کرنا ضروری تھا۔ اس نے پوچھا۔ "تم جی بھر کر انتقام لے چکے ہو۔ کیا اب بھی تمہارا دل نہیں بھرا؟ میری بہن' میرے ماں باپ' میرا گھربار اور میری عزت سب کچھ چھین چکے ہو۔ اب

چھیننے کے لئے کیا رہ گیا ہے؟ کب تک مجھ سے انتقام لیتے رہو گے؟"
"ہاں۔ خوب جی بھر کر تیرے خاندان کی اور تیری دھجیاں اڑا دی ہیں۔ اتنی محنت کے بعد تُو ملی ہے۔ لگتا ہے' محنت کا پھل مل رہا ہے۔ بڑا مزہ آ رہا ہے بس... اب انتقام نہیں لوں گا۔"
"تو پھر مجھے معاف کر دو۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔"
"پیچھا چھڑانے والی بات نہ کر۔ کل رات وڈا چوہدری یاور حیات لندن سے آ رہا ہے۔ اسے بھی خوش کرنا ہے۔ ہم اپنی زمینوں کو اور داشتاؤں کو اس وقت چھوڑتے ہیں' جب وہ کسی کام کی نہیں رہتیں۔ زمین بانجھ ہو جائے' فصل نہ اگائے تو اسے بیچ دیتے ہیں۔ عورت کھنڈر ہو جائے تو اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکتے ہیں۔"
اس نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ "ابھی تو تم نے کہا تھا' مجھ سے اور انتقام نہیں لو گے؟"
"اب بھی یہی کہتا ہوں' تیرے ساتھ بھلائی کروں گا۔ کیس کو کمزور بنا کر تجھے جیل سے باہر نکالوں گا۔ اس میں کچھ دیر لگے گی۔ کیونکہ معاملہ عدالت تک پہنچ گیا ہے۔ ایک وکیل کرنا ہوگا۔ وہ تیرا مقدمہ لڑے گا۔"
اس نے پوچھا۔ "میرے خلاف جو تصویری ثبوت ہیں' کیا وہ عدالت میں نہیں پہنچیں گے؟"
"وہ تمام تصویریں میرے پاس ہیں۔ کسی کے ہاتھ نہیں لگیں گی۔ نہ ہی عدالت تک پہنچیں گی۔ تیرے خلاف جو سرکاری وکیل ہوگا' وہ بھی اپنا ہی بندہ ہوگا۔ وہ کیس کو کمزور کر دے گا۔ مقدمہ شروع ہوگا تو دونوں طرف کے وکلاء اس کیس کو پہلی ہی پیشی میں ختم کر دیں گے۔"
یہ سن کر ایک ذرا اطمینان ہو رہا تھا کہ اس کا کیس کمزور کیا جائے گا۔ عدالت میں اسے بے گناہ ثابت کیا جائے گا۔ جبراً بدنام کی جانے والی لڑکی کے لئے یہ بہت بڑی بات تھی۔
دوسری صبح ہونے سے پہلے وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے واپس آئی تو صدمات کے ہجوم میں رہائی کی امید اسے بہلا رہی تھی۔ ایک مدت کے بعد زندگی میں ذرا سی خوشگوار

تبدیلی آنے والی تھی۔ پتہ نہیں، وہ تبدیلی کب آنے والی تھی؟ مگر اس کے اندر جینے کی اُمنگ پیدا ہو رہی تھی۔

صبح کی اذان ہونے لگی۔ قیدی عورتیں جاگنے لگیں۔ اس کے قریب چٹائی پر لیٹی ہوئی ادھیڑ عمر کی عورت نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لینے لگی۔ بلوری نے گھور کر پوچھا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟''

اس نے ذرا آگے کی طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آج بھی ایک ہی تھا؟''

اس کا یہ سوال بلوری کو پتھر کی طرح لگا۔ وہ خوش آئند خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ چوہدری کی یہ بات عارضی طور پر بھول گئی تھی کہ وڈا چوہدری بھی لندن سے اسے نوچنے کھسوٹنے آ رہا ہے۔ اس عورت نے دیکھا، بلوری کے چہرے پر جو دھیمی دھیمی سی رونق جھلک رہی تھی، وہ ایکدم سے بجھ گئی تھی۔

اس عورت نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''سمجھ گئی... نصیب والیوں کو کوئی ایک چاہنے والا ملتا ہے۔ ہمارے نصیب میں تو پیک اُگلنے والے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ عدالتی فیصلوں سے پہلے یہاں سزائیں ملتی رہتی ہیں۔ ایک ہوں یا دس... بھگتنا ہی پڑتا ہے۔''

بلوری کا سر چکرا رہا تھا۔ اس نے گرنے کے انداز میں لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ جب بچاؤ کی کوئی صورت نہ ہو اور بلائیں جھپٹنے آ رہی ہوں تو کبوتر کی طرح آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ سہا ہوا ذہن کہتا ہے، آنکھ بند کر کے ہم چھپ گئے ہیں۔ بلا اب ہمیں نہ دیکھے گی، نہ ہماری طرف آئے گی...

ہونے والی بات ضرور ہوتی ہے۔ آنے والی مصیبت ضرور آتی ہے۔ جب وہ تیسری رات وہاں پہنچی تو وڈا چوہدری لندن سے ہوس پوری کرنے چلا آیا تھا۔ وہ بوڑھا ہوس پرست جوانوں سے مختلف تھا۔ خوابگاہ میں آتے ہی ایسی حرکتیں کرنے لگا تھا، جیسے صبح ہونے سے پہلے اسے چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔

بڑے ہی ظالمانہ انداز میں، بڑے ہی جوش و خروش سے اسے پالینا چاہتا تھا۔ مگر جب پانے کا وقت آتا تو ہانپنے اور کانپنے لگتا تھا۔ بڑھاپا اسے دبوچ لیتا تھا۔ تھک ہار کر ایک

طرف گر کر اسے حسرت سے دیکھنے لگتا تھا۔

دنیا میں عجیب و غریب طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ بندوق اٹھائے دندناتے پھرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے، جیسے ابھی گولی اندر اور دم باہر کر دیں گے۔ عین وقت پر چلتا ہے، گولی اندر نہیں ہے۔ بندوق خالی ہے۔ جذبات بادلوں کی طرح اُمڈ اُمڈ کر آتے ہیں۔ خوب گرجتے ہیں۔ مگر برسنے سے پہلے دھوپ نکل آتی ہے۔ وہ ناکامی وہ نامرادی کے باعث جھنجھلاتا رہا۔ ایک کمزور عورت پر تشدد کرتا رہا۔ خود کو جھنجھوڑ کر جگانا چاہئے۔ وہ اسے جھنجھوڑتا اور بھنبھوڑتا رہا۔

اس نے رات دو بجے تک کئی بار دودھ کے ساتھ دوائیں کھائیں۔ آخری بار دوا کھانے کے بعد گہری نیند سو گیا۔ بلوری نے وہاں سے واپس آتے وقت خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ دل ہی دل میں بددعائیں دیتی رہی۔ اسے کوستی رہی۔ ''ربّ کرے... سو گیا ہے تو سوتا ہی رہ جائے۔''

دنیا کے ستر اسی فیصد لوگ اس لئے ناکام نامراد، بےبس، مجبور اور بدحال ہیں کہ ان کی دعائیں کبھی قبول نہیں ہوتیں۔ اس کے باوجود یہی ستر اسی فیصد لوگ زیادہ نمازیں پڑھتے ہیں اور زیادہ دعائیں مانگتے ہیں۔

یہ درست کہا گیا ہے کہ روز روز کی ملاقات سے اپنی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے۔ مدتوں بعد کبھی ملنے جاؤ تو بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا جاتا ہے۔ سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ شہزوروں کو، حکمرانوں کو کبھی کبھی خدا یاد آتا ہے۔ وہ کبھی کبھی عید کی نمازیں پڑھنے جاتے ہیں تو فوراً ان کی دعائیں قبول ہو جاتی ہیں۔

بلوری مسلسل عذاب اٹھاتے اور صدمات سہتے سہتے اس قدر مایوس اور بدظن ہو گئی تھی کہ خدا کو یاد کرنا بھول گئی تھی۔ یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کتنے مہینوں سے نہ نماز پڑھی ہے، نہ کبھی ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی ہے۔

اس روز وہ جیل کی چاردیواری میں واپس آئی تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ اس نے گھٹنوں میں منہ چھپا کر آنکھیں بند کر لیں۔ بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ وڈے چوہدری نے اپنی ناکامی و نامرادی سے جھنجھلا کر اسے اس طرح نوچا کھسوٹا تھا کہ جگہ جگہ خراشیں پڑ گئی

تھیں۔ درد کی ٹیسیں بھی اٹھ رہی تھیں۔

اس نے گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگی۔ ''ہم گرے پڑے مٹی میں ملے ہوئے لوگ ہی سہی مگر تیرے بندے ہیں۔ کبھی تو ہماری دعائیں قبول کر لیا کر۔ میرے حال پر رحم نہیں کرے گا تو دوسری رات میں مر ہی جاؤں گی۔ پتہ نہیں' وہ جھنجھلا کر اور کیسے کیسے ظلم کرے گا؟ میرے سوہنے ربا! میں تجھ سے زیادہ نہیں مانگتی۔ ایک ننھی جنی دعا قبول کر لے۔ مجھے ان چوہدریوں سے نجات دلا دے...''

واہ کیا بات ہے۔ کبھی کبھی ثابت ہو جاتا ہے کہ خدا ہے اور وہ سنتا ہے۔ دوسری رات اسے بلایا نہیں گیا۔ پتہ چلا' وڈا چوہدری چل بسا ہے۔ بعد میں تفصیلات معلوم ہوئیں۔ ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا تھا اور کہا تھا۔ ''وڈے چوہدری نے قوت باہ پیدا کرنے والی دوائیں بہت زیادہ مقدار میں کھالی تھیں۔ یہ تو پہلے ہی دل کے مریض تھے۔ دواؤں کا ری ایکشن برداشت نہ کر سکے۔''

بعض حالات میں ایسا ہوتا ہے۔ ایک کمزور کسی ظالم کو مار نہیں سکتا۔ مگر وہ ظالم خود ہی اپنی موت کا سامان کر لیتا ہے۔ وڈے چوہدری نے خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی۔ ایسے وقت عقیدت مندی کہتی ہے' دعاؤں نے اثر دکھایا ہے۔ اگر ایسا ہے تو چٹکی بھر دعا قبول ہوئی تھی۔ اصل چوہدری دلاور حیات اس کے سینے پر مونگ دلنے کے لئے زندہ تھا۔ شیطان کبھی مرتا نہیں ہے۔ ادھر ادھر سے ٹوٹ کر پھر جڑ جاتا ہے۔

ایک ہفتے بعد سپاہی نے آہنی دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''بلوری...! تیری ملاقات آئی ہے۔''

اس نے حیرانی سے سوچا۔ ''صبح دس بجے کون ملنے آیا ہے؟ میرا تو اب اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔''

اس نے سپاہی کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ ''کون آیا ہے؟''

''ایک وکیل صاحب ہیں۔ منسٹر صاحب کے حکم سے یہاں آئے ہیں۔''

کسی قیدی کو اپنے ملاقاتی سے تنہا کمرے میں ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ مگر وہ نہ تو گناہ گار تھی اور نہ ہی ابھی عدالت سے سزا سنائی گئی تھی۔ اسے تو جبراً قیدی بنا کر رکھا

گیا تھا۔ چونکہ چوہدری صاحب کی داشتہ تھی' اس لئے اسے خاص رعایتیں دی جاتی تھیں۔

اس کمرے میں ایک میز اور دو کرسیاں تھیں۔ ایک صحت مند قد آور جوان کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بلوری کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بڑے ادب سے بڑی تابعداری سے دونوں ہاتھ باندھ لئے۔ اس کی جی حضوری کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ چوہدری صاحب کی داشتہ کی خوشنودی حاصل کرنے آیا ہے۔

اس نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھیں... میرا نام ایڈووکیٹ سلطان احمد ہے۔ میں لاہور کے بہت ہی معروف ایڈووکیٹ فہیم احمد کے مقدمات میں ان کا خاص معاون رہا ہوں۔ ان کے معاملات سنبھالتا رہا ہوں۔ چوہدری صاحب نے آپ کا یہ کیس مجھے دیا ہے۔ یہ میری زندگی کا پہلا مقدمہ ہے' جسے میں تنہا عدالت میں لڑوں گا۔''

بلوری نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا مجھے رہائی مل جائے گی؟''

''بے شک۔ مقدمہ بہت ہی کمزور ہے۔ آپ پر خواہ مخواہ الزام لگایا گیا ہے۔''

وہ سر اٹھا کر بولی۔ ''آپ نہیں... الزام ثابت نہیں ہوا ہے۔ پھر بھی میں ایک ملزمہ ہوں اور آپ میرے نجات دہندہ ہیں۔''

''ہاں۔ مگر آپ کی وجہ سے مجھے یہ پہلا کیس ملا ہے اور آپ میرے محسن کی۔ کی...''

وہ آگے نہ کہہ سکا۔ وہ بولی۔ ''داشتہ ہوں۔''

اس نے چونک کر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر فوراً ہی سر کو جھکا لیا۔ ہچکچاتے ہوئے ایک فائل کو کھولتے ہوئے کہا۔ ''چوہدری صاحب نے آپ کے متعلق جو بتایا ہے۔''

وہ بولی۔ ''آپ نہیں... تم... میں اپنی اوقات یاد رکھنا چاہتی ہوں۔''

وہ پھر ہچکچاتے ہوئے فائل پر نظر رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم... تمہارے بارے میں چوہدری صاحب نے جو کچھ بتایا ہے' اس کے مطابق میں نے کیس کی تیاری کی ہے۔ تمہیں عدالت میں یہ بیان دینا ہے کہ رفیق عرف فیقے سے کبھی تمہارا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ وہ تمہارے والد بشیر مرحوم کی دکان میں ایک معمولی سا ملازم تھا۔''

وہ فائل پر انگلی رکھتے ہوئے پڑھ رہا تھا۔ ''رانو کے مرڈر کیس میں اے ایس پی کفیل احمد نے گڑبڑ کی تھی۔ رانو کے جو قاتل نہیں تھے انہیں قاتل بنا کر گرفتار کیا تھا۔ پھر حوالات سے فرار ہونے پر مجبور کیا اور پولیس مقابلے کے بہانے انہیں مار ڈالا۔''

بلوری نے کہا۔ ''یہ جھوٹ ہے۔ طافو اور بھولو ٹکڑی چوہدری کے کارندے تھے۔ انہوں نے ہی میری بہن کو قتل کیا تھا۔''

وہ بولا۔ ''حقیقت جو بھی ہو۔ سچ بولو گی تو مجھ پر اور تم پر احسان کرنے والے چوہدری صاحب مہربان سے نامہربان ہو جائیں گے۔ تم سچ بول کر گویا اپنے احسان کرنے والے کو مجرموں کا سرپرست کہو گی۔ پلیز میری بات سمجھو۔ اس جیل کی چار دیواری سے نکلنے کے لئے جھوٹ بولنا سیکھ لو۔''

بلوری خاموش رہی۔ کچھ نہ بولو تو خاموشی بولتی ہے۔ وہ ہر حال میں رہائی چاہتی تھی۔ جھوٹ بولنے کے لئے راضی ہو گئی۔ وہ فائل پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے مرحوم والد بشیر کریانہ والے نے اپوزیشن کے لیڈروں سے مل کر اے ایس پی کفیل احمد کے خلاف آواز اٹھائی تو وہ تم لوگوں کا بدترین دشمن ہو گیا۔

اس نے رفیق عرف فیقے کو اپنا آلہ کار بنا کر ایک رات تمہارے گھر میں گھسنے پر مجبور کیا۔ پھر تم دونوں پر بدکاری کا الزام لگایا۔ جبکہ بدکاری کے سلسلے میں کوئی چشم دید گواہ نہیں ہے۔ گاؤں والوں نے بھی اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ کفیل احمد کے سپاہیوں نے گاؤں والوں کو بلا کر یہ جھوٹا تاثر دیا تھا کہ اس نے تم دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔''

وہ بولی۔ ''مگر وہ کم بخت اے ایس پی میرے خلاف زہر اگلنے سے باز نہیں آئے گا۔''

''وہ کتنا ہی زہر اگلتا رہے۔ اس کے پاس چشم دید گواہ نہیں ہیں۔ تم پر بدکاری کا الزام ثابت نہیں ہو سکے گا۔ چوہدری صاحب نے کہا ہے۔ پہلی پیشی میں ہی اس مقدمے کو ختم کر دیا جائے اور میں یہی کوشش کروں گا۔''

''پہلی پیشی کب ہو گی...؟''

''پتہ نہیں۔ کئی کئی برس کے مقدمات التواء میں پڑے ہیں۔ پندرہ پندرہ بیس بیس برسوں سے کتنے ہی ملزمان جیلوں میں پڑے رہتے ہیں۔ عدالتی کارروائیوں کا انتظار

کرتے رہتے ہیں۔ امید ہے' تمہارے معاملے میں دیر نہیں ہو گی۔ چوہدری صاحب اسلام آباد میں ہیں۔ سیاسی معاملات میں الجھے ہوئے ہیں۔ واپس آتے ہی تمہارا کیس اوپن کرائیں گے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی۔ اسے مٹھی میں بند کیا۔ پھر کہا۔ ''تمہارے کیس سے تو میں نمٹ ہی لوں گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے دشمن سے ایک مقدمہ لڑوں گا۔ اس مقدمے میں تم میرا ساتھ دو گی۔''

وہ چپ تھی۔ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنی مٹھی اس کی طرف بڑھا کر کھول دی۔ کھلی ہوئی ہتھیلی پر چاندی کی ایک پائل رکھی ہوئی تھی۔ اس چھوٹی سی' نازک سی پائل میں کہیں کہیں سرخ نگینے جڑے ہوئے تھے۔ بلوری آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایسے دیکھنے لگی' جیسے اس پائل کو پہچان رہی ہو۔

نوجوان ایڈووکیٹ سلطان احمد نے کہا۔ ''یہ تمہاری ہے۔''

بلوری نے لپک کر اس پائل کو اٹھا لیا۔ ادھر ادھر سے دیکھنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''اب سے آٹھ برس پہلے تم اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ وہیں یہ جھانجھر گم ہو گئی تھی ناں...؟''

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ''یہ جھانجھر تمہارے پاؤں سے نکل گئی تھی۔ میں چھپ کر تمہیں دیکھ رہا تھا۔ تمہارے جانے کے بعد اسے اٹھا لیا۔ میں تو جوان تھا۔ مگر تم ایک کمسن الھڑ سی لڑکی تھیں۔ میرے جذبات کو نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ میں اس پائل کو چرا کر لے گیا تھا۔ اسے اپنے ساتھ لے کر سوتا تھا۔ سینے سے لگا کر اپنے دل کی باتیں کہتا تھا۔''

وہ حیرانی سے سن رہی تھی۔ کبھی پائل کو کبھی اس کی صورت کو تک رہی تھی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟ وہاں میرے پنڈ میں کیسے پہنچے تھے؟''

''میں اسی پنڈ کا رہنے والا ہوں۔ تم نے دن رات مجھے وہاں دیکھا ہے۔ ان دنوں میں ایک دبلا پتلا سا نوجوان تھا۔ کالج میں پڑھنے کے لئے شہر جایا کرتا تھا۔ وہاں اپنے ماموں کے گھر میں رہتا تھا۔ مہینے دو مہینے میں ماں باپ کے پاس آتا تھا تو تمہیں آتے جاتے' کھیلتے کودتے دیکھتا رہتا تھا۔ میرے باپ کا نام غلام حسین تھا۔ سب اسے گامو کہتے

تھے۔ وہ چوہدری کے کھیتوں میں کام کرتا تھا۔"

بلوری نے چونک کر پوچھا۔ "تم گاموچاچا کے بیٹے ہو...؟"

اس نے تائید میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ "ہاں۔ اب کچھ کچھ تمہیں پہچان رہی ہوں۔ تمہاری تین بہنیں تھیں اور وہ تینوں..."

بلوری کہتے کہتے رک گئی۔ آگے کچھ ایسی باتیں تھیں' جنہیں بولنا نہیں چاہتی تھی۔ الفاظ زبان تک آنے سے انکار کر رہے تھے۔

سلطان احمد کا سر جھک گیا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آگے میں بولتا ہوں۔ بہت ہی شرمناک بات ہے۔ چوہدری نے میری تینوں بہنوں کو داشتائیں بنا کر رکھا تھا۔ بظاہر وہ حویلی میں کام کرتی تھیں۔ مگر چوہدری کی خدمات کے لئے وقف تھیں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "چوہدری بڑا مہربان تھا۔ اس نے کوئی ظلم نہیں کیا تھا۔ میرے بوڑھے کسان باپ سے سمجھوتہ کیا تھا۔ میں بہت آگے پڑھنا چاہتا تھا۔ وکالت میں نام کمانا چاہتا تھا۔ اس نے میرے اخراجات برداشت کئے۔ مجھے پڑھنے کے لئے لاہور بھیج دیا۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ "مجھے بے شرم اور بے غیرت کہہ لو۔ چھوٹی بہن کے جوان ہونے تک چوہدری کا بڑی بہن سے دل بھر گیا تھا۔ اس کا رشتہ آیا تو اس نے راضی خوشی اس کی شادی کرا دی اور دوسری بہن کو اپنی حویلی میں بلا لیا۔ اس سے دل بھرنے تک تیسری بہن جوان ہو گئی تھی۔ اس نے دوسری کی بھی شادی کرا دی۔"

بلوری کا سر بھی جھک گیا تھا۔ وہ شکستہ لہجے میں بول رہا تھا۔ "ایک بوڑھا کسان بیٹیوں کا بوجھ سر سے نہیں اتار سکتا تھا۔ چوہدری نے ایک ایک کر کے اس کا سارا بوجھ اتار دیا۔ اس سے بڑی اور کیا بات ہو گی کہ اس نے مجھے ایک ایڈووکیٹ بنا دیا۔ مزید احسان یہ کیا کہ عدالت میں ایک ایڈووکیٹ کی حیثیت سے مقدمہ لڑنے کے لئے تمہارا یہ کیس میرے حوالے کر دیا۔"

وہ غصے سے نفرت سے بولی۔ "بس کرو۔ اپنی بے غیرتی کی روداد سناتے ہوئے تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آ رہی ہے؟"

"شرم آتی ہے۔ ہم بھی انسان ہیں۔ ہمیں بھی شرم آتی ہے۔ مگر ہم جیسے لوگ جلد بازی میں ہی حالات کی چابک کھا کر سوچتے ہیں۔ سمجھتے ہیں۔ میں یہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ حالات سے سمجھوتہ نہ کیا تو ایڈووکیٹ نہیں بن سکوں گا۔ باپ کی طرح ایک کسان بن کر اسی چوہدری کی غلامی کرتا رہوں گا۔ آدھا پیٹ کھاؤں گا اور بچوں کو بھی فاقے کراتا رہوں گا۔ میری جو بیٹیاں ہوں گی۔ وہ بھی میری بہنوں کی طرح چوہدری کے بیٹوں کی حویلیوں میں جایا کریں گی۔"

اس نے بلوری کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "جو لوگ حالات سے سمجھوتہ نہیں کرتے۔ ان کی چھوٹی بہنیں کھیتوں میں بڑی شرمناک درندگی سے ماری جاتی ہیں۔ ان کی مائیں خود کو آگ لگا کر جل مرتی ہیں۔ باپ صدمے سے جان دے دیتے ہیں اور جوان بیٹیاں اس جیل کی چار دیواری میں آ کر اسی چوہدری کی داشتہ بن جاتی ہیں۔"

وہ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولا۔ "تمہاری غیرت' تمہاری شرافت' تمہارے ماں باپ کا ایمان بالآخر تمہیں اسی بے غیرتی کے مرحلے پر لے آیا ہے۔ جہاں سے میں چلتا ہوا ایڈووکیٹ بن کر تمہارے سامنے آیا ہوں۔"

اس نے اپنی کہنیاں میز پر ٹیک کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ پھر اپنے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ہولے ہولے سسکنے لگا۔ کسی برے آدمی کو برا کہو تو اسے بھی یقیناً برا لگتا ہے۔ پھر حالات کا تجزیہ کرو تو پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ ماں کے پیٹ سے برے بن کر' بے غیرت بن کر پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ ہماری دنیا نے اور ہم نے انہیں ایسا بنا دیا ہے۔ کیسا عجب تماشہ ہے' ہم ہی ان پر برائی ڈالتے ہیں اور ہم ہی ان پر تھوکتے ہیں۔

بلوری نے اسے بڑے دکھ اور ندامت سے دیکھا۔ دکھ اس بات کا تھا کہ خواہ مخواہ اسے بے شرم اور بے حیا کہہ دیا تھا۔ جبکہ خود بے شرمی کی زندگی گزار رہی تھی۔ وہ دونوں ہی اپنی مرضی سے بے غیرتی قبول نہیں کر رہے تھے۔

بلوری اس لئے نادم ہو رہی تھی کہ جو اس کی مدد کرنے اور اسے آہنی پنجرے سے نکالنے آیا تھا' وہ اسی کو کچوکے لگا کر رلا رہی تھی۔ وہ صحت مند' قد آور نوجوان روتا ہوا عجیب سا لگ رہا تھا۔ ان لمحات میں اس پر بڑا پیار آ رہا تھا...

پیار کی بات دماغ میں آئی تو وہ ایکدم سے چونک گئی۔ اس نے سر جھکا کر اپنی ہتھیلی کو دیکھا۔ آٹھ برس پہلے کی ننھی سی نوخیز پائل کہہ رہی تھی' اس کے سامنے ایک ایسا دیوانہ بیٹھا ہے' جو برسوں سے اس جھانجھر کو اپنی دھڑکنوں سے لگا کر کروٹیں بدلتا رہا ہے۔

ہائے... دنیا کی ہر لڑکی ایسا ہی دیوانہ عاشق چاہتی ہے۔ اسے بھی ایک دیوانہ ملا۔ مگر ایسے وقت جب وہ اپنی پائل کی طرح کوری اور کنواری نہیں رہی تھی۔

اس نے ایک سرد آہ بھر کر بڑی حسرت سے پائل کو دیکھا۔ پھر اسے سلطان احمد کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ "اسے رکھ لو..... یہ تمہاری دھڑکنوں سے لگنے والی بہت معصوم ہے۔ اسے تمہارے سوا کسی نے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ میں میلی ہو چکی ہوں۔ اس کنوارے پیار کی پاکیزگی کو مجھ سے دور رکھو۔"

"میری ایک نہیں' تین بہنیں ایک ایک کر کے میلی ہوتی رہیں۔ میں نے کبھی ان سے نفرت نہیں کی۔ کبھی اپنی نظروں سے دور نہیں کیا۔ ان کی طرح تمہیں بھی حالات مجبور کر رہے ہیں۔ خود کو نظروں سے نہ گراؤ۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں' شادی کروں گا تو تم سے ورنہ تمہاری جھانجھر کو سینے سے لگائے ساری زندگی گزار دوں گا۔"

"خواہ مخواہ جذباتی بن رہے ہو۔ یہ اچھی طرح جانتے ہو۔ یہاں سے رہائی ملے گی' تب بھی چوہدری میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ وہ تمہارا محسن بھی ہے اور حاکم بھی۔ کیا مجھے اس سے چھین کر لے جا سکو گے؟"

"میں ایک عیاش اور ہوس پرست کو اپنا محسن نہیں مانتا۔ اس نے خدا کے نام پر نیکی کمانے کے لئے میرے تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کئے ہیں۔ وہ پچھلے دس برسوں سے میری بہنوں کو اور میرے دل میں دھڑکنے والی بلوری کو رشوت کے طور پر حاصل کرتا رہا ہے۔"

وہ سر جھکا کر اس پائل کو اپنی پیشانی سے لگاتے ہوئے بولا۔ "یہ جو تمہارے سامنے ایک بے غیرت بیٹھا ہوا ہے' پچھلے دس برسوں سے خون کے گھونٹ پیتا آ رہا ہے۔ یہ ایڈووکیٹ بننے والا دن رات وکالت کی موٹی موٹی کتابیں پڑھتا رہا ہے۔ میرے اندر قانونی ہتھکنڈوں کی بارود بھرتی رہی ہے۔ وہ مجھے اوپر سے نہیں اندر سے قتل کرتا آ رہا ہے۔ اب میں بھی ان کے اندر بارود کی طرح بچھا رہوں گا۔ جب بھی موقع ملتا رہے گا' بڑی خاموشی

سے دھماکے کرتا رہوں گا۔"

وہ اسے سوچتی ہوئی اور تولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ اس میں کتنا دم خم ہے؟ اس نے کہا۔ "میں نہیں جانتی' تم قانون کے ہتھیار سے کس طرح لڑو گے؟ مگر سنا ہے' چھوٹے سے چھوٹا کیس لڑنے کے لئے بھی لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔ تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئے گی؟ ابھی تو تم نے پہلا کیس لیا ہے۔ چوہدری تمہاری محنت کا معاوضہ کیا دے گا؟ وہ تو اپنے احسانات جتائے گا۔ تین وقت کی روٹیوں کے لئے کچھ رقم دے دے گا۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "بس یہی میری ایک کمزوری ہے۔ میں قانون کو الجھانا اور سلجھانا جانتا ہوں۔ مگر کنگال ہوں۔ پھر بھی حوصلہ ہے' دشمن سے انتقام لینے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکالتا رہوں گا۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پائل کو چوم کر جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ "پھر کسی دن آؤں گا۔ میری کوشش ہو گی کہ جلد سے جلد تمہیں پیشی کی تاریخ مل جائے اور پہلے ہی دن کیس ختم ہو جائے۔ میری کامیابی کے لئے دعائیں کرتی رہنا۔"

وہ چلا گیا۔ بلوری ایک سپاہی کے پیچھے چلتی ہوئی اپنی کوٹھری میں آ گئی۔ اب تک وہ اپنے بدترین حالات سے بیزار ہو گئی تھی۔ مایوس ہو کر سوچتی تھی۔ "یہ زندگی ایسے گزار نہیں پاؤں گی۔ رہائی ملے گی' تب بھی کہاں جاؤں گی؟ کہیں سر چھپانے کی جگہ نہیں ہے۔ جب تک جوان رہوں گی' چوہدری مجھے برداشت کرتا رہے گا۔ پھر اپنی زندگی سے باہر تھوک دے گا۔"

اس کا آج بھی تاریک تھا اور آنے والا کل بھی... ایسے گھور اندھیروں میں سلطان احمد جگنو کی طرح جلتا بجھتا چلا آیا تھا۔ وہ اپنے حوصلوں کی چمک دکھا رہا تھا۔ مگر بجھتا ہوا سا بھی لگ رہا تھا۔ آئندہ اس کا سہارا بن پاتا یا نہیں...؟ یہ بعد کی باتیں تھیں۔ ابھی تو ہوا کے ایک تازہ جھونکے کی طرح آ رہا تھا۔

پہلی بار وہ کنواری پائل بلوری کے اندر چھم چھم کر رہی تھی۔ ایک مدت کے بعد اس نے آہنی سلاخوں کے پیچھے بھرپور انگڑائی لی۔ انگڑائی کی اٹھان پر بدن ٹوٹنے لگا۔ پہلی بار

یوں ٹوٹنا اور اپنے اندر بکھرنا اچھا لگ رہا تھا۔

جیل کیا ہے...؟ انسانوں کا پنجرہ ہے۔ جانور پھر بھی انسانوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ صیاد انہیں اچھا کھانے کو دیتا ہے۔ انہیں پچکارتا ہے' پیار کرتا ہے۔ اپنی ذات سے مانوس کرتا ہے۔ مگر انسانوں کے پنجرے میں کوئی پچکارنے اور پیار کرنے نہیں آتا۔ کوئی گناہ گار ہو یا نہ ہو' وہاں لا کر اسے فاحشہ بنا دیا جاتا ہے۔ ان پر جبر کیا جاتا ہے اور انہیں صبر کرنا سکھایا جاتا ہے۔

جیل کی چار دیواری میں پانا چاہو تو سب کچھ ملتا ہے۔ مگر محبت نہیں ملتی۔ وہ تو بالکل مایوس ہو گئی تھی۔ مگر اچانک ہی محبت کی ایک گمشدہ چٹھی چھم چھم کرتی سلاخوں کے پیچھے چلی آئی تھی۔ سلطان احمد اس کے اندر محبت کرنے اور زندہ رہنے کا بہت سارا سامان چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کے اندر بارش ہونے لگی تھی۔ وہ دن رات خیالی جھولے جھولنے لگی تھی۔ یوں جیل کے جہنم میں زندگی گزارنا آسان ہو گیا تھا۔

ایک ماہ گزرنے لگا۔ سلطان احمد پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا۔ "وہ سچ مچ میرا دیوانہ ہے۔ میری رہائی کے لئے جی جان سے کوشش کر رہا ہوگا۔ یہاں سے رہائی دلانے کے بعد چوہدری سے نجات دلانے کی فکر میں ہوگا۔"

چوہدری اسلام آباد سے واپس نہیں آیا تھا۔ وہ اپنی خیر منا رہی تھی۔ ایسے ہی وقت ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا۔

ایک رات تقریباً دو بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کوٹھری کی تمام عورتیں اپنی اپنی جگہ آرام و سکون سے سو رہی تھیں۔ ایک اسے ہی سکون نہیں تھا۔ اس نے کوئی ڈراؤنا خواب نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی اٹھ بیٹھی تھی۔

گھبراہٹ کے ساتھ کمزوری بھی محسوس ہو رہی تھی۔ سینے پر بوجھ سا تھا۔ وہ سینے کو سہلاتے ہوئے پاس لیٹی ہوئی عورت کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ وہاں کی عورتیں آپس میں لڑتی ضرور تھیں۔ لیکن دکھ بیماریوں میں ایک دوسرے کے کام آتی تھیں۔

ایسے ہی وقت ابکائی سی محسوس ہوئی۔ اس نے فوراً ہی اپنا دوپٹہ اٹھا کر منہ پر رکھ لیا۔

شاید قے ہونے والی تھی۔ وہ آگے کی طرف جھک گئی۔ حلق سے "اونک اونک" کی آوازیں نکلنے لگیں۔

قریب ہی سونے والی عورت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ یہ سمجھ گئی کہ اس کی طبیعت خراب ہے۔ شاید پیٹ میں کوئی گڑبڑ ہے۔ قے کرنا چاہتی ہے۔ بلوری کا سر چکرانے لگا تھا۔ متلی ہو رہی تھی۔ سینے پر بوجھ تھا۔ مگر اندر سے کچھ نہیں نکل رہا تھا۔

وہ عورت اس کی پیٹھ سہلانے لگی۔ ایسے وقت ایک ذرا کھٹا سا نمکین سا پانی حلق سے خارج ہوا۔ وہ بری طرح ہانپتے ہوئے گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ پھر نڈھال سی ہو کر تکیے پر گر پڑی۔

اس عورت نے کہا۔ "ذرا سیدھی ہو کر لیٹ جا۔ مجھے دیکھنے دے تیرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟"

وہ لیٹے لیٹے سیدھی ہو گئی۔ دوسری تمام عورتیں گہری نیند میں تھیں۔ اس عورت نے اسے ایک ذرا ٹٹولنے کے بعد کہا۔ "حوصلہ کر۔ ہر آنے والی مصیبت پہلے ڈراتی ہے' پریشان کرتی ہے۔ پھر پچھلی مصیبتوں کی طرح اپنی سہیلی بن جاتی ہے۔"

بلوری کچھ زیادہ ہی نڈھال ہو گئی تھی۔ آنکھیں کھولنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس عورت نے اس کے پیٹ پر ہلکی سی چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔ "بچہ جننے والی ہے۔"

بلوری نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ ایک تو ویسے ہی گھبراہٹ طاری تھی۔ اوپر سے وہ پریشان کرنے والی خبر سنا رہی تھی۔ وہ بے یقینی سے اس کا منہ تکنے لگی۔ اس نے کہا۔ "زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں عورتوں کے ساتھ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ صبح جیلر کو معلوم ہوگا تو وہ بچہ گروا دے گا۔"

اگرچہ ایک مصیبت آ رہی تھی۔ تاہم اس عورت کی یہ بات کچھ اچھی نہیں لگی۔ اس نے اپنی ماں کی بھرپور ممتا دیکھی تھی۔ مگر ذاتی تجربہ نہیں تھا کہ اپنے وجود کے اندر ایک نیا وجود کلبلانے لگے تو عورت کے احساسات اور جذبات کیا ہوتے ہیں؟

بلوری نے اس بچے کو بلایا نہیں تھا۔ اس کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ وہ

تو اچانک ہی کنواری ممتا کی کائنات پر پھیلنے چلا آیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کمزور سی آواز میں بولی۔ ’’کیا سچ کہہ رہی ہو؟ کیا میں...؟‘‘

وہ اپنے دونوں ہاتھ دکھاتے ہوئے بولی۔ ’’میں نے دائی کا کام بھی کیا ہے۔ ان ہاتھوں سے کتنے ہی بچے پیدا کروائے ہیں۔ صبح جیلر یہاں کی ایک حرافہ سے تیرا معائنہ کرائے گا۔ تجھے گالیاں دے گا' تیرے پیٹ پر لاتے مارے گا تو بچہ آنے سے پہلے ہی رخصت ہو جائے گا۔‘‘

وہ سن رہی تھی۔ ایک بچے کے خلاف ایسی باتیں سن کر اندر ہی اندر انجانی سی تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ اس نے کبھی ماں بننے کی بات نہیں سوچی تھی۔ کبھی پیار سے ایک بچے کا تصور نہیں کیا تھا۔ مگر ان لمحات میں وہ اس کے حواس پر چھا رہا تھا۔ ایک کنواری ماں کا دل اپنی مٹھی میں لے کر کہہ رہا تھا۔ ’’ہمارے جیسے بچے کسی ضرورت کے بغیر آتے ہیں۔ پھر ماں کی سب سے اہم اور بنیادی ضرورت بن جاتے ہیں۔‘‘

بلوری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ’’جیلر کو معلوم نہیں ہونا چاہئے۔‘‘

وہ گھور کر بولی۔ ’’کیا...؟ اس سے کب تک چھپائے گی؟ پانی میں رہ کر مگر مچھ سے کب تک چھپتی پھرے گی؟ آج نہیں تو کل یہ پیٹ چغلی کھائے گا۔‘‘

’’ہاں میں سمجھتی ہوں مگر...‘‘

وہ بے چینی سے پہلو بدل کر بولی۔ ’’میں... ابھی میں کچھ سوچنا چاہتی ہوں' سمجھنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’میں تیری ممتا کو سمجھ رہی ہوں۔ مگر تُو اپنی مرضی سے اپنی زندگی نہ گزار رہی ہے نہ کبھی گزار پائے گی۔ پھر بچے کے لئے کیا سوچے گی؟ کیا سمجھے گی؟ اس ننھی ہستی نے ابھی اپنی آہٹ سنائی ہے۔ کل صبح یہ آہٹ ایسے ختم ہو جائے گی' جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔‘‘

’’مگر جیلر ایسا کیوں کرے گا؟ کیا میں اپنی مرضی سے اپنے بچے کو جنم نہیں دے سکتی؟‘‘

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ’’جیلر پر الزام آئے گا کہ اس نے یہاں تجھے منہ کالا کرنے کی اجازت دی تھی۔ تجھ پر الزام ہے نا کہ تُو باہر گناہ کرتی ہوئی پکڑی گئی تھی؟‘‘

بلوری نے ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’ہاں... مگر میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔‘‘

’’جو وہاں نہیں کیا تھا' یہاں ہو گیا۔ جیلر پر بات آئے گی۔ اسے اپنی صفائی میں بیان دینا ہو گا کہ یہ بچہ کہاں سے آیا ہے؟ اس کی نوکری بھی جائے گی اور سزا بھی ہو گی۔‘‘

اس نے کچھ سوچ کر سہم کر پوچھا۔ ’’کیا وہ میرے پیٹ پر لاتیں مارے گا؟ کیا بچہ اسی طرح گرایا جاتا ہے؟‘‘

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ’’تُو نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ مگر یہ تمام عورتیں کہتی ہیں' تجھے کسی بڑے آدمی نے یہاں رکھا ہے۔ تجھ سے مشقت نہیں لی جاتی۔ جیلر اور سپاہی بھی گالیاں نہیں دیتے۔ یہ کسی بڑے آدمی کا بچہ ہے۔ اس لئے وہ تجھ پر ظلم نہیں کرے گا۔ بڑی خاموشی اور رازداری سے اسے ختم کرا دے گا۔‘‘

بچے کو ختم کرنے والی بات ایسی ہی تھی' جیسے پیٹ پر لات پڑ رہی ہو۔ بچہ لاتیں کھا کر رو رہا تھا۔ وہ تڑپ کر بولی۔ ’’میری ایک بات مان لو۔ جیلر کو اور یہاں کی عورتوں کو ابھی کچھ نہ بتاؤ۔‘‘

’’تُو کہتی ہے تو کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ مگر کب تک بات چھپائے گی؟‘‘

’’میں اپنے وکیل سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ جو ہو رہا ہے' ہونے دوں گی۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ اپنے وکیل سے باتیں کر کے تسلی کر لے۔ مگر ہو گا وہی' جو وہ بڑا آدمی چاہے گا اور وہ اپنی بدنامی کبھی نہیں چاہے گا۔‘‘

بلوری نے دوسرے دن جیلر سے کہا۔ ’’میں اپنے وکیل سے ملنا چاہتی ہوں۔‘‘

جیلر نے کہا۔ ’’چوہدری صاحب اجازت دیں گے تو مل سکو گی۔‘‘

’’تو پھر چوہدری صاحب سے میری بات کراؤ یا ان سے کہہ دو' میں اپنے کیس کے سلسلے میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ ایڈووکیٹ سلطان احمد سے ملنا ضروری ہے۔‘‘

جیلر نے چوہدری دلاور حیات سے فون پر رابطہ کرنا چاہا۔ وہ بہت مصروف تھا۔ اس کے پی اے نے کہا۔ ’’صاحب میٹنگ میں ہیں۔ آپ کا پیغام پہنچا دیا جائے گا۔‘‘

جیلر نے بلوری سے کہا۔ ”تم جاؤ۔ میں ایک آدھ گھنٹے بعد پھر چوہدری صاحب سے رابطہ کروں گا۔“

وہ پھر سلاخوں کے پیچھے چلی گئی۔ جیلر نے دو گھنٹے بعد رابطہ کیا۔ چوہدری نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”سر...! بلوری اپنے کیس کے بارے میں کچھ ضروری باتیں کرنے کے لئے ایڈووکیٹ سلطان احمد سے ملنا چاہتی ہے۔ کیا آپ بلوری سے بات کرنا چاہیں گے؟“

”میں بہت مصروف ہوں۔ اس سے پھر کسی دن بات کروں گا۔ میں ابھی سلطان احمد سے کہتا ہوں' وہ کل تمہارے پاس آئے گا۔ اسے بلوری سے ملا دو۔“

دوسرے دن اسی کمرے میں ان کی ملاقات ہوئی۔ وہ بلوری کو دیکھتے ہی بولا۔ ”تم سمجھ رہی ہوگی کہ تمہارے بلانے سے آیا ہوں ورنہ کبھی نہ آتا۔ میں تو بار بار آنا چاہتا ہوں۔ تمہارا وکیل ہوں' تم سے ملنے کا جواز رکھتا ہوں۔ قانونی طور پر مجھے اجازت مل سکتی ہے۔ مگر چوہدری نے اجازت نہیں دی۔“

وہ دونوں چھوٹی سی میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ بلوری نے پوچھا۔ ”اس نے اجازت کیوں نہیں دی؟ کیا اسے کوئی اعتراض ہے؟“

”وہ حاکم ہے' آقا ہے' ہمارا محسن ہے۔ کسی وجہ کے بغیر ہمیں ایک دوسرے سے دور رکھ سکتا ہے۔ جب میں نے دوسری بار تم سے ملنے کی بات کی تو اس نے کہا' ملاقات ضروری نہیں ہے۔ جب پیشی کی تاریخ پڑے گی' تب اس سے ایک ہی ملاقات کرنے جا سکتے ہو۔“

وہ بولی۔ ”وہ مجھ سے فون پر بھی بات نہیں کر رہا ہے۔ ربّ کرے' اسی طرح اس سے پیچھا چھوٹ جائے۔ پر مقدمہ کا فیصلہ ہونے تک میرا کیا بنے گا؟ تم سہارا بن گئے تھے۔ مگر وہ تمہیں بھی مجھ سے دور رکھتا ہے۔“

”وہ سیاسی معاملات میں الجھا ہوا ہے۔ میں نے اپنے طور پر تمہاری فائل آگے بڑھانی چاہی تھی۔ کوشش کرتا رہتا تو مقدمے کی سماعت جلدی شروع ہو جاتی مگر چوہدری غصے سے باتیں سنانے لگا۔ اپوزیشن والے اسے بہت پریشان کر رہے ہیں۔ ان سے نمٹنے

کے بعد ہی وہ تمہارے معاملے کو عدالت میں پہنچانا چاہتا ہے۔“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”اس کے سیاسی جھمیلوں کا میرے مقدمے سے اور رہائی سے کیا تعلق ہے؟ میرے معاملے میں نہ اس کا نام آ رہا ہے' نہ وہ عدالت میں حاضری دے گا۔ سارا کام تو تم کر رہے ہو۔ آج بھی وہ تمہیں حکم دے تو تم مجھے یہاں سے نکال سکتے ہو۔“

”یہی بات تو ہے' حاکم فوراً ہی حکم نہیں دیتا۔ ہم اس کے رحم و کرم پر رہتے ہیں۔ دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ اس کی خوشامدیں کرتے رہتے ہیں کہ وہ نامہربان نہ ہو۔ کسی طرح مہربانی فرما دے۔“

”مجھے تمہارا' آسرا ہے مگر تم چوہدری کے محتاج ہو۔ اس کی مرضی کے بغیر مجھے یہاں سے نہیں نکال سکو گے۔“

”کوئی کتنا ہی شہزور کیوں نہ ہو۔ ہمیشہ فرعون بن کر نہیں رہ پاتا۔ چھ ماہ بعد الیکشن ہونے والے ہیں۔ چوہدری اور اس کی پارٹی ملک میں بہت بدنام ہو چکی ہے۔ آئندہ وہ اقتدار حاصل نہیں کر سکے گا۔ اپوزیشن میں رہنے والی ایک بڑی سیاسی پارٹی ضرور اپنی حکومت بنائے گی۔ میں اس پارٹی کے ایک بہت بڑے لیڈر سلامت علی کا اعتماد حاصل کر چکا ہوں۔ اس کی پارٹی اقتدار سنبھالے گی تو چوہدری کے تمام اختیارات ختم ہو جائیں گے۔ پھر اس کی من مانی نہیں چلے گی۔ ساری چوہدراہٹ ختم ہو جائے گی۔ پھر ہم...“

بلوری نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”اس کا مطلب ہے' مجھے چھ ماہ تک الیکشن کا انتظار کرنا ہوگا۔ پھر اس کے بعد بھی جیتنے والے سیاستدان اپنی حکومت بنانے میں اس قدر مصروف رہیں گے کہ مہنگائی' بے روزگاری' کرپشن اور کشمیر جیسے مسائل کے سامنے میں کہیں نظر نہیں آؤں گی۔“

”تمہارا مسئلہ ان کے لئے بہت ہی معمولی سا ہوگا۔ سلامت علی صاحب ایک حکم دیں گے اور پہلی پیشی میں تم رہا کر دی جاؤ گی۔“

”ہم ہر آنے والی حکومت کے متعلق اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ غریب عوام کے مسائل حل کرے گی۔ مگر ہمارے مسائل بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ میں کوئی سیاسی بحث نہیں کروں گی۔ اپنے بارے میں کہتی ہوں' ایک تو چھ ماہ تک الیکشن کا انتظار کرنا

ہوگا۔اس کے بعد بھی کچھ نہ ہوا تو کیا ہوگا؟''

سلطان احمد نے کہا۔''میں صرف آئندہ الیکشن پر تکیہ نہیں کر رہا ہوں۔ مالی طور پر بھی اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کی کوششیں کر رہا ہوں۔اگر تمہیں یہاں سے رہائی دلانے اور چوہدری سے نجات دلانے کے لئے مجھے تم سے دور ہونا پڑے گا تو یہ جدائی برداشت کرلوں گا۔دور ہی دور سے تمہیں آزاد اور شاد و آباد دیکھتا رہوں گا۔میں جس طرح بات بنا رہا ہوں' اس طرح بن جائے گی تو ایک دو ماہ کے اندر ہی چوہدری کی مرضی کے خلاف تمہیں یہاں سے رہائی دلاسکوں گا۔''

بلوری نے بے یقینی سے پوچھا۔''کیا ایسا ممکن ہے؟''

وہ سر جھکا کر بولا۔''ہاں ممکن ہے۔اس سیاسی لیڈر سلامت علی سے میری ایک ڈیلنگ ہو رہی ہے۔اگر بات بن جائے گی تو سیاسی طور پر مجھے ایک طاقتور حمایت حاصل ہو جائے گا اور میری مالی پوزیشن بھی مضبوط ہو جائے گی۔''

اس نے تعجب سے پوچھا۔''یہ سب کیسے ہوگا؟''

''سلامت علی اور اپوزیشن کے دوسرے لیڈر یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں چوہدری دلاور حیات کا خاص بندہ ہوں۔اس کے اندر کے معاملات کو بہت دور تک سمجھتا ہوں۔وہ میرے ذریعے اس کی کمزوریاں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔سلامت علی مجھے اپنا وکیل مقرر کرنا چاہتا ہے۔ایسا ہو جائے گا تو میں اس کے ذریعے تمہارے کیس کو اچھالوں گا اور جلد سے جلد عدالت تک پہنچاؤں گا۔''

''کیا تمہیں یقین ہے' ان بڑے لوگوں کی باتوں میں آکر دھوکہ نہیں کھاؤ گے؟''

''بے شک۔سیاستدان اپنے مفادات کی خاطر کسی وقت بھی اپنی نیت اور اپنا ایمان بدل دیتے ہیں۔اپوزیشن کے لیڈر مجھے ایک معمولی مہرے کی طرح استعمال کر کے کسی وقت بھی ٹھوکریں مار سکتے ہیں لیکن...''

وہ آگے کہتے ہوئے ذرا ہچکچانے لگا۔بلوری اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔''میں سلامت علی کے خاندان کا بہت اہم فرد بننے والا ہوں۔اس کے بعد وہ مجھے دھوکہ نہیں دے سکے گا۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں...؟''

''وہ...وہ ابھی میں نے تم سے کہا تھا' تمہاری رہائی کے لئے اور چوہدری سے نجات دلانے کے لئے تم سے دور ہونا پڑا تو میں تمہاری جدائی برداشت کرلوں گا۔وہ...وہ دراصل مجھے اپنا داماد بنانا چاہتا ہے۔''

بلوری کے دل کو ایک ذرا سی ٹھیس پہنچی۔وہ اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے بولی۔''اتنا بڑا سیاستدان تمہیں اپنا داماد بنائے گا؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔اسے تو بڑے اونچے گھرانوں کے داماد مل سکتے ہیں۔''

''شہناز بہت خوبصورت' اسمارٹ اور ویل ایجوکیٹیڈ ہے۔مگر بہت ہی مغرور اور سرپھری ہے۔کسی مرد کے زیر اثر نہیں رہنا چاہتی۔اس نے ماں باپ سے صاف کہہ دیا ہے کہ جو کٹھ پتلی بن کر رہے گا' اس سے شادی کرے گی۔بڑے بڑے سیاسی گھرانوں سے رشتے آتے ہیں۔مگر وہ سب حکمرانوں والا مزاج رکھتے ہیں۔کوئی اسے شریک حیات بنا کر جی حضوری نہیں کرے گا۔''

بلوری نے پوچھا۔''اور تم کرو گے؟''

''میں تمہاری خاطر کچھ بھی کرسکتا ہوں۔اس کی غلامی قبول کر کے اپنی جھانجھر کو رہائی دلاؤں گا۔''

بلوری نے اُسے بڑی عقیدت سے بڑی محبت سے دیکھا۔پھر کہا۔''پچھلی ملاقات میں تم نے میرے لئے بڑی دیوانگی ظاہر کی تھی۔کیا آئندہ دیوانگی ختم ہو جائے گی؟ میرے بغیر رہ سکو گے؟''

''میں پچھلے آٹھ برس سے تمہاری جھانجھر کے ساتھ رہتا آیا ہوں' اسی کے ساتھ زندگی گزار دوں گا۔''

''تمہارے پیار کا انداز دیکھ کر خوشی بھی ہو رہی ہے اور دکھ بھی ہو رہا ہے۔وہ لڑکی بہت مغرور ہے۔تمہیں جلد ہی ٹھکرا دے گی۔پھر کیا ہوگا؟''

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔''ایسا نہیں ہوگا۔وہ بہت ہی اعلیٰ سیاسی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔لندن میں رہتی ہے۔یورپ کے شہروں میں گھومتی پھرتی' شراب پیتی اور

کسی نہ کسی سے فلرٹ کرتی رہتی ہے۔ اگر ایک پاکستانی ایڈووکیٹ سے شادی کرنے کے بعد اسے ٹھکرائے گی یا طلاق لے گی تو اس کے خلاف اسکینڈل بنے گا۔ سیاستدان گھرانے چھوٹی بڑی بدنامیوں سے بچنے کی حتی الامکان کوششیں کرتے رہتے ہیں۔“

”تم یورپ میں اس کے پیچھے پیچھے پھرتے رہو گے؟“

”کوئی ضروری نہیں ہے۔ میں پاکستان میں رہوں گا۔ وہ جب بھی مجھے بلایا کرے گی‘ وہاں جایا کروں گا۔“

”اس کے تابعدار بننے کے بعد کیا اپنی وکالت جاری رکھ سکو گے؟“

”بے شک... اس کے باپ سلامت علی سے تمام معاملات طے ہو چکے ہیں۔ شہناز کے پاس میری تصویریں بھیجی گئی تھیں۔ اس نے مجھے پسند کر لیا ہے۔ میں ایک ہفتے کے لئے وہاں جاؤں گا۔ اس کے ساتھ دن رات گزاروں گا۔ وہ مجھے اپنے مزاج کے مطابق دیکھے گی‘ سمجھے گی‘ پرکھے گی پھر شادی کرے گی۔ اس کے بعد بھی میری وکالت جاری رہے گی۔ اپنے سسر کا خاص قابل اعتماد وکیل بن کر رہوں گا۔ وہ اپنے اس داماد کو ماہانہ پچیس ہزار روپے دیا کرے گا۔“

وہ چپ ہو گیا۔ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ وہ بھی اسے دیکھنے لگی۔ سوچنے لگی۔ ”یہ واقعی میرا دیوانہ ہے۔ میری خاطر ایک مغرور اور عیاش لڑکی کی غلامی قبول کر رہا ہے۔ صرف میری خاطر.... مجھے یہاں سے رہائی دلانے کے لئے اپنی غیرت اور خودداری کو کچل رہا ہے۔ آہ...! میرے محبوب! تم زندگی کے کس موڑ پر ملے ہو؟ ہم اپنی اپنی جان دے کر بھی ایک دوسرے سے مل نہیں پائیں گے۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”جب میری بڑی بہن پہلی بار حویلی میں گئی۔ تب ہی سے میں نے حالات کے سامنے جھکنا اور اپنی غیرت کو کچلنا سیکھ لیا تھا۔ عقل نے سمجھایا تھا‘ ایسا کروں گا‘ تب ہی ایڈووکیٹ بن سکوں گا۔ میں نے ایک سیاستدان کی طرح ایک طرف سے جھک کر دوسری طرف سے دوسروں کو جھکانا سیکھ لیا ہے۔“

اس نے سر اٹھا کر کہا۔ ”سلامت علی کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ وہ سیاست میں مجھے اپنا جانشین بنا سکتا ہے۔ میرے لئے صوبائی اور قومی اسمبلی تک پہنچنے کا راستہ ہموار کر سکتا ہے۔

میں اپنی غیرت کو اور خودداری کو کچل کر یہاں تک پہنچ رہا ہوں۔ جتنا سوچا نہیں تھا‘ اس سے زیادہ پا رہا ہوں اور...“

وہ بڑی حسرت سے بلوری کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اور جتنا سوچا نہیں تھا‘ اس سے زیادہ کھو رہا ہوں۔ میں تمہیں نئی زندگی اور نئی مسرتیں دے کر تم سے محروم رہوں گا اور بہت خوش رہوں گا۔ محبت میں قربت ضروری نہیں ہے۔“

بلوری کو اچانک کمزوری کا احساس ہوا۔ سینے پر بوجھ محسوس ہونے لگا۔ تب اسے یاد آیا۔ وہ بولی۔ ”میں نے ایک اہم بات کہنے کے لئے تمہیں بلایا تھا۔ مگر تم نے ایسی باتیں چھیڑیں کہ اپنی بات بھول گئی۔“

”تعجب ہے۔ کوئی اہم بات ہے اور تم نے اب تک نہیں بتائی؟“

اس نے سر جھکا لیا۔ پیشانی پر اس طرح ہاتھ رکھا کہ آنکھیں کسی حد تک چھپ گئیں۔ وہ کہیں دور جا کر چھپ کر بولی۔ ”میں..... ماں بننے والی ہوں۔“

سلطان احمد نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ جھکی جھکی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملتے ہی رونے لگی۔ کہنے لگی۔ ”میں کس دنیا میں پیدا ہوئی ہوں؟ ایک غلیظ الزام لگا کر یہاں قید کیا گیا‘ جبکہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ یہاں لا کر مجھے کنواری ماں بنا دیا گیا ہے؟ میں کس سے فریاد کروں؟ کہاں جا کر اپنا سر پھوڑوں؟“

وہ اپنے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئی بولی۔ ”کل سے میرا من مزاج بدل گیا ہے۔ وہ جو میرے اندر آ کر کہیں سا گیا ہے‘ ابھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ اس کے باوجود میرے اندر ممتا مچلنے لگی ہے۔ ایک تو جبراً مجھے ماں بنایا گیا‘ اس پر یہ کہا جا رہا ہے کہ میری ممتا کو قتل کر دیا جائے گا۔“

وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ”ہائے ربا! میری چھوٹی بہن ماری گئی۔ ماں باپ مارے گئے۔ اب اس بچے کو بھی میری کوکھ کے اندر کچل دیا جائے گا۔ کیا میرے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہوگا۔ مجھے بتاؤ‘ کیا اس بچے کو سچ مچ مار ڈالا جائے گا؟ میں اسے بچا نہیں پاؤں گی؟“

وہ اسے تک رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ”جس کی جھانجھر میرے سینے سے لگی رہتی

ہے۔ یہ بہت ہی بدنصیب ہے۔اس پر کوئی نہ کوئی آفت نازل ہوتی رہتی ہے۔سمجھ میں نہیں آتا' میں اس کے لئے کیا کروں؟ کس طرح اس کے دُکھ کم کروں؟"

وہ سوچتے سوچتے چونک گیا۔اس نے کہا۔"بلوری...! میری ایک بات مانو گی؟"

اس نے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے اسے دیکھا۔وہ بولا۔"تم نے جیل کے باہر کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ یہاں آ کر بھی اپنی مرضی سے کوئی بے شرمی نہیں کی۔اس کے باوجود اچھی خاصی بدنام ہو چکی ہو۔کیا میرے کہنے پر کچھ اور بدنامی قبول کرو گی؟"

اس نے تعجب سے پوچھا۔"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"تمہارے فائدے کی بات کر رہا ہوں۔فی الحال اپنی ماں بننے والی بات یہاں سب سے چھپاؤ۔ میں ابھی جا کر سلامت علی صاحب سے بات کروں گا۔اپوزیشن والے چوہدری کے خلاف اس بات کو بہت اُچھالیں گے۔جیلر کا محاسبہ کیا جائے گا۔اسے بتانا ہوگا کہ چوہدری تمہیں راتوں کو جیل سے باہر بلاتا ہے۔تمہاری عزت سے کھیلتا ہے۔جس کے نتیجے میں تم ماں بننے والی ہو۔"

بلوری نے کہا۔"جیلر چوہدری کے خلاف بیان نہیں دے گا۔وہ مجھے ماں بنانے کا الزام کسی دوسرے پر دھرے گا۔"

"اس معاملے میں عورت کی گواہی مستند اور فیصلہ کن ہوتی ہے۔ماں بننے والی ہی صحیح طور پر بتا سکتی ہے کہ اس کے بچے کا باپ کون ہے؟ کس نے اس کے ساتھ منہ کالا کیا ہے؟ جب تم بھری عدالت میں یہ بیان دو گی تو پلک جھپکتے ہی چوہدری اقتدار کی کرسی سے گر پڑے گا۔اس پر ایسی سیاسی مار پڑے گی کہ وہ سارے اختیارات سے محروم ہو کر قانون کی گرفت میں آ جائے گا۔"

"میں تو بری طرح بدنام ہو چکی ہوں۔تم کہہ رہے ہو تو کچھ اور بدنامیاں مول لے لوں گی۔"

"تمہارے کیس کو اُچھالنے اور جلد سے جلد عدالت تک پہنچانے کا یہی ایک راستہ ہے۔تمہیں رہائی پانے کے لئے مہینوں چوہدری کے رحم و کرم پر نہیں رہنا پڑے گا۔"

"مجھے کب تک یہ بات چھپانی ہوگی؟"

وہ سوچنے لگا۔بلوری نے کہا۔"تم ابھی یہاں سے جاؤ گے۔ پھر پتہ نہیں کب ملاقات ہو سکے گی؟ چوہدری تمہیں یہاں آنے نہیں دے گا۔مجھے ایک ایک بات اچھی طرح سمجھا دو کہ آئندہ کیا کرنا چاہئے؟"

وہ سوچتے ہوئے بولا۔"میں سلامت علی صاحب سے کہوں گا کہ وہ ایسے پولیس افسروں اور انٹیلی جنس والوں کی خدمات حاصل کریں' جو چوہدری کے مخالف ہیں۔انٹیلی جنس والے تمہارے سلسلے میں یہاں انکوائری شروع کرائیں گے۔اس سے پہلے جیلر کو انفارم کیا جائے گا کہ بلوری کے سلسلے میں تحقیقات کے لئے ایک ٹیم آ رہی ہے۔"

اس نے چپ رہ کر کچھ سوچا پھر کہا۔"مگر اس ٹیم کے جیل پہنچنے سے پہلے ہی جیلر چوہدری کو خطرے سے آگاہ کر دے گا۔وہ کم بخت وسیع اختیارات کا مالک ہے۔کچھ عرصے کے لئے ہی سہی... انکوائری رکوا دے گا۔تمہارا حمل گرا دیا جائے گا۔پھر مہینے دو مہینے بعد مخالفین کے بے حد اصرار پر تمہارا طبی معائنہ کرایا جائے گا تو یہی رپورٹ لکھی جائے گی کہ تم کنواری نہیں' آبرو باختہ ہو۔یوں بات تمہارے خلاف ہو جائے گی۔اس رپورٹ سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ تم پر درست الزام عائد کر کے جیل کی چار دیواری میں پہنچایا گیا ہے۔چوہدری کسی بھی طرح یہ ثابت نہیں ہونے دے گا کہ اسی جیل میں تمہارا حمل گرایا گیا ہے۔"

"پھر تو مجھے بات نہیں چھپانی چاہئے۔"

وہ مٹھیاں بھینچ کر بولا۔"میں اس بچے کے ذریعے تمہیں رہائی دلا سکتا ہوں۔مگر تین ماہ کے بعد۔"

اس نے پوچھا۔"تین ماہ کیوں...؟"

"تم کسی طرح تین ماہ تک اپنا حمل چھپائے رکھو گی تو اس کے بعد جیل کا کوئی سرکاری ڈاکٹر حمل گرانے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔تین ماہ بعد ایسا کرنے سے ماں بننے والیاں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔بہت کم ایسی ہوتی ہیں' جو زندہ رہ جاتی ہیں۔جیلر اور سرکاری ڈاکٹر تمہیں موت کی طرف لے جانے کی حماقت نہیں کریں گے۔"

وہ میز پر ہاتھ مار کر بولا۔"تب جیلر کو سچ بولنا پڑے گا کہ چوہدری کے حکم پر تمہیں راتوں کو جیل سے نکال کر اس کے پاس پہنچایا جاتا تھا۔"

بلوری نے کہا۔ ''میں تمہاری بات اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ مجھے تین ماہ تک یعنی اس وقت تک اپنا حمل چھپانا ہوگا' جب تک کہ یہ پیٹ چغلی نہ کھائے۔''

سلطان نے کہا۔ ''اس وقت تک ہماری ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ مگر میں چوہدری کا اعتماد حاصل کرتا رہوں گا۔ اس سے وفاداری ثابت کرنے کے لئے سلامت علی سے بھی ملاقات نہیں کروں گا۔ فون کے ذریعے کوئی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہوں گا کہ تین یا چار ماہ کے بعد اس کی بیٹی سے ملنے اور اس کا دل جیتنے کے لئے لندن جاؤں گا۔''

وہ سوچ رہا تھا اور بول رہا تھا۔ ''ٹھیک تین ماہ بعد میں سلامت علی کو اپنے اعتماد میں لوں گا۔ سچ بولوں گا کہ تمہارے ساتھ جیل میں کیا ہو رہا ہے؟ تمہیں انصاف دلانے اور وہاں سے رہا کرانے کی خاطر اس کی بیٹی سے شادی کر کے تاحیات غلام بننے والا ہوں۔ سلامت علی صرف بیٹی کے لئے ہی نہیں' اپنے حریف کو کرسی سے گرانے کے لئے بھی میرا ساتھ دے گا۔''

وہ کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ ''ایسے ہی وقت یہاں انکوائری شروع ہوگی۔ کوئی تمہیں موت کے منہ میں پہنچانے کے لئے تمہارے بچے کو ختم کرنے کی جرات نہیں کرے گا۔ اس طرح تم اپنے بچے کو بچا سکو گی۔ ہمارا کیس بہت مضبوط ہو جائے گا۔ تب میں چوہدری کو تلملانے اور انگاروں پر لوٹنے کا تماشہ دیکھوں گا۔''

وہ دونوں بڑی دیر تک اس معاملے کے ایک ایک پہلو پر غور کرتے رہے۔ یہ طے ہو گیا کہ بلوری تین ماہ تک اپنا حمل چھپائے گی۔ اس کے بعد سلطان احمد قانونی کارروائیاں شروع کرے گا۔ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے اور سمجھانے کے بعد رخصت ہو گئے۔

بلوری سلاخوں کے پیچھے آ کر بیٹھ گئی۔ دوسری تمام عورتیں معمول کے مطابق مشقت کرنے گئی تھیں۔ جب شام کو واپس آئیں تو بلوری نے اپنے قریب بیٹھنے لیٹنے والی عورت سے پوچھا۔ ''تم نے میرے بارے میں کسی سے کچھ کہا تو نہیں ہے؟''

اس عورت نے کہا۔ ''میں نے تجھے زبان دی ہے۔ جب تک تُو خود اپنا حمل ظاہر نہیں کرے گی۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ مگر تُو کب تک یہ بات چھپاتی رہے گی؟''

وہ بڑے مستحکم لہجے میں بولی۔ ''کم از کم تین ماہ تک...''

وہ ادھیڑ عمر کی عورت حیرانی سے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''تین مہینے... اس کے بعد جانتی ہے کیا ہوگا؟ حمل گرایا جائے گا تو تُو زندہ نہیں بچے گی۔''

وہ بولی۔ ''یہ بات جیلر اور سرکاری ڈاکٹر بھی جانتے ہوں گے۔ کیا وہ مجھے مار ڈالنے کے لئے ایسا کر پائیں گے؟''

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے بلوری کو دیکھنے لگی۔ پھر تائید میں سر ہلا کر بولی۔ ''ہاں۔ یہ تُو نے بڑی دور کی سوچی ہے۔ تیرا بچہ نہیں گرایا جائے گا۔ مگر جیلر مصیبت میں پڑ جائے گا۔''

''میں اسے مصیبت میں ڈال کر ہی اپنا مقدمہ شروع کرا سکتی ہوں اور یہاں سے رہائی پا سکتی ہوں۔''

وہ اس عورت کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑی عاجزی سے بولی۔ ''تم میرا ساتھ دو گی تو میں اپنے ارادوں میں کامیاب ہو سکوں گی۔ اپنی بیٹی یا چھوٹی بہن سمجھ کر میرا ساتھ دو۔ میں باہر جانے کے بعد بھی ساری عمر تمہارا احسان نہیں بھولوں گی۔''

وہ دوسرے ہاتھ سے اس کے شانے کو تھپک کر بولی۔ ''تُو میری دھی جیسی ہے۔ اطمینان رکھ' جب تک پیٹ نہیں نکلے گا۔ کسی کو اس بچے کی سن گن نہیں ملے گی۔''

سلامت علی نے فون کے ذریعے سلطان احمد سے کہا۔ ''میری بیٹی تم سے ملنا چاہتی ہے۔ تمہیں لندن جانا ہوگا۔ اپنا پاسپورٹ لے آؤ۔ کل تک ٹکٹ ہو جائے گا۔''

سلطان احمد نے کہا۔ ''میری کچھ مجبوریاں ہیں۔ میں اتنی جلدی لندن نہیں جا سکوں گا۔ کم از کم تین ماہ تک چوہدری دلاور حیات کا اعتماد بحال رکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد اس کی بہت بڑی کمزوری آپ کے پاس پہنچاؤں گا۔ آپ اس کمزوری سے کھیل کر اسے چشم زدن میں سیاست کی بلندی سے ذلت کی پستیوں میں گرا سکیں گے۔''

''اس کی ایسی کیا کمزوری ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔ ایسا کرو' آج شام یہاں آ جاؤ۔ رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ ہم اطمینان سے باتیں کریں گے۔''

''میں آپ سے ملاقات کرنے آؤں گا تو یہ بات چوہدری تک پہنچ جائے گی۔ وہ سمجھ لے گا کہ میں اس کے دشمنوں سے دوستی کر رہا ہوں۔''

''تین ماہ تک اس کے تابعدار بن کر رہنا چاہتے ہو۔ ایسی کیا بات ہے؟ میں نے

تم سے پہلے بھی کہا تھا' میرے پاس آؤ گے تو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اس پر لعنت بھیجو اور آج ہی سے میرے قانونی معاملات سنبھالنے چلے آؤ۔''

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔''آپ مجھے سوچنے کا موقع دیں۔ میں ایک گھنٹے بعد فون کروں گا۔''

سلطان احمد سوچنے لگا۔''کیا ضروری ہے کہ تین ماہ تک چوہدری کا تابعدار بن کر رہوں؟ تابعداری کے باوجود وہ مجھے بلوری کے پاس جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ ویسے بھی اگلے تین ماہ تک مجھے وہاں جانا نہیں چاہئے۔ سلامت علی کے سائے میں رہ کر بھرپور پلاننگ کرنی چاہئے۔''

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا' سوچنے لگا۔''سلامت علی بھی ایک چالباز سیاستدان ہے۔ میں اسے بلوری کے حالات بتاؤں گا تو وہ چوہدری کے خلاف کوئی کارآمد مشورہ دے سکے گا۔ اسے یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ میں بلوری کی خاطر اس کی بیٹی سے شادی کرنے اور اس کا تابعدار بن کر رہنے کے لئے راضی ہو رہا ہوں۔''

عقل سمجھا رہی تھی کہ ابھی سے بلوری کے سلسلے میں بھرپور پلاننگ ہونی چاہئے۔ وہ ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد سلامت علی سے ملنے کے لئے اس کی کوٹھی میں پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا۔''کیا چوہدری پر لعنت بھیج کر آئے ہو؟''

وہ بولا۔''فی الحال تو یہی سمجھیں۔ ابھی میں اپنے صحیح حالات بتانے آیا ہوں۔ بلکہ سچ بولنے آیا ہوں۔ اور سچ یہ ہے کہ میں ایک لڑکی بلوری کو دل و جان سے چاہتا ہوں۔ چوہدری نے اس پر جھوٹا الزام لگا کر اسے جیل کی چار دیواری میں پہنچا دیا ہے۔ اس کی عزت سے کھیل رہا ہے۔''

سلامت علی نے پوچھا۔''کیا اس سلسلے میں چوہدری کے خلاف ٹھوس ثبوت پیش کر سکتے ہو؟''

''آج سے تین ماہ بعد پیش کر سکوں گا۔ وہ ایسا ٹھوس ثبوت ہوگا کہ آپ چوہدری کے ہوش اڑا دیں گے۔''

''ایسا تجسس پیدا کرو گے تو میں اس سے انتقام لینے کے لئے بے چین ہو جاؤں

گا۔ تین مہینے تک کیسے صبر کروں گا؟''

''صبر تو کرنا ہوگا۔ کیونکہ وہ ٹھوس ثبوت تین مہینے کے بعد ہی ملے گا۔ ابھی آپ میری باتیں توجہ سے سنیں... میں آپ کی سرپرستی میں رہ کر طاقتور اور دولت مند بننا چاہتا ہوں۔ بلوری کو ایک نئی اور بہتر زندگی دینے کے لئے فیصلہ کر چکا ہوں کہ آپ کی صاحبزادی شہناز سے شادی کروں گا اور ہمیشہ اس کا تابعدار بن کر رہوں گا۔''

سلامت علی نے کہا۔''میں نے جتنی شرائط پیش کی ہیں' ان میں سے ایک اہم شرط یہ ہے کہ تم میری بیٹی کی مرضی کے خلاف کسی بھی عورت سے دلچسپی نہیں لوگے۔ نہ ہی کبھی دوسری شادی کرنے کی حماقت کرو گے۔''

سلطان احمد نے کہا۔''اور میں نے یہ تمام شرائط قبول کی ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں' بلوری رہائی حاصل کرے گی' جیل سے باہر آئے گی تو میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ لیکن شادی ہونے تک ایک سرپرست بن کر اس کی کفالت کرتا رہوں گا۔''

''اچھا ہوا تم نے اپنے اور بلوری کے بارے میں سچ سچ بتا دیا۔ اس طرح تم میرے لئے کچھ اور زیادہ قابل اعتماد بن گئے ہو۔ اس حد تک سچ بول چکے ہو تو آگے بھی بولو صاف صاف بتاؤ' تین ماہ کے بعد کونسا ٹھوس اور نا قابل انکار ثبوت حاصل کرنے والے ہو؟''

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ سلامت علی نے کہا۔''تم چوہدری کو چھوڑ چکے ہو۔ یہ خیال دل سے نکال دو کہ وہ تمہیں اور بلوری کو کوئی نقصان پہنچا سکے گا۔ میں اس کم بخت کی گردن دبوچنے کے لئے تم دونوں کے کام آتا رہوں گا۔ تمہیں ہر طرح کا تحفظ فراہم کروں گا۔ آج سے تم میرے قانونی معاملات سنبھال رہے ہو اور بلوری کو میری حفاظت میں دے رہے ہو۔''

وہ ہر طرح کے تحفظ کی ضمانت دے رہا تھا۔ تب سلطان احمد نے بتایا کہ چوہدری دلاور حیات کس طرح بلوری کو جیل کی چار دیواری میں پہنچا کر اس کے ساتھ شرمناک کھیل کھیلتا رہا ہے' جس کے نتیجے میں اس کے پاؤں بھاری ہو گئے ہیں۔

سلامت علی بڑی بے چینی سے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ بلوری پچھلے کئی مہینوں سے جیل میں ہے اور حاملہ ہو گئی ہے؟''

”جی ہاں۔ یہی تو وہ ٹھوس ثبوت ہے۔ بلوری جیلر اور چوہدری کے خلاف عدالت میں بیان دے گی تو وہ دونوں قانون کی گرفت میں آجائیں گے۔“

”تم بہت زبردست انکشاف کررہے ہو۔ چوہدری کی بہت بڑی کمزوری میرے ہاتھوں میں دے رہے ہو۔ یہ بتاؤ' کیا جیلر کو اس کے حاملہ ہونے کی بات معلوم ہوچکی ہے؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا ”نہیں۔ میں نے بلوری کو سمجھایا ہے۔ اب یہ بات وہ کسی کو نہ بتائے۔“

سلامت علی نے صوفے کے ہتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ”شاباش... یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ جیلر کو اور چوہدری کو معلوم ہوگا تو وہ بچے کو اس کے پیٹ سے غائب کردیں گے۔ ہم اس کے خلاف انکوائری کرائیں گے تو وہ اپنے وسیع اختیارات استعمال کرے گا اور انکوائری رکوادے گا۔“

”میں ان تمام مجرمانہ ہتھکنڈوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ بلوری میرے مشورے پر عمل کرے گی۔ بچے کو پیٹ میں چھپا کر رکھے گی۔ جب تین ماہ بعد انکشاف ہوگا تو جیلر اور سرکاری ڈاکٹر حمل گرانے کی حماقت نہیں کریں گے۔ اگر کریں گے تو میں بلوری اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت ضدی ہے۔ اپنی جان پر کھیل جائے گی۔ ان کے لئے پھانسی کا پھندا بن جائے گی۔“

سلامت علی خوشی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ سلطان احمد بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ وہ بڑی گرمجوشی سے سلطان کے دونوں شانوں کو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا ”تم اپنی ذہانت سے یہ ثابت کررہے ہو کہ بہت کام کے آدمی ہو۔ میرے وکیل اور قانونی مشیر بھی بن سکتے ہو اور داماد بھی۔ اب تو میری یہی کوشش ہوگی کہ شہناز تم سے ملے اور تمہیں اپنے مزاج اور معیار کے مطابق پائے۔ پھر شادی کے لئے راضی ہوجائے۔“

وہ دونوں ہاتھوں سے سلطان کا ہاتھ تھام کر مصافحہ کررہا تھا اور کہہ رہا تھا ”آج سے میں تمہاری بلوری کا سرپرست ہوں۔ اب تم وہی کروگے' جو میں کہوں گا۔ آرام سے بیٹھو اور میری باتیں سنو۔“

وہ دونوں اپنی اپنی جگہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ سلامت علی نے کہا ”ہماری کامیابی کا

سارا دارومدار بلوری پر ہے۔ وہ تین ماہ تک ہوشیاری دکھاتی رہے گی' بچے کو چھپاتی رہے گی تو میں چوہدری دلاور حیات کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔“

”آپ اطمینان رکھیں۔ وہ رہائی پانے کے لئے' چوہدری سے انتقام لینے کے لئے میرے مشوروں پر عمل کرتی رہے گی۔“

”اب تم میرے مشوروں پر عمل کرو۔ کل ہی لندن چلے جاؤ۔ جس طرح میرا اعتماد حاصل کیا ہے' اسی طرح میری بیٹی کا اعتماد حاصل کرو۔ ہمارے درمیان مضبوط رشتہ قائم ہوجانا چاہئے۔“

سلطان نے اپنا پاسپورٹ اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا ”میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا۔ میری روانگی کے انتظامات کردیں۔“

اگرچہ وہ اپنی بڑی بہن کی جوانی سے لے کر اب تک بے غیرت بن کر حالات سے سمجھوتہ کرتا آیا تھا۔ لیکن حقیقتاً بے غیرت نہیں تھا۔ عقل اسے سمجھاتی رہی تھی کہ عارضی طور پر شرم وحیا کو' اپنی انا اور خودداری کو بالائے طاق رکھ کر پہلے خود کو مضبوطی سے تعمیر کرنا چاہئے۔ آج وہ بڑی ذہانت سے تعمیری مرحلے طے کرتا جارہا تھا۔

☆☆☆

سلطان احمد امیگریشن کاؤنٹر سے گزرنے کے بعد اپنا سامان اٹھائے وزیٹرز لابی میں آیا۔ اس کی جیب میں شہناز کی تصویر تھی۔ دور لوگوں کے ہجوم میں وہ دکھائی دی۔ اس نے بھی سلطان کی تصویریں دیکھی تھیں۔ اسے دور سے دیکھتے ہی ایک ہاتھ شناسائی کے انداز میں لہرانے لگی۔

وہ بلیو جینز اور شوخ رنگ کی شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کے ساتھ ایک عیسائی نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ قریب آنے پر وہ مصافحہ کرتے ہوئے بولی ”مجھے تو پہچان ہی گئے ہو۔ میرے بوائے فرینڈ مارٹن سے بھی جان پہچان ہونی چاہئے۔ میں اسے دل وجان سے چاہتی ہوں۔ یہ میرا دوسرا آئیڈیل فرینڈ ہے۔ پہلے جسے آئیڈیل بنایا تھا' وہ ہینڈسم اور اسمارٹ ضرور تھا۔ لیکن میں نے دو ماہ میں ہی اس کی چھٹی کردی۔ وہ میرے مزاج کے مطابق نہیں تھا۔“

وہ مارٹن کا بازو تھام کر بولی۔ ''آئی لو ہم وِدھ مائی ہارٹ...وِدھ مائی سول....''

مارٹن نے کہا۔ ''آئی لو ہر ٹو'' پھر اس نے سلطان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پلیز ٹو میٹ یو! شہناز نے بتایا ہے' تم اس کے ہونے والے شوہر ہو۔''

یہ ملاقات اور ایک دوسرے سے متعارف ہونے کا انداز سراسر غیر اخلاقی تھا۔ اس کی ہونے والی بیوی کہہ رہی تھی کہ پہلے بوائے فرینڈ کے ساتھ دو ماہ تک رہ چکی ہے۔ اب اس دوسرے فرینڈ کے ساتھ پتہ نہیں کتنے مہینوں سے دوستی نبھا رہی ہے؟ بے غیرتی پھر ایک بار سلطان احمد کو چیلنج کر رہی تھی اور وہ کمال صبر وضبط سے مسکرا رہا تھا۔

وہ تینوں وہاں سے چلتے ہوئے عمارت سے باہر آ گئے۔ شہناز نے کہا۔ ''میں نے مارٹن سے ساری باتیں کلیئر کر دی ہیں۔ اسے بتا دیا ہے کہ تم یہاں ایک ہفتے تک میرے ساتھ رہو گے۔ ہمارے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ہو گی تو اس سے بھی زیادہ دنوں تک رہ سکو گے۔ جب تک رہو گے' یہ مارٹن کباب میں ہڈی نہیں بنے گا۔ جب بھی میرا موڈ ہو گا' میں اس کے پاس چلی جایا کروں گی۔''

پاکستان میں دھندہ کرنے والیاں ایسا کہتی ہیں۔ یورپ میں تعلیم یافتہ اور مہذب گھرانے کی لڑکیاں بھی یہی کہتی ہیں۔ کیونکہ اپنی مرضی سے' اپنی محبت سے کسی مرد کے پاس جانا دھندہ نہیں ہے۔ بلکہ لائف کو انجوائے کرنے والی فراخ دلی ہے۔

اس نے مارٹن کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ اسے سلطان کے ساتھ تنہا چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس نے جانے سے پہلے شہناز کو بازوؤں میں لے کر ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ سلطان نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ وہاں کی تہذیب انہیں اجازت دے رہی تھی۔ یہ بے حیائی نہیں تھی۔ ایک مشرقی شوہر کے لئے چیلنج تھا۔ ''بیٹے...! برداشت کرو... اور برداشت کرنا ہو گا۔ جو بے غیرتی پاکستان میں چھپ کر بڑی سازشوں کے تحت ہوتی ہے' وہ یہاں کھلے عام بڑی فراخ دلی سے ہوتی رہتی ہے۔ برداشت کرو یا واپسی کا ٹکٹ کٹا لو۔''

مارٹن اس کی ہونے والی بیوی سے اپنا حصہ لے کر چلا گیا۔ وہ دونوں کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ شہناز نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں چاہتی ہوں' تم یہاں رہ کر میرے لائف اسٹائل کو اچھی طرح سمجھ لو۔''

''سمجھ رہا ہوں۔ چاول کا ایک دانہ بتا دیتا ہے کہ پوری ہانڈی پکی ہوئی ہے۔''

وہ کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے لہجے میں زندہ دلی نہیں ہے۔''

''مشرق سے ایک نیم مردہ آیا ہے۔ آہستہ آہستہ اس میں زندگی پھر زندہ دلی پیدا ہو جائے گی۔''

''میرے کسی رویے پر اعتراض ہو تو کھل کر کہہ سکتے ہو۔''

''میرے اندر ایک بہت بڑی خوبی ہے' میں اعتراض کرنے والے تمام الفاظ بھول چکا ہوں۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''اس سے اچھی بات تو کوئی ہو نہیں سکتی۔ مجھ جیسی آزاد اور خود مختار رہنے والی لڑکیاں ایسا ہی لائف پارٹنر چاہتی ہیں۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں' تم دیکھو اور اندھے بن جاؤ۔ سنو اور بہرے ہو جاؤ۔ بولنا چاہو مگر اعتراضات کرنے والے تمام الفاظ بھول جاؤ۔ میں پہلی ہی ملاقات میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔''

وہ چپ رہا کھڑکی کے باہر اور ونڈ اسکرین کے باہر لندن شہر کو دیکھتا رہا۔ اس نے پوچھا۔ ''پہلی بار لندن آئے ہو؟''

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لندن کے متعلق اتنا سنا ہے' اتنا پڑھا ہے کہ یہ انجانا شہر نہیں لگ رہا ہے۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر شہناز نے پوچھا۔ ''شادی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا یہ ضروری ہے؟''

وہ ونڈ اسکرین کے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے لئے نہیں ہے۔ لیکن میرے لئے ضروری ہے۔ اسی لئے اتنی دور آیا ہوں۔ تمہیں ضرورت ہوتی تو تم آتیں۔ پرانی کہاوت ہے' پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے۔''

''ہمارا سیاسی گھرانہ بہت مشہور و معروف نہ ہوتا تو میں کبھی شادی نہ کرتی۔ پاکستانی پریس اور اپوزیشن والے ہماری ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ شادی نہ کریں تو جھوٹے سچے اسکینڈلز کے ذریعے عوام کو بدظن کرتے ہیں اور ہماری سیاسی شہرت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔''

"میں سمجھ رہا ہوں۔ شادی کے بعد شوہر اور ازدواجی زندگی کا لیبل لگ جاتا ہے۔ پھر کوئی کیچڑ اچھالنے کی جرات نہیں کرتا۔ اگر تم مجھے منتخب کرو گی' شوہر کی حیثیت دو گی تو آئندہ تمام عمر ایک لیبل بن کر رہوں گا۔"

"تم سمجھانے سے پہلے سمجھ لیتے ہو۔ روکنے سے پہلے رک جاتے ہو اور ٹوکنے سے پہلے چپ ہو جاتے ہو۔ پاپا نے واقعی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ میرے مزاج کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد ہی تمہیں یہاں بھیجا ہے۔"

اس نے ایک چھوٹے سے بنگلے کے سامنے گاڑی روک دی۔ پھر اترتے ہوئے کہا۔ "اندر آؤ۔ یہ بنگلا پاپا نے میرے نام سے خریدا ہے۔"

وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی اندر آتے ہوئے بولی۔ "یہاں میرے پرسنل اکاؤنٹ میں ایک لاکھ پاؤنڈ فکس ڈیپازٹ کے طور پر رہتے ہیں۔ باقی رقم آتی جاتی اور خرچ ہوتی رہتی ہے۔ سوئیس بینک میں جو اکاؤنٹ ہے' وہاں لاکھوں ڈالرز کے علاوہ دس کلو سونا رکھا رہتا ہے۔ اگلے الیکشن کے بعد پاپا کی پارٹی پھر حکومت بنائے گی۔ پھر میرے اکاؤنٹ میں قومی خزانے سے بہت کچھ آئے گا۔"

اس کا ایک ملازم سلطان احمد کا سامان اٹھا کر ایک بیڈ روم میں لے جا رہا تھا۔ وہ بولی۔ "شاور لے کر فریش ہو جاؤ۔ جتنی دیر آرام کرنا چاہو کرو۔ میری راتیں نائٹ کلبوں میں گزرتی ہیں۔ تم جب تک رہو گے' تمہاری راتیں بھی اسی طرح گزریں گی۔ گھڑی دیکھ لو۔ ٹھیک شام چھ بجے ہم یہاں سے نکلیں گے۔ لندن کی سیر کریں گے اور پتہ نہیں لیٹ نائٹ کب تک انجوائے کرتے رہیں گے؟ فیوچر کے متعلق تم سے بہت ساری باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔"

وہ اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ سلطان احمد کے لئے دوسرا کمرہ تھا۔ وہ وہاں آکر ایک ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔ ایسی تھکن کا احساس ہو رہا تھا' جیسے اسلام آباد سے پیدل چلتا ہوا لندن آیا ہو۔ حالات سے بچپن سے تھکاتے آ رہے تھے۔ شہناز کے رویے نے کچھ اور تھکا دیا تھا۔

اس نے اب تک اسے کم تر نہیں کہا تھا۔ لیکن اپنے رکھ رکھاؤ سے اور رویے سے

برتری ظاہر کرتی آ رہی تھی۔ یہ بھی جتا دیا تھا کہ لندن اور سوئیس کے بینکوں میں اس کی کتنی دولت ہے اور باپ کس طرح اس میں اضافہ کرتا رہتا ہے؟

وہ اکلوتی بیٹی تھی۔ اس لئے ماں باپ نے اسے کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ دو چار برسوں میں کبھی کبھی پاکستان جاتی تھی۔ ورنہ لندن میں رہ کر پاکستانی تہذیب کے خلاف زندگی گزارتی تھی۔ اس نے پہلی ہی ملاقات میں سلطان احمد کے سامنے اپنے یار کو سرعام بوسہ دیا تھا۔ گویا ایک پاکستانی کی قوت برداشت کو آزمایا گیا تھا۔

اور اس نے چپ چاپ برداشت کر لیا تھا۔ وہ اس کی کونسی سگی تھی۔ اپنے وطن میں تو سگوں کو اور بہنوں بیٹیوں کو بازاری بنا دیا جاتا ہے۔ اگر وہ لندن کے بازاروں میں بوسے لٹا رہی تھی تو یہ کونسی انوکھی اور شرمناک بات تھی؟

دوسروں کی تہذیب پر کیچڑ اچھالنے سے پہلے وہ اپنے گریبان میں جھانک کر تین بہنوں کو اور بلوری کو دیکھ لیتا تھا۔ پھر بڑی سے بڑی بے حیائی کو برداشت کر لیتا تھا۔ شہناز تو کچھ بھی نہیں تھی' صبر کی جھولی میں برداشت کا ایک معمولی سا تنکا تھی۔

شام چھ بجے سے پہلے ڈائننگ روم میں ان کی ملاقات ہوئی۔ میز پر سینڈوچز اور کافی سے بھری ہوئی کیتلی رکھی تھی۔ اس نے کہا۔ "آج نہ میں نے لنچ کیا اور نہ تمہیں پوچھا۔ مجھے بھولنے کی بری عادت ہے۔ جب تک یہاں رہو اسے اپنا گھر سمجھو۔ کسی بھی چھوٹی بڑی ضرورت کے لئے ملازم کو حکم دو۔ وہ تمہاری ضرورت کی ہر چیز فوراً حاضر کرے گا۔"

سلطان احمد نے شکریہ کہا۔ وہ بولی۔ "کچھ اور کھانا پسند کرو گے؟"

"نہیں۔ میں نے جہاز میں لنچ کیا تھا۔"

"ڈنر کس وقت کرتے ہو؟"

"رات کے آٹھ یا نو بجے۔"

"یہاں پاکستانی وقت سے چار گھنٹے کا فرق ہے۔ تمہیں رات کو جلدی بھوک لگے گی۔"

"کوئی بات نہیں ہے۔ وہاں سے یہاں آنے تک صرف وقت نہیں بدلتا' عادت بھی بدل جاتی ہے۔ میں وقت اور حالات کے مطابق بدلنا جانتا ہوں۔"

”آج ہماری پہلی ملاقات ہے۔ مگر میں تمہیں کسی حد تک سمجھنے لگی ہوں۔ تم مجھے سمجھنا چاہو تو اپنے طور پر سوالات کر سکتے ہو۔“

”دنیا کی ہر لڑکی کا ایک آئیڈیل ہوتا ہے۔ وہ مل جائے تو لڑکی اس کی محبت سے سرشار ہو کر اس کے بچے پیدا کرتی ہے۔ انہیں دودھ پلاتی ہے۔ ایک آئیڈیل بیوی تو ہوتی ہی ہے۔ ایک مثالی ماں بھی بن جاتی ہے۔ تم نے سوال کرنے کی اجازت دی ہے تو پوچھ رہا ہوں' تمہارے دل میں ایسے جذبات کیوں نہیں ہیں؟ تم بے شمار لڑکیوں سے مختلف کیوں ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”لڑکیاں کسی کو اپنا آئیڈیل بنا کر صرف اسی پر بھروسہ کر کے ساری عمر بے وقوف بنتی رہتی ہیں۔ میری ممی نے پاپا سے لو میرج کی تھی۔ اب کوئی لو افیئر نہیں ہے۔ ایک دوسرے سے محض انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ پاپا گھر سے باہر اور ملک سے باہر جہاں جاتے ہیں' شراب اور شباب سے دل بہلاتے ہیں۔ ممی اولاد پیدا کرنے والی مشین بن کر رہ گئیں۔ میرے چھ بہن بھائی پیدا ہوئے۔ کچھ پیدا ہوتے ہی مر گئے۔ کچھ دنیا میں آنے کے بعد چل بسے۔ بس ایک میں رہ گئی ہوں۔ تمہارے سوال کے جواب میں' میں سوال کرتی ہوں' عورت کسی ایک آئیڈیل کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ مرد اس کا ہو کر کیوں نہیں رہتا؟ کیوں اس کے اعتماد کو دھوکہ دیتا ہے اور باہر جا کر منہ کالا کرتا ہے؟“

سلطان احمد نے کہا۔ ”سب ہی مرد ایسے نہیں ہوتے۔“

وہ میز پر ہاتھ مار کر بولی۔ ”ہوتے ہیں' میں نے اپنے چچا کو' تایا کو' ماموں کو' پھوپھا کو اور شادی شدہ کزنز کو دیکھا ہے۔ سب ہی گھر میں بیویاں رکھتے ہیں اور باہر داشتاؤں سے دل بہلاتے ہیں۔ کچھ عورتیں صبر و تحمل سے ایسے شوہروں کے ساتھ گزارہ کر لیتی ہیں اور کچھ باغی ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ بھی اپنے شوہروں کے اعتماد کو دھوکہ دیتی ہیں۔ صرف دولت مند طبقے میں ہی نہیں' ہر طبقے میں شوہر حضرات کبھی اپنی ایک بیوی کے ہو کر نہیں رہتے۔“

وہ کافی کا ایک گھونٹ پینے کے بعد بولی۔ ”میں بچپن سے ایسے تماشے دیکھتی آ رہی ہوں۔ میرے ذہن میں یہ بات پکتی رہی ہے کہ میں کبھی کسی مرد پر بھروسہ نہیں کروں گی۔ کیوں کسی ایک شادی کروں اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہوں کہ وہ بھی صرف میرا ہو کر رہے گا؟“

سلطان احمد نے کہا۔ ”میں نے کہا نا' سب ہی مرد ایسے نہیں ہوتے۔“

وہ بولی۔ ”جو ایسے نہیں ہوتے' ان کے ساتھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ یا تو وہ مالی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں۔ کسی دوسری کے اخراجات برداشت نہیں کر پاتے یا جسمانی طور پر کمزور ہوتے ہیں یا فطرتاً جورو کے غلام بن جاتے ہیں۔ ایسے مرد ضرور ہوتے ہوں گے جو فطرتاً عاشق مزاج اور عیاش نہیں ہوتے ہیں۔ ایک ہی بیوی کے ساتھ ساری زندگی گزار لیتے ہیں۔ مگر وہ ہماری دنیا میں کہاں ہوتے ہیں' یہ میں نہیں جانتی۔“

وہ بولا۔ ”میں تمہارے سامنے ہوں۔“

اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر ایکدم سے قہقہہ لگانے لگی۔ کہنے لگی۔ ”اب تم یہ کہنا چاہو گے کہ میرے وفادار شوہر بن کر رہا کرو گے... وہ تو رہو گے' اس لئے کہ زرخرید ہو۔ اپنی ضرورت سے مجبور ہو کر میری اور پاپا کی تمام شرائط مان کر یہاں آئے ہو۔“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”میں نے تمہاری محبت کا اور وفاداری کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ میں تو اپنی بلوری سے محبت کا دعویٰ کر رہا ہوں۔“

قہقہہ لگانے کے باعث اس کے چہرے پر جو رونق تھی۔ وہ بجھ گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ بلوری کون ہے؟“

”میرا دل ہے' میری جان ہے' میرے اندر آتی جاتی سانس کا نام بلوری ہے۔ جب وہ گیارہ برس کی تھی' تب میں نے اس کی ایک جھانجھر چرائی تھی اور آج تک اسے اپنی دھڑکنوں سے لگائے رکھتا ہوں۔“

اس نے جیب سے چاندی کی پائل نکال کر میز پر رکھ دی۔ پھر کہا۔ ”یہ میری بلوری ہے۔ تم نے اپنے گھرانے میں دور تک صرف سیاستدانوں کو دیکھا ہے جو وقت اور حالات کے مطابق اپنی نیت' اپنے ارادے' اپنا ایمان اور سیاسی پارٹیاں بدلتے رہتے ہیں۔ وہ عورتیں بدلنے میں بھی دیر نہیں کرتے۔ میری دنیا میں بھی نفرتیں ہیں' بے اعتمادیاں ہیں۔ مگر محبتیں بھی ہیں اور بھرپور اعتماد بھی ہے۔“

وہ پائل کو اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ ہے بھرپور اعتماد اور محبت جو پاکستان سے یہاں تک آئی ہے۔ ہر لمحے میرے ساتھ رہے گی اور میرے ساتھ ہی قبر تک

جائے گی۔"

شہناز نے تعجب سے پوچھا۔"کیا صرف پائل ہے..؟ اسے پہننے والی کہاں ہے؟"

"جیل کی چاردیواری میں آہنی سلاخوں کے پیچھے ہے۔"

"یہ کیسی محبت ہے؟ اسے دل و جان سے چاہنے کا وعدہ کرتے ہو اور آہنی سلاخوں کے پیچھے چھوڑ کر یہاں آئے ہو؟"

"اس کی رہائی کے لئے یہاں تک آیا ہوں۔ تم سے اور تمہارے پاپا سے جو سودے بازی ہوئی ہے' اس کے نتیجے میں شاید تین یا چار ماہ بعد اسے رہائی مل جائے گی۔"

"میں سمجھی نہیں۔ مجھے سمجھاؤ یہ قصہ کیا ہے؟"

وہ پوری تفصیل سے بلوری کا قصہ سنانے لگا۔ وہ کبھی دلچسپی سے سننے لگی اور کبھی ناگواری سے منہ بنانے لگی۔ قصہ شروع ہوتے ہی اس نے کہا۔"یہ مانا کہ رانو کم سن بچی تھی۔ بچے تو کھیتوں میں جاسکتے ہیں۔ مگر وہاں کے مرد' عورتیں اور بوڑھے سب ہی کھیتوں میں جاتے ہیں۔ پاکستان ابھی تک اتنا بیک ورڈ ہے کہ گاؤں لوگ اپنے گھروں میں ایک چھوٹا سا ٹوائلٹ بھی نہیں بنواسکتے۔"

اس نے کچھ آگے سننے کے بعد کہا۔"کم سن بچیوں کے ساتھ یہاں بھی زیادتی ہوتی ہے۔ جبکہ یہاں عورتیں ہر گلی کوچے میں آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ مرد بڑا ہی درندہ ہوتا ہے۔ آسانی سے ہوس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ درندگی کے مجرمانہ طریقوں سے تسکین حاصل کرتا ہے۔"

"ایشیا ہو' یورپ ہو یا امریکہ... بدترین شرمناک جرائم دنیا کے ہر ملک میں ہر علاقے میں ہوتے رہتے ہیں۔ ذرا غور کیا جائے تو ساری دنیا انسان نما جانوروں کا جنگل دکھائی دے گی اور جنگل کے جانور انسان صفت' معصوم اور بے زبان نظر آئیں گے۔ بے چارے ایک دوسرے کو گالیاں بھی نہیں دیتے ہیں۔

چوہدری دلاور حیات نے تہذیب کو گالیاں دیں۔ اس کے آدمی آدھی رات کو بلوری کے گھر میں گھس آئے۔ اس کی شرمناک تصویریں اتارنے لگے۔ اگرچہ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ ان حالات میں بھی وہ پارسا تھی۔

لیکن اس رات جو واردات ہوئی' اس کے نتیجے میں بشیر کریانہ والے کا خاندان تباہ و برباد ہوگیا۔ ماں نے خود کو جلا کر مار ڈالا۔ باپ صدمے سے مرگیا اور بلوری گناہ نہ کرنے کے باوجود گناہ گار کہلا کر حدود آرڈیننس کے تحت جیل کی چاردیواری میں پہنچادی گئی۔"

شہناز نے ناگواری سے منہ بنا کر کہا۔"کیا گناہ گاروں کو سنگسار کرنے سے اسلامی ملکوں میں گناہ کا عمل ختم ہوگیا ہے یا کم ہوگیا ہے...؟ یہ تو پہلے سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ مسلمانوں کے شاہی گھرانوں میں اور مسلمان تاجروں کی حرم سراؤں میں دنیا کے ہر حصے سے سینکڑوں ہزاروں حسینائیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ کیا کبھی ان میں سے کسی کو سنگسار کیا جاتا ہے؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔"پاکستان میں بھی شراب و شباب میں مست رہنے والے سیاستدانوں اور سرمایہ داروں کو کبھی کسی نے سنگسار ہوتے نہیں دیکھا۔ یہ ایک الگ سی بحث ہے' تم آئینہ نہ دکھاؤ۔ کوئی اپنا مکروہ چہرہ دیکھنا نہیں چاہتا۔"

شہناز نے کہا۔"ویسے ہمارے ماحول کی لڑکیاں اپنا حسن و شباب دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہیں۔ بار بار آئینہ دیکھتی ہیں۔ آئینے سے بھی جی نہ بھرے تو اپنی تصویریں اترواتی ہیں۔ تصویروں میں لباس زیادہ ہو تو کم کردیتی ہیں۔ کم کرنے کے بعد بھی زیادہ لگے تو اور کم کردیتی ہیں۔"

وہ ایسا کہتے وقت بڑے سرور میں تھی۔ بڑی مسرتیں حاصل کررہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔"میں تو آئینے کے سامنے یہی کرتی ہوں۔ کتنی ہی بڑی بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنیوں کی طرف سے ماڈلنگ کی آفر آئی میں نے مجبوراً انکار کردیا۔ میری تصویریں کثیرالاشاعت میگزین میں شائع ہوتیں تو پاکستان میں پاپا کا سیاسی کیریئر خاک میں مل جاتا۔ وہ مجھ پر اپنی ساری کمائی لٹاتے ہیں۔ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اسی لئے میں بھی ان کی خاطر اپنے شوق کو ماردیتی ہوں۔"

وہ سلطان احمد کو بڑی شوخی سے دیکھتے ہوئے بولی۔"سچ بتاؤ' میں کیسی لگتی ہوں؟ اگر ماڈلنگ کرتی تو کیا ساری دنیا میں تہلکہ مچادیتی...؟"

وہ بہت زیادہ حسین نہیں تھی۔ مگر اچھی تھی۔ قبول صورت تھی۔ شباب ایسا بھرپور تھا

کہ چیخ چیخ کر اپنی طرف بلاتا تھا۔ مزید یہ کہ اس پر پاکستان کے قومی خزانے کا ٹرکا لگا ہوا تھا۔ دولت مندی نے اسے اس کی حیثیت سے بہت زیادہ نکھار دیا تھا۔ دیکھنے والی نگاہوں کے پیمانے میں لبالب ہو کر چھلک پڑتی تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ اس کے سامنے کیٹ واک کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ”اس طرح گم صم ہو کر کیا دیکھ رہے ہو؟ میرے سوال کا جواب دو۔“

اس نے کہا۔ ”کیا جواب دوں؟ تم تو چلتی پھرتی قیامت ہو۔ جن کلبوں میں جاتی ہو وہاں بجلیاں ضرور گرتی ہوں گی۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”کیا بلوری مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے؟“

سلطان احمد نے اپنے اندر ایک گہری سانس کھینچی پھر کہا۔ ”وہ پنجاب کی مٹیار ہے۔ جیسی پیدا ہوئی تھی، ویسے ہی بوڑھی ہونے تک خالص دودھ اور خالص گھی کی طرح رہے گی۔ وہ کبھی کسی بیوٹی پارلر میں نہیں گئی۔ بدترین حالات اسے گوبر اور مٹی کی کھاد بناتے ہیں اور وہ اسی مٹی سے ابھر کر گلاب کی طرح کھلتی رہتی ہے۔“

وہ گھور کر بولی۔ ”تم یہ کہنا چاہتے ہو میں اس سے زیادہ خوبصورت نہیں ہوں؟“

”تم دیکھنے میں بہت خوبصورت ہو۔ تمہیں چھونے اور برتنے والے دیوانے ہو جاتے ہوں گے۔ بعد میں دوسری طرف نکل پڑتے ہوں گے۔ کیونکہ تم کسی کی محبت نہیں ہو۔ محبت ایسی نادیدہ زنجیر ہے، جو ہر طرف سے جکڑ لیتی ہے۔ آنے والے کو بار بار آنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ کسی دوسری طرف جانے کا راستہ بھول جاتا ہے۔“

شہناز نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ”پھر تم راستہ بھول کر میری طرف کیسے چلے آئے؟“

”اسی محبت کو دلدل سے نکالنے کے لئے آیا ہوں۔“

وہ غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے بولی۔ ”میری ایک شرط یہ بھی ہے کہ تم کبھی کسی دوسری کو اپنا وقت، اپنی توجہ نہیں دو گے۔ شادی کے بعد کسی کو میری سوکن نہیں بناؤ گے۔“

”میں نے تمہارے پاپا سے صاف صاف کہہ دیا ہے، شادی کے بعد صرف تمہارا تابعدار بن کر رہوں گا۔ لیکن بلوری رہا ہونے کے بعد جب تک شادی نہیں کرے گی، اس کا

گھر آباد نہیں ہوگا۔ تب تک میں اس پر توجہ دوں گا۔ اس کی کفالت کروں گا اور ایسا کرتے رہنے کے دوران اس سے دور دور رہوں گا تاکہ تمہاری شرائط پر پورا اترتا رہوں اور تمہیں کسی طرح کی شکایت نہ ہو۔“

وہ غصے سے بھڑکنے والی تھی۔ یہ باتیں سن کر ٹھنڈی پڑ گئی۔ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”وہ رہا ہو جائے گی تو تم اس کے قریب نہیں جاؤ گے؟“

”قریب تو جانا ہوگا، اس سے ملنا ہوگا۔ اس کا دشمن بہت ہی کمینہ ہے۔ اسے سکون سے رہنے نہیں دے گا۔ اس کی حفاظت کے لئے مجھے بہت کچھ کرنا ہوگا۔ تم یقین کرو یا نہ کرو... جب میں نے کہہ دیا ہے، اس سے کوئی جسمانی تعلق قائم نہیں کروں گا تو پھر اس کے قریب رہنے کے باوجود اسے ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”جب تم اسے ہاتھ نہیں لگاؤ گے، اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا تو پھر اس کے لئے دشمنوں سے کیوں لڑتے رہو گے؟ کیوں اس کے لئے میرے تابعدار بن کر رہو گے؟ یہ ساری دنیا لین دین کے اصولوں پر قائم ہے۔ کچھ لینے کے لئے کچھ دیا جاتا ہے۔ تم بہت کچھ دے رہے ہو۔ کیا اس سے کچھ نہیں لو گے؟“

”لین دین کا اصول پوری دنیا میں ہے۔ صرف محبت میں نہیں ہے۔ محبت دینا جانتی ہے۔ لینے کی ہوس نہیں رکھتی۔“

اس نے پائل کو میز پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”بدلے میں کچھ نہ لو، تب بھی وہ معجزے کی طور پر ملنے لگتی ہے۔ تقریباً آٹھ برس گزر چکے ہیں۔ یہ مجھے مل رہی ہے۔ میں نے کبھی بلوری کو ہاتھ نہیں لگایا۔ لیکن یہ میرے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگی رہتی ہے۔“

شہناز گم صم سی ہو کر اس پائل کو اور اس دیوانے کو تک رہی تھی۔ کیا محبت ایسی ہوتی ہے...؟

نگاہوں کے سامنے چاندی کی پائل تھی۔ اسے پہننے والی نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ سلطان احمد کی آنکھوں میں چمک رہی تھی۔ چہرے کے تاثرات سے ابھر رہی تھی اور اس کے پورے وجود میں سمائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”ہماری دنیا میں ابھی محبت ہے۔ تم نے ضد میں آ کر مردوں کے خلاف محاذ بنا کر ایک سچے چاہنے والے کا انتظار نہیں کیا۔ مرد کئی عورتوں سے فلرٹ کرتے ہیں۔ تم بھی انتقاماً یہی کرنے لگی ہو۔“

وہ میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ”پتہ نہیں تم اس ایک بلوری سے محبت کرنے والے‘ اسے دیوانگی سے چاہنے والے کہاں سے پیدا ہو گئے ہو؟ تمہارے جیسا دیوانہ نہ کوئی ہوگا‘ نہ مجھے ملے گا۔ اگر ملے گا تو اسے آزمانے میں ایک عمر گزر جائے گی۔“

”تم پہلی بار مجھ سے ملی ہو۔ ہماری ملاقات کو ابھی چار گھنٹے ہوئے ہیں۔ ان چار گھنٹوں میں تمہیں یقین ہو گیا ہے کہ میں بلوری کا دیوانہ ہوں۔ سچا عاشق ہوں۔ اس کے سوا کسی دوسری لڑکی سے اس طرح دیوانہ وار محبت نہیں کروں گا۔“

”ہاں۔ تمہارا عمل‘ تمہاری دیوانگی اور اس کی خاطر مجھ سے سودے بازی یہ ثابت کر رہی ہے کہ تم واقعی ایک عورت کے ساتھ پوری دیانت داری سے زندگی گزارنے والے مرد ہو۔“

”جب تم چار گھنٹے کے اندر ایک سچے عاشق کو پا سکتی ہو تو تمہیں اپنے لئے بھی کوئی دوسرا سچا عاشق مل سکتا ہے۔ بشرطیکہ تمہاری تلاش میں لگن ہو‘ اعتماد ہو۔ کوئی انتقامی جذبہ نہ ہو۔“

اس نے پھر میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”بکواس کر رہے ہو۔ تمہارے جیسا کوئی دوسرا چاہنے والا مجھے کبھی نہیں ملے گا۔ لیلیٰ مجنوں‘ شیریں فرہاد اور ہیر رانجھا کی صرف کہانیاں ہی کہانیاں ہیں۔ حقیقتاً کچھ بھی نہیں ہے۔“

”تم سمجھنا چاہو تو مجھے دیکھو۔ میں ہی مجنوں ہوں‘ میں ہی فرہاد اور میں ہی رانجھا ہوں۔ روپ بدل کر آیا ہوں۔ محبت کی بارگاہ میں ابھی کتنے ہی سجدے تڑپ رہے ہیں۔ کبھی اس بارگاہ میں آ کر تو دیکھو۔“

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”اوہ گاڈ سات بج چکے ہیں۔ میرے پینے کا وقت ہو چکا ہے۔ تبھی تو کہوں‘ سر بھاری کیوں ہو رہا ہے؟ تمہاری باتیں پتھر کی طرح کیوں لگ رہی ہیں؟“

وہ وہاں سے جاتے ہوئے بولی۔ ”کم آن۔ میرے بیڈ روم میں آؤ۔ ہم وہاں

ڈرنک لیں گے۔“

وہ پریشان ہو کر اسے تکنے لگا۔ کچھ کہہ نہ سکا۔ کہنے سے پہلے وہ جا چکی تھی۔ عجیب سر پھری تھی‘ دولت نے اور ماں باپ کی دی ہوئی بے جا آزادی نے اسے خودسر بنا دیا تھا۔ وہ دوسروں سے متاثر ہونا نہیں جانتی تھی۔ اپنی ہی بات منوایا کرتی تھی۔

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر اس کے بیڈ روم میں آیا تو ایک سینٹر ٹیبل پر بلیک لیبل کی بوتل اور شیشے کے دو خوبصورت نازک سے جام رکھے ہوئے تھے۔ وہ بوتل کھول کر دو پیگ بنا رہی تھی۔ اس نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”پلیز۔ مجھے اس نعمت سے باز رکھو۔ میں نے آج تک کبھی اسے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔“

وہ بولی۔ ”آج ہاتھ بھی لگاؤ گے اور منہ بھی....“

”یہ۔ یہ ہمارے لئے حرام ہیں۔“

”میں دین دھرم کی باتیں زیادہ نہیں جانتی۔ اس حد تک معلوم ہے کہ دینی احکامات کے مطابق کسی غیر عورت کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی مکان میں نہیں رہنا چاہئے۔ جبکہ تم میرے ساتھ یہاں نہ جانے کتنے دن گزارنے آئے ہو؟“

وہ درست کہہ رہی تھی۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس نے کہا۔ ”دین اسلام میں نمائشی شادی کی اجازت نہیں ہے۔ مگر تم مجھ پر ایک نمائشی شوہر کا لیبل لگانے آئے ہو۔ شادی کے بعد میری مرضی کے بغیر مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکو گے۔ نہ میں بیوی کے فرائض ادا کروں گی۔ نہ تم شوہر کے حقوق حاصل کر سکو گے۔ جب سارے کام دین کے خلاف کرتے ہو تو پھر پینے سے کیوں انکار کر رہے ہو؟“

اس نے ایک جام اٹھا کر اس کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم ایک تابعدار کی حیثیت سے یہاں امتحان میں پاس ہونے آئے ہو۔ فیل ہونا چاہتے ہو‘ ناکام ہو کر واپس جانا چاہتے ہو اور بلوری کو رہائی نہیں دلانا چاہتے تو بے شک اسے ہاتھ نہ لگاؤ۔ اپنا بوریا بستر باندھ لو۔“

وہ بڑی بے بسی سے شراب سے بھرے ہوئے جام کو دیکھنے لگا۔ تابعداری نے اس کی بہنوں کو حویلی میں پہنچایا تھا۔ اس سے بڑی بے حیائی اور بے غیرتی کیا ہو سکتی تھی؟ اب

تابعداری کا تقاضا تھا کہ جو چیز حرام ہے' اسے اپنے حلق سے اتار لے۔ حساب کرنے سے ساری زندگی حرام دکھائی دیتی۔ حرامی ٹھوکروں میں پلنے والے نے شراب کا جام اٹھالیا۔

شہناز نے کہا۔ ''پہلی بار پی رہے ہو۔ یہ تمہیں تلخ لگے گی۔''

وہ بولا۔ ''اس میں زندگی سے زیادہ تلخی نہیں ہوگی۔''

''پھر بھی پورا ایک گھونٹ نہ پینا۔ ہلکی ہلکی چسکی لیتے رہو۔ جب سرور آئے گا تو اور مانگو گے۔''

اس نے اپنے جام کو اس کے جام سے ٹکراتے ہوئے چیئرز کہا۔ پھر اسے منہ سے لگا کر پینے لگی۔ سلطان نے جھجکتے ہوئے جام کو ہونٹوں سے لگا کر ہلکی سی چسکی لی۔ اسے حلق سے اتارا تو یوں لگا' جیسے دہکتے ہوئے انگارے حلق سے اتر رہے ہوں اور سینے میں آگ بھر رہے ہوں۔ اسے ایک ٹھسکا سا لگا۔ اس نے جام کو میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ آگ کیسے حلق سے اترتی ہے؟ یہ آزمائش بہت ہی مشکل ہے۔''

وہ بولی۔ ''مشکل ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔ یہی آگ آہستہ آہستہ مہربان ہوتی جائے گی۔ یوں سمجھو' تم امتحان میں پاس ہو رہے ہو۔ میرا دل جیت رہے ہو۔ میں ابھی پاپا کو فون کروں گی اور اپنا فیصلہ سناؤں گی۔ نو ڈاؤٹ یو آر اے رائٹ پرسن فار می۔''

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اب تک رانگ تھا۔ رائٹ بننے کے لئے اس نے دوسری چسکی لی۔ پھر دوسرا گھونٹ لیا۔ محبت آگ سے کھیلنے کا نام ہے۔ وہ بلوری کی محبت میں انگارے نگلنے لگا۔ پتہ نہیں' یہ محبت اسے اور کتنے پل صراط سے گزارنے والی تھی؟

پہلے پیگ میں نشے کی رانی نقاب میں رہتی ہے۔ باہر سے ذرا ذرا سی جھلکتی ہے۔ اندر سے دھیمی دھیمی سلگتی ہے۔ پہلے پیگ میں نشہ نہیں ہوتا۔ مگر وہ اناڑی تھا۔ اس نے پڑھا تھا' سنا تھا اور پینے والوں کو دیکھا تھا۔ یہ بات ذہن میں نقش ہوگئی تھی کہ نشہ اٹھا کر پٹخ دیتا ہے۔

وہ حواس پر ایسے مسلط ہو گیا تھا کہ دو چار گھونٹ پیتے ہی سامنے والی دیوار ادھر سے ادھر چلتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ بے شک۔ زیادہ پی لیا جائے اور نشہ حاوی ہونے لگے تو درودیوار گھومنے لگتے ہیں۔ اس اناڑی نے کہا۔ ''میرا سر گھوم رہا ہے۔''

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ کہنے لگی۔ ''یو نان سنس! دو گھونٹ میں کبھی سر نہیں گھومتا۔ تم پر نشہ

نہیں' گھبراہٹ طاری ہو رہی ہے۔ یہ پیگ ختم کرو۔ دھیرے دھیرے سنبھل جاؤ گے۔''

اس نے سامنے رکھے ہوئے جام کو دیکھا۔ پھر اسے اٹھا کر دل ہی دل میں کہا۔ ''محبت میں دیوانے زہر بھی پی لیتے ہیں۔ میری بلوری...! میں تیری خاطر اسے زہر سمجھ کر پی رہا ہوں۔''

اس نے جام کو منہ سے لگایا۔ آنکھوں کو سختی سے بند کیا۔ پھر غٹا غٹ پیتا چلا گیا۔ آگ لہراتی ہوئی حلق سے سینے میں اترتی چلی گئی۔ اس نے جھک کر ایک جھٹکے سے جام کو میز پر رکھ دیا۔ شہناز تالی بجاتے ہوئے بولی۔ ''ویلڈن... ویلڈن... یہ تم نے مردانگی دکھائی ہے۔''

وہ دوسرا پیگ بنانے لگی۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ''نہیں... پلیز شہناز.....! میرے لئے ایک ہی کافی ہے۔''

''اسے کافی نہیں کہتے۔ ادھر دیکھو... اسے کہتے ہیں۔''

اس نے اپنے لئے ڈبل پیگ بنایا۔ وہسکی کا رنگ پگھلے ہوئے سونے جیسا تھا۔ چاندی جیسے شیشے کے جام میں لبالب بھر گیا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر دکھاتے ہوئے بولی۔ ''اب تو تمہیں شرم آنی چاہئے۔ ایک لڑکی تم سے زیادہ پی رہی ہے۔''

''تم عادی ہو گئی ہو۔ اس آگ سے کھیلنا جانتی ہو۔''

''تم بھی آگ سے کھیلنا سیکھو۔ آفٹر آل... تمہیں میرے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔''

زندگی بہت کچھ سکھاتی ہے۔ دھوپ سے بچنے والوں کو چھاؤں میں آنے نہیں دیتی۔ اٹھا کر آگ میں پھینک دیتی ہے۔ یوں جلنے والے آگ کو گلزار بنانا سیکھ لیتے ہیں۔ نہ سیکھنا چاہو' تب بھی وہ سیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

شہناز وہاں سے اٹھ کر فریج سے ایک ٹھنڈی بوتل لے آئی۔ اس کی شراب میں پانی ملاتے ہوئے بولی۔ ''لو... میں نے اس میں ملاوٹ کر دی ہے۔ اب آگ نہیں لگے گی۔ نشہ جلدی حاوی نہیں ہوگا۔''

وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں ذرا ٹھہر ٹھہر کر پیتا ہوں۔ تم اپنے پاپا سے فون پر کچھ کہنے والی ہو۔''

وہ ہنسنے لگی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیوں ہنس رہی ہو؟''

وہ بدستور ہنستے ہوئے بولی۔ ''ایک ہی پیگ میں تمہاری زبان لڑکھڑانے لگی ہے۔ اگر پاپا تم سے بھی فون پر بات کرنا چاہیں گے تو سمجھ لیں گے' میں تمہیں بھی اپنے جیسا بنا رہی ہوں۔''

''میں کیا کروں؟ سنبھل کر بول رہا ہوں۔ پھر بھی یہ میرے قابو میں نہیں آ رہی ہے۔ آپ ہی آپ بہک رہی ہے۔''

وہ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر فریج کے پاس گئی۔ وہاں سے لیمن جوس لے کر اس کے پاس آتے ہوئے بولی۔ ''اسے پیو گے تو تھوڑا سا نشہ ابھی اتر جائے گا۔ پاپا سے باتیں کرنے کے بعد دوسرا پیگ پینا مناسب رہے گا۔''

اس نے ایک گلاس میں لیمن جوس لے کر پیا۔ حلق اور سینے میں ٹھنڈک سی محسوس ہونے لگی۔ پندرہ بیس منٹ میں ہی وہ نارمل ہو گیا۔ شہناز نے دوسرے پیگ سے دو گھونٹ لئے۔ پھر ریسیور اٹھا کر نمبر پنچ کرنے لگی۔ رابطہ ہونے پر بولی۔ ''ہائے پاپا! ہاؤ آر یو....؟''

دوسری طرف سے سلامت علی نے کہا۔ ''فائن... میری جان کیسی ہے؟ کیا سلطان احمد وہاں پہنچ گیا ہے؟''

''جی ہاں۔ یہ میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ ہم اسنیکس لے رہے ہیں اور کافی پی رہے ہیں۔''

باپ نے کہا۔ ''ہوں... قابل برداشت ہے۔ اسی لئے اس کے ساتھ کافی پی رہی ہو۔''

وہ مسکرا کر سلطان احمد کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہی بات ہے۔ میرے پاپا کی چوائس کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ اس نے آتے ہی کچھ امپریس کیا ہے۔ باقی رفتہ رفتہ معلوم ہو گا کہ کچھوا اپنے خول سے نکل کر کیسا لگتا ہے؟''

''پاپا کی جان! ہر بندہ اپنی ذات میں مکمل نہیں ہوتا۔ اگر وہ کئی پہلوؤں سے بہتر ہو تو اس کے دو چار کمزور پہلوؤں کو برداشت کر لینا چاہئے۔''

''آپ کی بیٹی ایسی باتیں سمجھتی ہے۔ مجھ میں کچھ خرابیاں ہیں۔ اگر کوئی ان

خرابیوں کو برداشت کرے گا تو میں بھی اس کی چند کمزوریوں سے کمپرومائز کر سکتی ہوں۔''

سلطان احمد اس کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ دوسری طرف سے سلامت علی کیا کہہ رہا ہے؟ مگر سمجھ میں آنے والی باتیں تھیں۔ شہناز کہہ رہی تھی' اگر وہ اس کی دو چار کمزوریوں کو برداشت کرے گا تو وہ بھی اس سے سمجھوتہ کرے گی۔ جبکہ اس کی کمزوریاں سمجھوتہ کرنے والے پر قیامت ڈھا رہی تھیں۔ ہزاروں میل دور بیٹھا ہوا باپ یہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ بیٹی ہونے والے شوہر کے سامنے کس طرح اپنے یار کو جوانی کی سوغات دیتی ہے؟

وہ ایسی خود سر' سر پھری اور بے باک ہے کہ اپنے ایک نہیں' دو بوائے فرینڈز کا ذکر کر چکی ہے۔ صاف طور پر کہہ چکی ہے کہ ان کے ساتھ صرف دن ہی نہیں' راتیں بھی گزارتی رہتی ہے۔ ایسی بے باکی اور بے حیائی کوئی بے غیرت ہی برداشت کر سکتا ہے۔ اس کا سیاستدان باپ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی بیٹی سے سمجھوتہ کرنے کے لئے اس قدر بے حیا اور بے غیرت بن چکا ہے کہ اپنی تہذیب کو اور اپنے دین کو پس پشت ڈال چکا ہے...

''بلوری... میری جان! تیرے عشق میں' میں تو ایمان سے بھی گیا۔ یہ عشق بڑا مردود ہوتا ہے۔ آزمائش کی گھڑیوں میں بے ایمان اور بے غیرت بنا دیتا ہے۔''

شہناز نے ریسیور رکھ دیا۔ سلطان نے پوچھا۔ ''تم اپنے پاپا سے میری بات نہیں کرائی؟''

وہ بولی۔ ''دوسرے فون پر ان کی ایک اہم کال آئی تھی۔ وہ ادھر مصروف ہو گئے ہیں۔ یوں بھی ان سے باتیں کرنا ضروری نہیں ہے۔ وہ میری باتوں سے مطمئن ہو گئے ہیں۔''

اس نے اس کا ادھورا پیگ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کم آن... میرا ساتھ دو۔''

وہ دل پر پتھر رکھ کر ساتھ دینے لگا۔ اتنے عذابوں سے گزرنے کے بعد خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ دونوں باپ بیٹی اس کی طرف سے مطمئن تھے۔ وہ دوسرا ڈبل پیگ ختم کرتے ہی موڈ میں آ گئی۔ لہرا کر بولی۔ ''اے یو... مائی وُڈ بی ہزبینڈ! تم کیا بکواس کرتے ہو؟ بلوری میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں ہے؟''

اس نے کہا۔ ''میں اسی بات کو دوسری طرح کہتا ہوں' تم میں جو کچھ ہے۔ تم جیسی

ہو بلوری ویسی نہیں ہے۔"

یہ بات شہناز کے سر سے گزر گئی۔ وہ سمجھ نہیں پائی۔ خوش ہو کر بولی۔ "مہیئر یو آر... آئی لو یو...! میری تعریف کرو۔ کیا میں خوبصورت ہوں؟"

سلطان نے نشہ کم کرنے کا نسخہ پالیا تھا۔ وہ وہسکی کا ایک گھونٹ لیتا تھا۔ پھر لیمن جوس کے دو چار گھونٹ پی لیتا تھا۔ اس طرح نشہ حواس پر حاوی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ہوش و حواس میں تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہ مستی بھرے سرور میں ہے۔ صرف اپنی ہی تعریفیں سننا چاہے گی۔ اس نے کہا۔ "تم بہت خوبصورت ہو۔"

وہ ایک بیوٹی پوز بناتے ہوئے بولی۔ "کیا میری جوانی نگاہوں کو پکارتی ہے؟"

وہ ایک گھونٹ حلق سے اتار کر بولا۔ "ایسے پکارتی ہے کہ دیکھنے والے اندھے ہو جاتے ہوں گے۔ مجھے بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ ہر سو تم ہی تم نظر آ رہی ہو۔"

وہ اپنا جام ہاتھ میں لے کر جھومتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے سامنے آ کر بولی۔ "جب میں آئینہ دیکھتی ہوں تو مجھے بھی اپنے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں اپنی ویڈیو کیسٹ بنوانا چاہتی ہوں۔ اس ویڈیو میں دائیں بائیں سے' آگے پیچھے سے' اوپر نیچے سے ...ہر طرف سے اپنے حسن و شباب کی رعنائیاں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

وہ ایک الماری کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "وہاں ایک بہت ہی مہنگا اے ون مووی کیمرہ رکھا ہوا ہے۔ اسے اٹھا کر لاؤ اور مجھے پکچرائز کرو۔"

وہ بولا۔ "میں نے کبھی کیمرہ ہینڈل نہیں کیا ہے۔"

"وہ ایسا ہے کہ اسے کوئی اناڑی بھی ہینڈل کر سکتا ہے۔ تم لے کر تو آؤ... میں تمہیں اس کا فنکشن سمجھاتی ہوں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر الماری کی طرف چلا گیا۔ وہ بولی۔ "ہم اپنی آنکھوں سے ساری دنیا کو دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو ہر زاویے سے دیکھ نہیں پاتے۔ آج تم دکھاؤ گے اور میں دیکھوں گی۔"

وہ کیمرہ اٹھا کر لے آیا۔ وہ سمجھانے لگی کہ کس طرح اسے آپریٹ کرنا چاہئے؟ وہ کیمرہ پاکستانی کرنسی میں تقریباً دو لاکھ روپے کا تھا۔ اسے آپریٹ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں

تھا۔ وہ اس کی متحرک فلم تیار کرنے لگا۔

وہ اسکرٹ اور بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ اپنے دائیں' بائیں سے اور پشت کی طرف سے طرح طرح کے بیوٹی پوز بنانے لگی۔ اسے گائیڈ بھی کرنے لگی کہ کس طرح ٹاپ شاٹ لینا چاہئے اور کس طرح لو اینگل سے مووی بنانی چاہئے؟ پھر اس نے کہا۔ "اب میری کمر تک کلوز میں آؤ۔"

وہ کیمرے کو کلوز میں لے آیا۔ اس نے کہا۔ "دیکھو... میری گردن کتنی اجلی اور شفاف ہے؟ میں آئینے میں اسے دیکھتی رہتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے گریبان کا ایک بٹن کھولا۔ پھر دوسرے بٹن کو کھولا۔ سلطان نے گھبرا کر کیمرے کو آف کر دیا۔ وہ چونک کر بولی۔ "کیا ہوا؟ کیا تم نے کوئی غلط بٹن دبا دیا ہے؟"

"نن... نہیں۔ وہ... تمہارے بٹن کھل گئے ہیں۔"

"اس لئے کہ میں کھول رہی ہوں۔ یو نان سنس... کیمرے کو آن رکھو۔"

شہناز نے کیمرہ لے کر اسے آن کیا۔ پھر کیسٹ کو ریوائنڈ کر کے کیمرے کے ننھے سے مانیٹر پر اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔ خوش ہو کر کہنے لگی۔ "ہائے کتنی اچھی مووی بن رہی ہے؟ سچ بتاؤ... ایک ایک زاویے سے میرا بدن کیسا دکھائی دے رہا ہے؟"

جب بلاؤز کا دوسرا بٹن کھولنے کے بعد مانیٹر بلینک ہو گیا تو وہ بولی۔ "ہائے کتنا سنسنی خیز منظر تھا؟ تم بالکل ہی ایڈیٹ ہو۔ یہ کیسٹ تین گھنٹے تک چلے گی۔ خبردار...! جب تک میں نہ کہوں' اسے آف نہ کرنا۔"

اس نے کیمرہ سلطان کے حوالے کیا۔ پھر ایک ڈبل پیگ بناتے ہوئے کہا۔ "اسٹارٹ ناؤ۔ مانیٹر کو دیکھتے رہو اور مجھے فریم کے بالکل سینٹر میں رکھا کرو۔"

اس نے کیمرے کو آن کیا۔ اگرچہ وہ بہت ہی مستی بھرا جذباتی مشورہ تھا۔ مگر وہ ہونے والی بیوی سے اس حد تک بے تکلف نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مگر اس کے چاہنے' نہ چاہنے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اسے وہی کرنا تھا' جو ہونے والی خریدار بیوی کہہ رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے جام اٹھا کر پی رہی تھی اور دوسرا ہاتھ بلاؤز کے دریچے کھول رہا تھا۔

اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''اس کا مطلب ہے' میرا بدن زلزلے پیدا کرتا ہے۔ تم کیمرے کو سنبھال نہیں پاؤ گے۔ اسے اسٹینڈ کے ساتھ فکس کر دو اور میرے پاس چلے آؤ۔''

اس نے کیمرے کو آف کر کے ایک اسٹینڈ پر لگا دیا۔ شہناز نے آ کر مانیٹر پر دیکھا' پورا بیڈ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بولی۔ ''یہ ٹھیک ہے۔ کیمرے کو بیڈ پر ہی فکس رکھو اور اسے آن کر دو۔''

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ شہناز فریم میں آ کر ایک ادائے ناز سے بیڈ کے سرے پر بیٹھ گئی۔ جام کو خالی کرنے کے بعد بولی۔ ''دیکھو....! یہ خالی ہو چکا ہے۔ مگر میں بھری ہوئی ہوں۔ جو نشہ مجھ میں ہے' وہ اس میں نہیں ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے جام کو ایک طرف اچھال دیا۔ پھر سی ڈی پلیئر آن کر کے موسیقی کی تال پر تھرکتے ہوئے مختلف زاویوں سے خود کو پیش کرنے لگی۔ اس نے حکم دیا۔ ''میرے پاس آؤ۔''

وہ حکم کا بندہ تھا۔ ہچکچاتے ہوئے قریب آ کر بولا۔ ''یہ... مناسب نہیں ہے۔ مجھے کیمرے کے پیچھے رہنے دو۔''

وہ بولی۔ ''مناسب کیوں نہیں ہے؟ کیا مجھ سے شادی نہیں کرو گے؟''

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں۔ مگر...''

''اگر مگر کچھ نہیں... میں تمہارے ساتھ سہاگ رات نہیں منا رہی ہوں۔ یوں سمجھو' ہم شادی سے پہلے مستی میں آ کر انجوائے کر رہے ہیں۔ سچ بتاؤ' مجھ سے کیوں کترا رہے ہو؟''

''صرف اس لئے کہ ہر بات اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے۔''

''تمہاری یہ بات درست نہیں ہے۔ حسین نظارے ہر وقت اچھے لگتے ہیں۔''

وہ بولتی جا رہی تھی۔ میوزک کی تال پر تھرکتی جا رہی تھی اور بلاؤز سے آزاد ہوتی جا رہی تھی۔

سلطان پریشان ہو کر کبھی اس کی طرف اور کبھی کیمرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کا ایک کان پکڑ کر اپنی طرف گھماتے ہوئے بولی۔ ''ادھر نہیں... ادھر دیکھو۔''

وہ بے چارہ بری طرح پھنس گیا تھا۔ بلوری کی رہائی بہت مہنگی پڑ رہی تھی۔ وہ کسی وقت بھی وہاں سے رہائی حاصل کر سکتا تھا۔ اس خریدنے والی کو ٹھکرا کر جا سکتا تھا۔ مگر نہیں جا رہا تھا۔ سوچنا آسان تھا' کر گزرنا مشکل تھا۔ بے شک اسے زنجیروں سے باندھا نہیں گیا تھا۔ لیکن ایک ننھی سی پائل نے اس کے پیروں کو باندھ رکھا تھا۔ محبت کے قیدی کبھی رہائی نہیں پاتے۔

وہ نشے کی ترنگ میں حد سے گزر رہی تھی۔ جب بدن پر لباس کم سے کم رہ گیا تو وہ ایکدم سے بوکھلا گیا۔ اس کے حسن و شباب کو دیکھ کر ہوس کو چیخنا چاہئے تھا۔ لیکن بلوری اس کے اندر چیخیں مار رہی تھی.... نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن....

جب اسے کچھ سجھائی نہ دیا تو اس نے فرش پر پڑے ہوئے جام کو دیکھا۔ شہناز نے اسے خالی کر کے پھینکا تھا۔ وہ آدھا ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی جھک کر اسے اٹھایا۔ اس کے نچلے حصے کو خنجر کی طرح مٹھی میں جکڑ کر ٹوٹے ہوئے حصے کو اپنے سینے پر مارا۔ وہ آدھا دائرے نما شیشہ اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

وہ ناچتے ناچتے ایکدم سے ٹھٹھک گئی۔ حیرت سے منہ یوں کھل گیا' جیسے اندر سے ہائے کہہ کر رہ گئی ہو۔ اس کی قمیص پر لہو کے سرخ دھبے ابھرنے اور پھیلنے لگے۔ اس نے تڑپ کر اس ٹوٹے ہوئے جام کو چھین کر ایک طرف پھینک دیا۔ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے' وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

اس کے تیور بدل رہے تھے۔ وہ غصے سے سرخ ہو رہی تھی۔ چیخ چیخ کر کہنے لگی۔ ''یو ایڈیٹ....! تم میری انسلٹ کر رہے ہو۔ میں اپنے حسن کا اور چھلکتی ہوئی جوانی کا ایک ایک منظر پیش کر رہی تھی اور تم آنکھیں رکھتے ہوئے بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔''

وہ نڈھال سا ہو کر بیڈ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں نہیں جانتا' میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟''

وہ اسے دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ ''میں جانتی ہوں... اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ تم مجھے نظروں سے گرا رہے ہو۔ میں پھول کھلا رہی ہوں اور تمہارے اندر بلوری کھل رہی ہے۔ یہاں میں خوشبو لٹا رہی ہوں' وہاں تم اس کے وجود میں سانسیں

لے رہے ہو۔ زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے ہو مگر تمہارے سینے سے بہتا ہوا لہو کہہ رہا ہے' وہ مجھ سے زیادہ مالا مال ہے اور میں ایسی کنگال ہوں کہ مجھ پر تھوکنا بھی نہیں چاہتے۔"

وہ اچانک ہی دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر رونے لگی۔ کہنے لگی۔

"آج تک کبھی کسی نے میری ایسی انسلٹ کرنے کی جرات نہیں کی۔ میں تم پر تھوکوں گی' ٹھوکریں مار کر تمہیں یہاں سے بھگاؤں گی' تب بھی میری تسلی نہیں ہوگی۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر اپنی ناقدری برداشت نہیں کر سکتی۔ تم نے میرے مقابلے پر جس کی قدرو قیمت بڑھائی ہے' اس کی حیثیت کیا ہے...؟"

وہ ایک طرف تھوکتے ہوئے بولی۔ "تھو... وہ نالی کا کیڑا ہے۔ اس ذلیل کمینی کے لئے تمہارے دل کا لہو اچھل کر سینے پر پھیل رہا ہے۔ میرے اندر آگ لگا رہا ہے۔"

اس نے جھنجھلا کر کیمرے کے اسٹینڈ کو ایک لات ماری۔ کیمرہ دور جا کر فرش پر گر پڑا۔ وہ پلٹ کر بولی۔ "ایک چوہدری سیاستدان اسے لوٹ رہا ہے۔ پھر بھی وہ تمہارے لئے ان چھوئی ہے... اچھوتی ہے... پرکشش ہے۔ اس کی انسلٹ نہیں ہو رہی ہے' میری ہو رہی ہے۔ میں اس کی عزت کی' اس کے وجود کی دھجیاں اڑا دوں گی۔"

اس نے وہسکی کی بوتل کو اٹھا کر میز پر دے مارا۔ بوتل زوردار چھناکے سے ٹوٹ کر دور تک بکھرتی چلی گئی۔ وہ تنبیہ کے انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے بولی۔ "تم ایک دشمن سیاستدان سے نمٹ نہ سکے۔ دوسرے سیاستدان میرے پاپا ہیں۔ وہ اسے ایک چٹکی میں مسل کر رکھ دیں گے۔ تم جسے رہائی دلانے یہاں تک آئے ہو' میں اسے عمر قید کی سزا سنا رہی ہوں۔ اب وہ دو سیاستدانوں کے درمیان پستی رہے گی۔ ایسے ہی سچے عاشق ہو تو جاؤ' اسے رہائی دلاؤ۔ تم جیسے ننگے بھوکے پاکستانی ہمارے تلوے چاٹنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔"

وہ ایک صوفے پر گرنے کے انداز میں بولی۔ "آؤ... میرے تلوے چاٹو یا دفع ہو جاؤ یہاں سے..."

وہ بستر کے سرے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں سے اٹھ گیا۔ سر جھکا کر اس کے سامنے سے گزرتا ہوا بیڈروم سے باہر آ گیا۔ محبت کے شہید ہوں یا غازی۔ ایک الاؤ ان کے سینے پر تمغے کی طرح جگمگاتا ضرور ہے۔

ایسے وقت ہی کہا جاتا ہے' بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے.....

اگرچہ وہ بے آبرو نہیں ہوا تھا۔ اس نے تو محبت کی آبرو رکھی تھی۔ اپنی بلوری کا مان بڑھایا تھا۔ اس کی خاطر شہناز جیسی انتہائی دولت مند حسینہ کو ٹھکرا رہا تھا۔ اپنے لئے اور بلوری کے لئے کھیلی جانے والی بہت ہی اہم بازی ہار کر جا رہا تھا۔

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے

ابھی اس نے دونوں جہان نہیں ہارے تھے۔ محبت کی دنیا میں بازیاں جیت رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے' دوسرے پہلوؤں سے مات کھاتا ہوا شب غم گزار رہا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں آ کر واپسی کے لئے سامان پیک کرنے لگا۔ شہناز کے بیڈروم سے رہ رہ کر چیخنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اسے اور اس کی بلوری کو گالیاں دے رہی تھی۔ بچپن سے اپنی تعریفیں سننے والی کو جوانی میں حسن و شباب کے قدردان ملتے رہے تھے۔ پہلی بار ایک پروانہ ایسا آیا تھا جو اپنی ہی شمع کے گرد طواف کرتا رہا تھا۔ ہزار کینڈل پاور کا حسن رکھنے والوں میں آگ نہیں ہوتی۔ لہٰذا قدرتاً اور فطرتاً کوئی پروانہ ان کی طرف جل مرنے کے لئے نہیں آتا۔

پروانہ منہ پھیر کر جا رہا تھا اور شہناز سے اپنی توہین برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی۔ کمرے کے اندر سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں' جیسے وہ وہاں کی چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینک رہی ہو۔ وہاں رہنے والے دو ملازم دوڑے چلے آئے تھے۔ بیڈروم کے دروازے پر پہنچ کر ٹھٹک گئے تھے۔ جب مالکن کا مزاج گرم ہوتا تھا' وہ غصے میں آتی تھی تو کوئی اس کے آگے بولنے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ ان میں سے ایک دوڑتا ہوا ٹیلی فون کی طرف گیا۔ دوسرا سلطان احمد کے کمرے میں آ کر بولا۔ "صاحب! بی بی جی کو کیا ہو گیا ہے؟"

سلامت علی نے اپنی بیٹی کی خدمت کے لئے پاکستان سے دو ملازم بھیجے تھے۔ سلطان احمد نے کہا۔ "تمہاری مالکن کو دولت' طاقت اور حسن و شباب کا غرور ہے۔ اگر وہ ہنستی' کھکھلاتی' ناچتی اور گاتی ہے تو چیخیں بھی مار سکتی ہے۔ ہم اس کے آگے کچھ نہیں ہیں۔

کیا تم اسے قہر وغضب سے اور توڑ پھوڑ سے روک سکتے ہو؟"

وہ بولا۔ "یہ تو ہمیں مارتی ہیں' گالیاں دیتی ہیں۔ دوسروں کا غصہ ہم پر اتارتی ہیں۔ لیکن آج ان کی حالت کچھ عجیب سی ہے۔ انہوں نے تو ہمیں جیسے دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ نہ جانے کس کو گالیاں دے رہی ہیں؟ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی ہیں۔ دیوار پر گھونسے مار رہی ہیں۔ لاتیں مار رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے' پاگل ہو گئی ہیں۔ ان پر کسی قسم کا دورہ پڑا ہے۔"

دوسرا ملازم دوڑتا ہوا آیا پھر بولا۔ "صاحب جی ...! آپ کچھ کریں' انہیں سمجھائیں۔ میں نے بڑے صاحب کو فون کیا ہے۔"

شہناز کے بیڈ روم سے فون کی گھنٹی سنائی دینے لگی۔ ایک نے کہا۔ "بڑے صاحب فون کر رہے ہیں۔"

وہ دونوں دوڑتے ہوئے ادھر چلے گئے۔ سلطان اپنے دروازے پر آ کر اس کے بیڈ روم کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں فون کی گھنٹی چیخ رہی تھی۔ شہناز نے پلٹ کر اسے ایک لات مارتے ہوئے کہا۔ "شٹ اپ یو نان سنس..."

وہ ٹیلی فون سیٹ دور جا کر فرش پر گر پڑا۔ ریسیور کریڈل سے الگ ہو گیا۔ وہاں سے سلامت علی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ پکار رہا تھا۔ "ہیلو۔ ہیلو شہناز....! پاپا کی جان! فون اٹینڈ کرو' باپ سے باتیں کرو میری جان...!"

وہ وحشت زدہ نظروں سے فون کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر جیسے فرش پر گر پڑی۔ کریڈل کو اٹھا کر سینے سے لگاتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ادھر سے باپ سن رہا تھا' پریشان ہو کر پوچھ رہا تھا۔ "کیا ہوا... کیوں رو رہی ہو؟ ابھی ملازم نے مجھے اطلاع دی ہے' تمہیں پھر دورہ پڑا ہے۔ میری جان! ڈاکٹر نے سمجھایا تھا' تمہیں کسی بات کی ٹینشن نہیں لینی چاہئے۔ اب کیا ہو گیا ہے؟ مجھے بتاؤ تو سہی..."

ریسیور اسی طرح فرش پر پڑا ہوا تھا۔ وہ کریڈل کو سینے سے لگائے چیخ کر بولی۔ "آئی ہیٹ ہم... اس نے میری انسلٹ کی ہے۔"

"کس نے انسلٹ کی ہے؟ کس کی شامت آئی ہے؟"

"اسی کتے نے مجھے ٹھکرایا ہے' جسے آپ نے یہاں بھیجا ہے۔ وہ ایک دیہاتی' گنوار' دو کوڑی کی لڑکی سے دو کوڑی کا عشق کرتا ہے۔ اس کی خاطر مجھے ٹھکرا رہا تھا۔ میں نے بھی اسے ٹھوکر مار دی ہے۔ مگر یہ بات میرے اندر خنجر کی طرح لگ رہی ہے کہ اس نے ایک معمولی لڑکی کی خاطر میری انسلٹ کی ہے۔ میں یہ بات نہیں بھول سکتی' میں اندر سے مر رہی ہوں۔ اگر آپ نے اسے گولی نہ ماری تو میں اپنی جان دے دوں گی۔ خودکشی کر لوں گی۔"

باپ نے جلدی سے کہا۔ "نہیں نہیں میری جان! تم سلامت رہو گی۔ تمہارے دشمن مریں گے۔ سلطان احمد کو یہاں پہنچنے دو۔ میں اسے کتے کی موت ماروں گا۔"

"آپ کی باتوں سے میری تسلی نہیں ہو رہی ہے۔ میں کیا کروں؟ آپ اسے تڑپا تڑپا کر ماریں گے۔ وہ بلوری کو رہائی دلانے کے لئے میرا تابعدار اور بناسپتی شوہر بننے آیا تھا۔"

پھر وہ حلق پھاڑ کر چیختے ہوئے بولی۔ "اس ذلیل کتیا کو رہائی نہیں ملے گی۔ وہ جیل میں سڑتی' گلتی اور بدصورت بنتی رہے گی اور وہ اسے رہائی دلانے کے لئے' ایک ذرا چھو لینے کے لئے ترستا رہے گا' تڑپتا رہے گا' مرتا رہے گا۔ تب ہی میرے اندر کی آگ بجھے گی۔"

"میری بیٹی! میری جان! تم جو کہہ رہی ہو' وہی ہو گا۔ اپنے غصے پر قابو پاؤ' دماغ کو ٹھنڈا رکھو' اپنے باپ پر بھروسہ کرو۔ بھروسہ نہیں ہے تو کل ہی کسی پہلی فلائٹ سے یہاں آؤ اور دیکھو۔ تم جو کہو گی' میں وہی کروں گا۔ ان دونوں کی زندگی حرام کر دوں گا۔ فار گاڈ سیک کول ڈاؤن... بی سنس ایبل... اس طرح چیختی چلاتی رہو گی تو دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ اگر اس ذلیل سلطان احمد اور اس کی بلوری کو سزائیں پاتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہو تو اپنے آپ کو سنبھالو۔ دماغ کو ٹھنڈا رکھو۔ وہ کمینہ وہاں موجود ہے تو فون اس کے پاس پہنچاؤ۔"

سلطان احمد اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ فون پر چیخ کر بول رہی تھی۔ اس کی ایک ایک بات سنائی دے رہی تھی۔ ایک ملازم ٹیلی فون اٹھا کر سلطان احمد کے پاس لے آیا۔ پھر ریسیور بڑھاتے ہوئے بولا۔ "بڑے صاحب بات کریں گے۔"

وہ آرام سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ملازم کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ "ہیلو.... میں سلطان احمد بول...."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی دوسری طرف سے سلامت علی نے

دھاڑتے ہوئے کہا۔ ''یو بلڈی فول...! کیا میری بیٹی کو وہاں مارنے گیا ہے؟ کیا اپنی اوقات بھول گیا ہے؟ تین برس پہلے میں یہاں کا صوبائی وزیر تھا۔ چھ ماہ بعد الیکشن جیت کر نیشنل اسمبلی میں جاؤں گا۔ مرکزی شعبے کی کوئی وزارت حاصل کروں گا۔ تم جیسے لوگ ہمارے سامنے کیا ہوتے ہیں... نالی کے کیڑے... جن پر ہم تھوکنا بھی پسند نہیں کرتے۔''

سلطان احمد نے بڑے ہی ٹھنڈے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ''اور تم نے اپنی بیٹی پر تھوکنے کے لئے مجھے یہاں بھیجا تھا۔''

وہ دھاڑتے ہوئے ایک گندی سی گالی دیتے ہوئے بولا۔ ''میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میری بیٹی جو چاہتی ہے' وہی کروں گا۔ تجھے تڑپا تڑپا کر' ترسا ترسا کر ماروں گا۔ بلوری کو جیل سے نکلنے نہیں دوں گا۔ تُو یہاں حرام موت مرے گا یا یہ ملک چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔''

''تُو مجھ سے میرا ملک چھڑائے گا... کیا پاکستان تیرے باپ نے بنایا تھا؟ اور یہ تُو نے مجھے جو گالی دی ہے' اس کے جواب میں ابھی میں کیا کر سکتا ہوں تُو سوچ بھی نہیں سکتا۔''

سلامت علی کو خطرے کا احساس ہوا۔ وہ جلدی سے گھبراتے ہوئے بولا۔ ''تُو۔ تُو کیا کرنا چاہتا ہے؟ کیا کرنا چاہتا ہے؟ اگر۔ اگر میری بیٹی کو ہاتھ بھی لگایا تو میں تیرے پورے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔''

''میرا پورا خاندان' میری پوری دنیا صرف بلوری ہے اور اسے میں داؤ پر لگا چکا ہوں۔ تیری بیٹی بہت سر پھری اور مغرور ہے۔ اپنی شان کے خلاف کوئی بات سننا نہیں چاہتی۔ ابھی میں اسے یہی گالی دوں گا' جو تُو نے مجھے دی ہے اور اس پر تھوکتا رہوں گا تو سوچ لے' وہ کس طرح پاگل ہو کر خودکشی کر لے گی؟ میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا' ہلاک بھی نہیں کروں گا اور تیری دی ہوئی گالی کا جواب تجھے مل جائے گا۔''

وہ گھبرا کر جلدی جلدی بولنے لگا۔ ''نہیں۔ تُو ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ دیکھ سلطان احمد...! دیکھ... وہ ہماری ایک ہی لاڈلی بیٹی ہے۔ ہماری جان ہے۔ تُو اسے ہاتھ نہیں لگائے گا۔ میں اپنی دی ہوئی گالی واپس لیتا ہوں۔''

''تو پھر جو غلاظتیں تُو نے منہ سے نکالی ہیں' ان کے لئے معافی مانگ...''

وہ بولا۔ ''میں معافی مانگتا ہوں۔ آئندہ کبھی تجھے گالی نہیں دوں گا۔ ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں' ابھی میری بیٹی سے دور چلا جا' میں تجھ سے کوئی انتقام نہیں لوں گا۔ یہ بھول جاؤں گا کہ کوئی سلطان احمد میری زندگی میں آیا تھا۔''

''میرے ملک کے سیاستدان کتنے سچے اور وعدے کے پکے ہوتے ہیں' یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھے اپنی زبان کا سچا ہونا چاہئے۔ لہٰذا میں تیری بیٹی سے انتقام نہیں لوں گا۔ مگر میری ایک شرط ہے' آج کی رات اسی بنگلے میں گزاروں گا۔ یہ شہر میرے لئے انجانا ہے۔ رات کے وقت باہر جا کر بھٹکنا نہیں چاہتا۔ صبح ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔''

''نہیں سلطان احمد! تم وہاں میری بیٹی کے قریب نہیں رہو گے۔ میں اپنے ملازم کو حکم دیتا ہوں' وہ تمہیں کسی اچھے ہوٹل میں پہنچا دے گا۔ میری بات مان لو۔ وہاں سے نکل آؤ۔''

ایسے ہی وقت ڈرائنگ روم سے شہناز کی آواز سنائی دی۔ وہ ملازموں کو گالیاں دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا یہ تمہارے باپ کا گھر ہے؟ رات کے وقت بھی اندر چلے آتے ہو؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے.... گیٹ لاسٹ۔''

سلطان احمد نے فون پر پوچھا۔ ''اپنی بیٹی کی باتیں سن رہے ہو؟ کیا پرورش کی ہے' کتنی میٹھی زبان دی ہے اس کے منہ میں...؟''

''فضول باتیں نہ کرو' یہاں سے جاؤ۔ شہناز سے کہو' میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

سلطان احمد نے آہٹ سن کر سر گھمایا۔ وہ دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ میں چھلکتا ہوا جام تھا۔ وہ نشے میں جھومتی ہوئی' گہری سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ فون پر بولا۔ ''تمہاری بیٹی خود ہی میرے کمرے میں آ گئی ہے۔ میں ریسیور اس کی طرف لے جا رہا ہوں۔ اونچی آواز میں اسے بلاؤ۔''

اس کے ایک ہاتھ میں ریسیور تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے فون کو اٹھایا۔ پھر شہناز کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''اپنے پاپا کی آواز سنو۔''

ادھر سے وہ کہہ رہا تھا۔ ''شہناز! میری جان! میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے

باتیں کرو۔"

شہناز نے آگے بڑھ کر ایک گھونٹ پی کر ریسیور کو ہاتھ میں لیا۔ پھر قریبی صوفے پر بیٹھ گئی۔ سلطان نے کریڈل کو ایک طرف رکھ دیا۔ وہ اب تک ہذیانی انداز میں چیختی چلاتی آئی تھی۔ اس وقت خلاف توقع بہت ہی دھیمی سی آواز میں بولی۔ "لیس پاپا...!"

سلطان احمد اس سے دور جا کر بیٹھ گیا۔ دوسری طرف سے سلامت علی نے کہا۔ "تمہاری آواز میں نرمی ہے' ذرا سکون ہے۔ مجھے فخر ہے' میری بیٹی اچھے برے حالات کو سمجھتے ہوئے اپنے غصے پر قابو پانا جانتی ہے۔ میں نے سلطان سے کہہ دیا ہے' وہ ابھی یہاں سے چلا جائے گا۔ اپنے ملازم سے کہو' اسے کسی ہوٹل میں پہنچا دے۔"

شہناز نے کن اکھیوں سے سلطان احمد کی طرف دیکھا۔ اس کے سامنے ایک چھوٹا سا بیگ رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنی قمیص اتارنے کے بعد بیگ میں سے کوئی مرہم نکال کر اپنے زخم پر لگا رہا تھا۔ وہ فون اٹھا کر کمرے سے باہر جاتے ہوئے بہت ہی دھیمی آواز میں بولی۔ "اس نے مجھے نہیں' اپنے آپ کو زخمی کیا ہے۔"

باپ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"آپ نہیں سمجھیں گے۔ بس اتنا سمجھ لیں' مجھے غصہ آ گیا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات اٹک گئی تھی کہ اس نے میرے لئے دیوانگی ظاہر کیوں نہیں کی؟ کسی بلوری کو اہمیت کیوں دی؟ مجھے اس سے کمتر کیوں بنا دیا...؟"

"کیا یہ کہنا چاہتی ہو' اس نے تمہاری انا کو اور خودداری کو ٹھیس نہیں پہنچائی ہے؟"

"ہاں۔ یہی کہنا چاہتی ہوں۔ سلطان احمد نے کھلی سودے بازی کی تھی۔ ہم سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ بلوری کے بارے میں بھی بہت کچھ بتا دیا تھا۔ یہ شخص اس کی رہائی کی خاطر تمام عمر میرا تابعدار بننے یہاں آیا ہے۔ یہ بات دیر سے سمجھ میں آ رہی ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرنے اور میرے حسن کا قصیدہ پڑھنے نہیں آیا ہے۔ وہ اپنی ضرورت پوری کرنا چاہتا ہے۔ میں اسے ایک شوہر کا لیبل بنا کر دنیا والوں کی بے جا تنقید سے بچنا چاہتی ہوں۔ آپ بھی ایک سیاستدان کی حیثیت سے نیک نام رہنا چاہتے ہیں۔"

"شاباش بیٹی! تم بہت سمجھداری کی باتیں کر رہی ہو۔ وہ کم بخت میرے بہت کام

کا آدمی ہے۔ میں اس کے ذریعے چوہدری دلاور حیات کو اقتدار کی کرسی سے گرا سکتا ہوں۔ بلوری سلطان کی مرضی سے ہی چوہدری کے خلاف بیان دے گی۔ اگر ہم نے سلطان سے دشمنی کی تو وہ چوہدری کے خلاف زبان نہیں کھولے گی۔"

"تو پھر ہمیں سلطان احمد کو دشمن نہیں بنانا چاہئے۔"

"ہرگز نہیں۔ ہم اس سے سمجھوتہ کر کے اپنا بہت سا کام نکال سکتے ہیں۔ میں تمہارے آنسو نہیں دیکھ سکتا' تمہاری کوئی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں نے غصے میں سلطان احمد کو گالیاں دیں اور پتہ نہیں کیا کچھ کہہ دیا؟ لیکن تمہاری ذہانت پر حیران ہوں' تم بگڑی ہوئی بات بنانا چاہتی ہو۔"

"بات اس لئے بنانا چاہتی ہوں کہ آپ جیسے سیاستدان کی بیٹی ہوں۔ پچھلی بار الیکشن ہارنے کے بعد خود اپنی ہار نہیں مان رہے ہیں۔ آئندہ الیکشن جیتنے کے لئے بہت دور تک سیاسی چالیں چل رہے ہیں۔ میں بھی دور تک سوچ کر سلطان سے سمجھوتہ کروں گی۔ اسے جیت لینے کی اور بلوری سے چھین لینے کی تدبیر میرے ذہن میں آ چکی ہے۔"

"مجھے بتاؤ' تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں ایک ہونے والی بیوی کی حیثیت سے اسے دوست بنا کر رکھوں گی۔ پوری طرح اپنے اعتماد میں لوں گی۔ تین ماہ بعد بلوری کو رہا کرانے کے لئے' اس کا مقدمہ لڑنے اور دشمن چوہدری سے نمٹنے کے لئے اسے اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہو گی۔ آپ اس کی ضرورت پوری کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ اس کی طرف سے مقدمہ بھی لڑیں گے۔ ہم اسے ایسے ہی سبز باغ دکھائیں گے۔ مگر بلوری کو کسی بھی طرح جیل سے باہر نہیں آنے دیں گے۔ جب تک وہ اپنی زندگی کی قید میں ہے' تب تک آہنی سلاخوں کے پیچھے قیدی بن کر رہے گی۔ وہاں سے مر کر ہی نکلے گی۔"

"پاپا کی جان...! تمہاری باتیں سن کر فخر سے سینہ پھول رہا ہے۔ تم اپنے باپ کی طرح سیاسی چالیں چلنا جانتی ہو۔"

"جانتی نہیں تھی۔ سلطان نے میری قیمت گرا کر مجھے دور تک سوچنا سکھا دیا ہے۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ عورت جب تریا چلتر پر آ جائے تو بڑے بڑے

سیاستدانوں کو بھی مات دے دیتی ہے۔ دونوں باپ بیٹی موجودہ مسئلے کے ہر پہلو پر غور کرتے رہے' باتیں کرتے رہے۔ پھر ایک دوسرے سے متفق ہو کر فون کا رابطہ ختم کر دیا۔

وہ ریسیور رکھ کر وہاں سے اٹھ گئی۔ اپنے بیڈ روم سے چلتی ہوئی دروازے پر آ کر سلطان کے کمرے کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اسی لمحے میں نگاہوں کے سامنے یوں آ گیا' جیسے فون پر ہونے والی گفتگو کے اختتام کا انتظار کر رہا تھا۔

کچھ ایسی ہی بات تھی۔ اس نے باپ بیٹی کی باتیں نہیں سنی تھیں۔ مگر شہناز کے کمرے سے اس کی گنگناتی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ الفاظ واضح نہیں تھے۔ جب گنگناہٹ ختم ہو گئی' خاموشی چھا گئی تو وہ اس کا جام اٹھا کر اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے بڑے نرم لہجے میں بولی۔ ''میں اسے تمہارے کمرے میں چھوڑ آئی تھی۔ ابھی لینے آ رہی تھی...''

وہ نظریں جھکا کر بولی۔ ''میں... سوری کہتی ہوں۔''

وہ قریب آ کر اس کی طرف جام بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''سوری کی کیا بات ہے؟ تم اسے چھوڑ آئی تھیں۔ میں لے آیا ہوں۔''

وہ جام کو ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔ ''میں اس کے لئے سوری نہیں کہہ رہی ہوں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ میں نے نشے کی حالت میں تمہیں غلط سمجھا اور ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔''

اس نے کہا۔ ''تم اب نارمل ہو گئی تھیں۔ جنونی انداز میں چیخ رہی تھیں۔ میں حیران ہوں' اچانک نارمل کیسے ہو گئیں؟''

''بہت زیادہ ماتم کرنے اور رونے سے اندر کا غبار دھل جاتا ہے۔ دل کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ پھر عقل سمجھاتی ہے' رونے سے زخم نہیں بھرتے۔''

وہ ایک گھونٹ پی کر اس کے قریب ہو گئی۔ شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''مجھے اچانک ہی تمہاری ایک بات یاد آ گئی۔''

''کون سی بات...؟''

''میں نے کہا تھا' سارے ہی مرد بے وفا ہوتے ہیں۔ شادی سے پہلے ایک

عورت کے محبوب ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد دوسری محبوبائیں اور داشتائیں پالنے لگتے ہیں اور تم نے کہا تھا' سب ایسے نہیں ہوتے اگر میں صبر کروں اور سچی لگن سے تلاش کروں تو مجھے بھی ایک سچا چاہنے والا مل سکتا ہے۔ ایسے وقت تم نے اپنی مثال دی تھی۔''

اس نے ایک گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ ''آہ...! تم نے اپنی بلوری کی مثال دی تھی اور میں اندر سے جل بھن گئی تھی۔ تم نے دعویٰ کیا تھا' اسے سچے دل سے چاہتے ہو۔ اس کے لئے جان بھی قربان کر سکتے ہو۔ تمہاری یہ باتیں مجھے محرومی کا احساس دلا رہی تھیں۔''

اس نے پھر ایک گھونٹ پیا اور کہا۔ ''میں خود کو ہر زاویے سے دیکھنے کے لئے کم سے کم لباس میں اپنی ویڈیو فلم تیار کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لئے میں نے تمہیں مجبور کیا۔ دراصل میں تمہیں رجھانے کے لئے' لبھانے کے لئے اور اپنا دیوانہ بنانے کے لئے ایسا کر رہی تھی۔ مگر تم نے میرے طلسم سے نکلنے کے لئے خود کو ٹوٹے ہوئے جام سے زخمی کر لیا۔ یہ ثابت کر دیا کہ تم واقعی بلوری کے دیوانے ہو۔ ہماری دنیا میں ایسے مرد ہیں جو اپنی آئیڈیل کے ساتھ ساری زندگی گزار دیتے ہیں۔ کسی دوسری عورت کی طرف کبھی نہیں بہکتے۔''

اس نے آخری دو گھونٹ پی کر جام خالی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس صوفے پر بیٹھنا چاہتی ہوں۔ مجھے سہارا دے کر وہاں تک لے چلو۔''

یہ کہہ کر وہ اس کے بازو سے لگ گئی۔ وہ اپنا بازو ہٹا کر اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر' اسے اپنے ساتھ صوفے تک لے آیا۔ وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''تھینک یو۔ یہ میں نے دوسری بوتل نکالی ہے۔ کیا میرا ساتھ نہیں دو گے؟''

وہ بولا۔ ''پلیز۔ مجھے پینے کے لئے نہ کہو۔''

''میں حکم نہیں دوں گی۔ ضد نہیں کروں گی۔ محبت سے کہہ رہی ہوں۔ پانی ملا کر پیو' زیادہ نشہ نہیں ہوگا۔ میری طرح تم نہیں بہکو گے۔''

''یہی تو ڈر ہے' تم پھر بہک گئیں تو کیا ہوگا؟''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''یہاں بیٹھو۔ وعدہ کرتی ہوں' نہیں بہکوں گی۔ تم سے ایک ایسی بات کہوں گی' جسے سن کر تم مجھ سے محبت کرنے لگو گے۔''

وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''وہ بات کیا ہے؟''

"پہلے اپنے لئے اور میرے لئے پیگ بناؤ۔"

وہ بوتل کھول کر دو پیگ بنانے لگا۔ اس نے پوچھا۔ "یہ بتاؤ' کیا مجھ سے بیزاری ہے یا میں نے جو حرکت کی ہے' اس کی وجہ سے تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ کیا اپنی بلوری کو رہائی دلانے کے لئے جو سمجھوتہ ہوا ہے' اس پر عمل نہیں کرو گے؟"

"میں اسی سمجھوتے کے مطابق یہاں آیا تھا۔ لیکن تم نے بات بگاڑ دی اور اب پھر بگڑی ہوئی بات بنا رہی ہو۔"

"کوئی عورت اپنے ہاتھوں سے اپنا گھر برباد نہیں کرتی۔ کبھی نادانی سے غلطی ہو جاتی ہے تو فوراً ہی اس غلطی کی تلافی کرتی ہے۔ میں تمہارے ساتھ گھریلو اور ازدواجی زندگی گزاروں گی۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی ہے' مجھے بلوری سے جلنا کڑھنا نہیں چاہئے۔ میں کبھی اسے تمہارے دل سے دور نہیں کر سکوں گی۔"

وہ اس کی طرف بھرا ہوا جام بڑھاتے ہوئے بولا۔ "واقعی تم بہت ہی مثبت اور تعمیری انداز میں سوچ رہی ہو۔"

"میری ایک بات کا جواب دو' تم بلوری کی طرح مجھ سے عشق نہیں کرو گے۔ میرے دیوانے بن کر نہیں رہو گے۔ لیکن کیا ایک شوہر کی حیثیت سے مجھے بھرپور محبتیں دیتے رہو گے؟"

وہ بولا۔ "تمہارے پاپا نے کہا تھا' نکاح نامہ جعلی ہو گا۔ اگر وہ جعلی نہ ہوا اور سچ مچ ہمارا نکاح پڑھایا گیا تو میں ایک شوہر کی حیثیت سے تمہارے تمام حقوق ادا کروں گا۔"

"تم معاملات کو اچھی طرح سمجھتے ہو۔ یقیناً ایک بہترین شوہر ثابت ہوتے رہو گے۔ میں نے اب تک وہ بات نہیں بتائی ہے' جسے سن کر تم خوش ہو جاؤ گے۔"

"آخر وہ بات کیا ہے؟"

"وعدہ کرو' اگر میری بات سنتے ہی تمہیں دلی مسرتیں حاصل ہوں گی تو تم مجھے ابھی سے' اسی لمحے سے ایک شوہر کی بھرپور محبتیں دو گے اور یہاں میرے ساتھ دن رات گزارو گے۔"

اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا شادی سے پہلے؟"

"اب میرے مطالبے پر بحث نہ کرنا اور میں جانتی ہوں وہ بات سن کر تم بحث کرنا بھول جاؤ گے۔"

"تم نے مجھے تجسس میں مبتلا کر دیا ہے۔ بولو کیا بات ہے؟"

"میں تین مہینے بعد بلوری کو جیل سے نکل کر کہیں ادھر ادھر جانے نہیں دوں گی۔ میں نے پاپا سے کہا ہے' جب وہ رہا ہو کر باہر آئے گی اور جب تک کسی سے شادی نہیں کرے گی' تب تک تم اس کی کفالت کرو گے۔ اس کے تمام اخراجات پورے کرو گے' اسے کہیں بھٹکنے نہیں دو گے۔ یہی میں کہہ رہی ہوں۔ وہ کہیں نہیں بھٹکے گی' نہ ہی کسی سے شادی کرے گی۔ وہ تمہاری محبت ہے' تم اسے دل و جان سے چاہتے ہو۔ تم ہی اس سے شادی کرو گے۔"

اس نے ایک دم سے چونک کر اسے دیکھا۔ ایک حاسد اور مغرور لڑکی سے جس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی' وہ وہی کہہ رہی تھی۔ وہ شدید حیرانی اور بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم۔ تم اپنے لئے سوکن لانے کی بات کر رہی ہو؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "وہ تمہاری شریک حیات ضرور ہو گی۔ لیکن میری سوکن نہیں' بڑی بہن ہو گی۔"

اس نے شہناز کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ "واقعی تم نے دلی مسرتیں دینے والا فیصلہ کیا ہے۔ میں پہلی بار دل سے اور بڑی محبت سے تمہارے ہاتھ کو تھام رہا ہوں۔"

"صرف ہاتھ کو نہیں' میرے پورے وجود کو تھام لو۔ تم نے وعدہ کیا ہے' میں تمہیں خوش کروں گی تو تم مجھے اسی لمحے سے ایک شوہر کی بھرپور محبتیں دو گے۔"

اس نے ذرا ہچکچاتے ہوئے میز پر رکھے ہوئے جام کو دیکھا پھر کہا۔ "وہ... وہ تمہارا جام بھرا ہوا ہے۔"

وہ ایکدم سے قریب ہو کر بولی۔ "یہ کہیں نہیں جائے گا۔ میں نشہ چاہتی ہوں' شراب کا نہیں' تمہاری محبت کا..."

اس نے اپنی دونوں بانہیں اس کی گردن میں پہنا دیں۔ وہ بولا۔ "میں اپنا وعدہ پورا کروں گا' پہلے اتنا بتا دو' کیا واقعی تم بلوری کو میری دلہن بننے سے نہیں روکو گی؟"

وہ اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لاتے ہوئے بولی۔ ''ابھی صرف چند لمحوں کی محبت دو۔ اس کے بعد میں کاغذ قلم پر لکھ کر دوں گی۔ جس دن بلوری رہا ہو کر باہر آئے گی' اس کے دوسرے دن میں اپنے ہاتھوں سے اسے تمہاری دلہن بناؤں گی۔''

سلطان احمد نے اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ سرکش گھوڑے کو شہسوار اور سرکش مرد کو صرف عورت ہی لگام دینا جانتی ہے۔ وہ اسے جیت کر خوشی سے بے حال ہو رہی تھی۔ اس کے بازوؤں میں دھڑکتے ہوئے دل سے کہہ رہی تھی۔ ''میں ضرور اپنا وعدہ پورا کروں گی۔ بلوری ضرور تمہاری دلہن بنے گی۔''

پھر اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''مگر وہ سہاگ کا جوڑا تب پہن سکے گی' جب میرے پاپا اسے جیل سے باہر آنے دیں گے۔ مجھے ٹھکرانے والے...! میں بلوری کی ساری محبتوں کو' ساری قربتوں کو تم سے وصول کر رہی ہوں۔ مجھے نظروں سے گرانے والے! میری انسلٹ کرنے والے! میں جب تک چاہوں گی' تم میرے تلوے چاٹتے رہو گے اور جب چاہوں گی' تمہیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکوں گی۔''

☆☆☆

سلطان احمد امتحان میں پاس ہونے کے لئے لندن آیا تھا۔ اس کا خیال تھا' وہ ایک آدھ ہفتے میں واپس چلا جائے گا۔ لیکن شہناز جونک کی طرح چمٹ گئی تھی۔ اس نے سوچا تھا' سلطان احمد کے پاس بلوری کو دینے کے لئے جتنی محبتیں' قربتیں اور پیار کی جتنی شدتیں ہیں' وہ سب اس سے چھین لے گی۔ ادھر اس کا باپ سلامت علی بلوری سے چوہدری کے خلاف بیان دلا کر سیاسی مقاصد حاصل کرلے گا۔ اس کے بعد ان دونوں سے انتقام لیا جائے گا۔

مگر سلطان کو پاتے ہی اس کی سوچ' اس کا مزاج اور ارادے بدلنے لگے۔ وہ اس سے متاثر ہوتی جارہی تھی۔ اس کے بارے میں نفرت سے یا عداوت سے کوئی خیال پیدا ہوتا تو فوراً ہی اسے ذہن سے جھٹک دیتی تھی۔ چند ہی دنوں وہ اس کے حواس پر چھا گیا۔ جب دوسرا ہفتہ گزرنے لگا تو سلطان احمد نے کہا۔ ''میں یہاں دو ہفتے کے لئے آیا تھا۔ تمہارے پاپا نے بھی کہا تھا' مجھے وہاں جا کر ان کے قانونی معاملات کی دیکھ بھال کرنی چاہئے۔''

اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔ ''کیا مجھے چھوڑ کر جانے کو جی چاہتا ہے؟''

''نہیں۔ تم سے اتنی محبتیں مل رہی ہیں کہ وہاں جاؤں گا تو یہاں آنے کے لئے تڑپنے لگوں گا۔ ان پندرہ دنوں میں تم نے مجھے اپنا عادی بنا لیا ہے۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''تو پھر نہ جاؤ۔ یہاں میرے ساتھ رہو۔ بلوری تمہارے مشورے کے مطابق ڈھائی ماہ بعد اپنا حمل ظاہر کرے گی' تب ہی میرے پاپا چوہدری پر چڑھ دوڑیں گے۔ تمہیں ایسے وقت وہاں جانا چاہئے۔''

''پہلے میرے تمام جذبات' تمام توجہ صرف بلوری کے لئے تھی۔ اب دو طرف بٹ گیا ہوں۔ یہاں رہوں گا تو بلوری کی فکر رہے گی کہ پتہ نہیں' اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ وہ جیل میں کس طرح دن گزار رہی ہے؟ وہاں جاؤں گا تو تمہاری یادیں ستاتی رہیں گی۔ تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔''

''یہ سن کر اچھا لگ رہا ہے کہ میرے بغیر نہیں رہ سکو گے۔ مجھے بھی بلوری کی فکر ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہئے' وہ وہاں خیریت سے ہے یا نہیں؟ اس کے ساتھ کوئی مسئلہ تو نہیں ہو رہا ہے؟ اگر ایسا کچھ ہوا تو میرے پاپا اس کے لئے ضرور کچھ کر سکیں گے۔''

''ہاں۔ میں مجبور ہوں۔ چوہدری کی اجازت کے بغیر اس سے مل بھی نہیں سکتا۔ تمہارے پاپا ہی کسی طرح اس کی خیر خیریت معلوم کر سکتے ہیں۔''

شہناز اسے جیت لینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ اسی وقت ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرتے ہوئے بولی۔ ''میں ابھی پاپا سے کہتی ہوں' وہ اس کے بارے میں کچھ معلوم کر سکیں گے۔ اگر ملاقات کا کوئی راستہ نکلتا ہو تو تم فوراً ہی اس سے ملنے جاؤ گے۔ میں تمہیں نہیں روکوں گی۔''

اس نے شہناز کو بازوؤں میں لے کر بڑے جذبوں سے چومتے ہوئے کہا۔ ''تم بالکل ہی بدل گئی ہو۔ یہ ثابت کر رہی ہو کہ آئندہ ہم تینوں بہترین ازدواجی زندگی گزارتے رہیں گے۔''

رابطہ ہونے پر پہلے باپ بیٹی نے بات کی۔ پھر سلامت علی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''سلطان...! میں بہت خوش ہوں۔ تم نے میری بیٹی کو بالکل ہی چینج

کر دیا ہے، وہ نارمل ہو گئی ہے۔ بہت خوش رہنے لگی ہے۔"

وہ بولا۔ "شہناز اب صرف آپ ہی کی نہیں' میری بھی جان ہے' میری بھی زندگی ہے۔"

وہ بڑے پیار سے شہناز کو دیکھتے ہوئے فون پر بولا۔ "یہ ہنستی کھلکھلاتی ہے تو یہ دنیا بہت ہی خوبصورت دکھائی دینے لگتی ہے۔"

شہناز مسکراتی ہوئی اس کے سینے سے لگ گئی۔ دوسری طرف سے سلامت علی نے کہا۔ "تم میری شہناز کو جتنی خوشیاں دو گے' جتنا اس کا خیال رکھو گے' میں اُتنا ہی تمہارے کام آتا رہوں گا۔ یہ سن کر خوش ہو جاؤ کہ اگلے ہفتے تمہاری بلوری سے ملنے کا ایک راستہ نکال رہا ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "کیا آپ اس سے ملاقات کر سکیں گے؟ مگر کیسے کریں گے؟"

"یہاں سول کورٹ کے ایک جج مصلح الدین سے میرے گہرے مراسم ہیں۔ وہ اگلے ہفتے اپنی ایک ٹیم کے ساتھ جیل کا معائنہ کرنے جائے گا۔ تمہاری خاطر میں بھی اس کے ساتھ جاؤں گا اور وہاں بلوری سے باتیں کروں گا۔"

سلطان احمد نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میں کسی طرح مصلح الدین صاحب کے ساتھ وہاں جا سکتا ہوں؟ اپنی بلوری سے مل سکتا ہوں؟"

"جذباتی نہ بنو۔ تم بلوری سے ملنے کے لئے ایک ایڈووکیٹ کی حیثیت سے کئی بار وہاں جا چکے ہو۔ جیلر تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہے۔ پھر اسے یہ معلوم ہو چکا ہو گا کہ تم نے چوہدری دلاور حیات سے مخالفتیں مول لی ہیں۔ وہاں جاؤ گے تو وہ تم پر کڑی نظر رکھے گا۔ بلوری سے تنہائی میں ملنے نہیں دے گا۔ پھر چوہدری تک یہ بات پہنچا دے گا کہ تم اس قیدی لڑکی میں خاص دلچسپی لے رہے ہو۔"

وہ بڑے جوش میں آ کر وہاں جانا چاہتا تھا۔ سلامت علی کی باتیں سن کر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ درست کہہ رہا تھا۔ چوہدری کو ابھی اس کے اور بلوری کے معاملات سے بے خبر رہنا چاہئے تھا۔ اچانک ہی یہ انکشاف کرنا تھا کہ وہ قیدی عورت جیل کی چار دیواری میں رہ کر ماں بننے والی ہے۔ اچانک حملہ کیا جائے گا تو چوہدری اپنے بچاؤ کے لئے کچھ نہیں

کر پائے گا۔

سلامت علی نے کہا۔ "تم وہاں آرام سے شہناز کے ساتھ رہو۔ جس دن میں بلوری سے ملاقات کر کے آؤں گا' اسی دن فون پر اس کے مکمل حالات تمہیں بتاؤں گا۔ اسے کوئی پیغام دینا چاہتے ہو تو مجھے بتا دو۔"

"میں چاہتا ہوں' آپ میری بلوری کو یقین دلائیں' میں اس سے کسی لمحے بھی غافل نہیں رہتا۔ اس کی رہائی کے سلسلے میں آپ سب میری مدد کر رہے ہیں اور جلد ہی وہ جیل کی چار دیواری سے باہر آ کر میری دلہن بنے گی۔ یہ فیصلہ صرف میرا ہی نہیں' میری شہناز کا بھی ہے۔"

وہ فون پر بول رہا تھا اور شہناز کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اسے دیکھتے ہوئے ایسے مسکرا رہی تھی' جیسے ایک بچے کو بہلتے اور خوش ہوتے دیکھ رہی ہو۔

☆☆☆

بلوری کچھ بیمار رہنے لگی تھی۔ پاؤں بھاری ہونے کے ایک ہفتے بعد ہی ہلکا سا بخار آیا۔ وہ پنڈ کی رہنے والی دکھ بیماریاں جھیلنے کی عادی تھی۔ نزلہ بخار ہو تب بھی ٹھنڈے پانی سے گھر کے برتن اور کپڑے دھوتی تھی۔ کبھی بخار تیز ہو جائے' نزلہ پیچھا نہ چھوڑے تو ڈسپرین کی ایک گولی کھا لیتی تھی۔

ڈاکٹر سے علاج کرانے کے لئے شہر جانا پڑتا تھا۔ پنڈ میں ایک بڈھا حکیم تھا۔ ماں اس سے دوائی لے کر آتی تو انہیں تکیے کے نیچے رکھ لیتی۔ وہ کڑوی کسیلی دوائیں ہوتی تھیں۔ ماں سے نظریں بچا کر انہیں گھر سے باہر پھینک دیا کرتی تھی۔ بعض لوگ دواؤں سے بدکتے ہیں۔ بیماریوں میں لوٹ پوٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں مگر دوا کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ وہ بھی ایسی ہی ڈھیٹ ہو گئی تھی۔

جیل میں آ کر بھی بیمار ہوئی تھی۔ وہاں تقریباً تین سو قیدیوں کا علاج کرنے والا ایک ہی بوڑھا ڈاکٹر تھا۔ وہ جیل کے باہر ایک ناکام معالج تھا۔ اس کے باوجود اپنے پیشے میں رہ کر دولت کمانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے کلینک کے سامنے زنانہ و مردانہ پوشیدہ امراض کے نام لکھوا رکھے تھے۔ یہ دعویٰ کرتا تھا کہ اس کے علاج سے چند دنوں میں خواتین کے

مسائل حل ہوجاتے ہیں اور بوڑھے رفتہ رفتہ جوان ہوجاتے ہیں۔

دو چار شاطر عورتیں اس کی پاس آتی تھیں۔ وہ ایسی جوان لڑکیوں کو گھیر کر لاتی تھیں، جو عشق کی نادانیوں میں کنواری ماں بننے والی ہوتی تھیں۔ بڑی سے بڑی رقم دے کر اپنی اور اپنے خاندان کی عزت بچانا چاہتی تھیں۔ ایسی شادی شدہ عورتیں بھی آتی تھیں، جو کثرت اولاد سے تنگ آ کر مزید آنے والے بچوں سے نجات حاصل کرتی تھیں۔ نشہ کرنے والے مریض زیادہ آتے تھے۔ کیونکہ وہ دواؤں کے نام پر بڑی رازداری سے نشہ فروخت کرتا تھا۔

یوں اس نے اپنے کلینک کو مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کا اڈہ بنا لیا تھا۔ سب اسے "ڈاکٹر نو (No)" کہتے تھے۔ نو... یعنی نہیں... وہ ڈاکٹر تھا بھی اور نہیں بھی۔ عیاشی اسے وقت سے پہلے بوڑھا بناتی رہی۔ وہ دو بار مجرمانہ واردات میں گرفتار ہو چکا تھا۔ سزائیں بھی پاتا تھا۔ پھر جیل سے رہا ہونے کے بعد کسی دوسرے شہر میں جا کر وہی دھندہ شروع کر دیتا تھا۔ اب سے بارہ برس پہلے اس نے ایک جوان لڑکی کو قتل کیا تھا۔ تب سے اب تک عمر قید کی سزا پا رہا تھا۔

جیل میں اسے ایک بڑے سرکاری ڈاکٹر کا اسسٹنٹ بنایا گیا تھا۔ آٹھ برس بعد اس بڑے ڈاکٹر کا ٹرانسفر ہو گیا۔ پھر جیلر وغیرہ کی سفارش پر اسے وہاں کا ڈاکٹر مقرر کر دیا گیا۔ اب اس ناکام ڈاکٹر نو کے علاج سے قیدی اچھے ہوتے ہوں یا مزید بیمار ہو کر ہوسپٹل پہنچا دیئے جاتے ہوں۔ کوئی ان کا پرسان حال نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اس ڈاکٹر نو کا محاسبہ کرنے والا تھا۔

بلوری پہلی بار جیل میں آ کر بیمار ہوئی تو اسے ڈاکٹر نو کے پاس بھیجا گیا۔ وہ دبلا پتلا سا بوڑھا ڈاکٹر خود بھی بیمار دکھائی دیتا تھا۔ اس نے جیسے مدتوں کے بعد ایک حسین و جمیل لڑکی کو جیل میں دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی منہ کھل گیا۔ باچھوں سے رال ٹپکنے والی تھی۔ اس نے رومال اٹھا کر جلدی سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "آؤ بیٹھو۔"

وہ بیٹھ گئی۔ اس نے کہا۔ "ہاتھ لاؤ۔"

بلوری نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ اس کی کلائی تھام کر بولا۔ "جو بیمار لڑکیاں اپنا ہاتھ میرے

ہاتھوں میں دیتی ہیں، میں انہیں دیکھتے ہی دیکھتے صحت مند اور حسن و شباب کا جیتا جاگتا مجسمہ بنا دیتا ہوں۔"

پیچھے کھڑے ہوئے سپاہی نے جھک کر اس کے کان میں کہا۔ "بڈھے! باز آ جا۔ یہ منسٹر صاحب کی رکھیل ہے۔"

اس نے گھبرا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "میرا چالیس سال کا تجربہ ہے۔ نبض دیکھے بغیر بھی بیماری سمجھ لیتا ہوں۔ مجھے بتاؤ، کیا تکلیف ہے؟"

اس نے پھر اسے ہاتھ لگانے کی جرات نہیں کی تھی۔ مگر للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ بہت باتونی تھا۔ اپنی باتوں سے یہ تاثر دے رہا تھا کہ دیکھنے میں بوڑھا لگتا ہے۔ ورنہ ایسا تگڑا ایسا زبردست ہے کہ وہاں کے تگڑے قیدی اس سے پنجہ لڑا کر شرط ہار جاتے ہیں۔

وہ اس کے لئے دوائیں تیار کرتے وقت بھی بولتا رہا۔ "تم دراصل بیمار نہیں ہو، اندر سے دکھی ہو۔ میں اتنی دیر سے بول رہا ہوں اور تم چپ ہو۔ اگر یوں چپ چپ ہی رہو گی تو دکھ بڑھتا رہے گا۔"

اس نے دوائیں دیتے ہوئے اس کے قریب ذرا جھک کر کہا۔ "میرے پاس ہر دکھ کی دوا ہے، ہر درد کا علاج ہے۔ کوئی ایسی پریشانی ہو، جسے دوسروں سے نہ کہہ سکتی ہو تو مجھ سے کہو۔ میں تمہارے بڑے کام آؤں گا۔ کبھی آزما کر دیکھو۔"

وہ دوائیں لے کر وہاں سے چلی آئی۔ پھر انہیں کچرا دان میں پھینک دیا۔ ایک تو وہ دکھ بیماریوں کے معاملے میں پہلے ہی ڈھیٹ تھی۔ پھر بدترین حالات نے یہ سمجھا دیا تھا کہ نہ اس کا کوئی مسیحا ہے، نہ دکھ درد کی کوئی دوا ہے۔ اسے خود ہی صبر و تحمل سے، حوصلے سے اور ڈھٹائی سے زندگی گزارنی ہوگی۔

اب اس کا یہ فیصلہ کمزور پڑنے والا تھا۔ وہ ماں بننے والی تھی۔ بخار کی حالت بہت زیادہ کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے قریب جو بوڑھی عورت سوتی بیٹھتی تھی، اس کا نام جینا تھا۔ اسی نے پہلی بار اسے ٹٹول کر بتایا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس دن سے جینا اس کی رازدار بن گئی تھی۔ بلوری کو بیٹی مان کر جیل کی تمام عورتوں اور مردوں سے ماں بننے والی بات چھپا رہی تھی۔

وہ اسے تھپک کر بولی۔ ''تیرا بخار چڑھتا جا رہا ہے' آرام سے لیٹ جا۔ میں ٹھنڈے پانی کی پٹی ماتھے پر رکھتی رہوں گی تو بخار کم ہو جائے گا۔''

وہ چٹائی پر لیٹتے ہوئے بولی۔ ''مائی جینا...! میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ بڑی کمزوری لگ رہی ہے۔''

وہاں قیدی عورتوں کو ان کی مرضی کے مطابق سہولتیں میسر نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن بلوری اسپیشل تھی۔ اس کی فرمائش پر وہاں ایک واٹر کولر اور پلاسٹک کا ایک گلاس رکھا رہتا تھا۔ مائی جینا ایک کپڑا ٹھنڈے پانی میں بھگو کر اس کی پیشانی پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''لڑکی بن کر پیدا ہونا بہت بڑی بدنصیبی ہے۔ جوان ہونا' اس سے بھی بڑی بدنصیبی ہے اور کنواری ماں بننا تو بدنصیبی کی انتہا ہے۔ ابھی ابتدا ہے۔ پتہ نہیں' تیرے ساتھ آگے اور کیا ہوگا؟''

وہ آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''ماں بیمار ہو تو کیا بچے کو بھی نقصان پہنچتا ہے؟''

''اس کی فکر نہ کر' اسے کچھ ہوا بھی تو کیا فرق پڑے گا؟ دنیا کے بے شمار غریب اور لاوارث بچوں کے ساتھ پتہ نہیں کیا کچھ ہوتا رہتا ہے؟ اگر یہ بچہ رہ گیا تو ماں کی دکھ بیماریاں سہتے سہتے تیری کوکھ سے ڈھیٹ بن کر نکلے گا۔''

اس نے آنکھیں کھول کر مائی جینا کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ''ایسے نہ بولو... میں اسے پیدا کرنا چاہتی ہوں۔ بہت بڑا آدمی بنانا چاہتی ہوں۔''

''یہ خواب دنیا کی ہر ماں دیکھتی ہے۔ آبرو لٹانے والیاں بھی اپنے بچے کو بہت اچھا اور بہت بڑا آدمی بنانا چاہتی ہیں۔''

وہ بڑی نقاہت سے بولی۔ ''میں کبھی ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتی' کبھی دوا نہیں کھاتی۔ مگر اس ننھی سی جان کے لئے سوچ رہی ہوں' صبح تک طبیعت نہ سنبھلی تو ڈاکٹر سے دوا لوں گی۔''

مائی جینا نے اس کی طرف جھک کر دھیمی سی آواز میں کہا۔ ''ڈاکٹر کے پاس جانے کی حماقت نہ کرنا۔ وہ بوڑھا ڈاکٹر جوانی میں بہت ہی عیاش اور بدمعاش رہ چکا ہے۔ تجھے دیکھتے ہی سونگھ لے گا' نبض تھام کر بتا دے گا کہ تو ماں بننے والی ہے۔ کیا بھید کھولنا چاہتی ہے؟''

وہ انکار میں سر ہلانے لگی۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''تو بڑی ہمت والی ہے۔ جب تک برداشت کر سکتی ہے کرتی رہ۔ تیرے جیسی لڑکیاں لوٹ پوٹ کر اٹھ بیٹھتی ہیں۔ بیماریاں خود ہی بھاگ جاتی ہیں۔

اس نے اس پہلو سے سوچا ہی نہیں تھا کہ کسی دائی سے اور ڈاکٹر سے پیٹ نہیں چھپتا۔ وہ اس بوڑھے سزا یافتہ ڈاکٹر کے پاس جاتی تو وہ کم بخت اسے دیکھتے ہی بھانپ لیتا اور جیل کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کے ماں بننے کا ڈنکا پٹنے لگتا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''سوہنے ربّ کا شکر ہے... میں ایسی غلطی سے بچ گئی۔ جب تک پیٹ نہیں نکلے گا' بات نہیں کھلے گی۔ تب تک میں اس ڈاکٹر کا سامنا نہیں کروں گی۔''

چونکہ اس سے مشقت نہیں لی جاتی تھی۔ دوسری قیدی عورتوں کی طرح صبح لائن حاضر نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے اس کی بیماری کا کسی کو پتہ نہ چلا۔ دو دنوں تک بخار کبھی چڑھتا رہا' کبھی اترتا رہا۔ تیسرے دن وہ اٹھ بیٹھی۔ اگرچہ کمزوری تھی مگر برداشت کر رہی تھی۔ کسی حد تک چلنے پھرنے کی قابل ہو گئی تھی۔

دکھ بیماری میں اپنے بہت یاد آتے ہیں۔ اس کا سگا کوئی نہیں رہا تھا۔ ایسے وقت سلطان احمد اس کے اندر ایک نئے جذباتی اور خیالی رشتے کا سحر پھونک گیا تھا۔ اس کی قمیص میں سینے پر دل کے قریب جو جیب تھی' اس جیب میں پیار کی پائل اس کی دھڑکنوں سے لگی رہتی تھی۔ وہ دیوانہ اسے رہائی دلانے کی خاطر ایک مالدار لڑکی سے شادی کرنے والا تھا۔ اس کا تابعدار بن کر رہنے والا تھا۔ یعنی ہر قیمت پر ہر حال میں اسے مصائب سے نجات دلانے کا وعدہ کر چکا تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی' باہر وہ کیا کر رہا ہے؟ کن حالات سے گزر رہا ہے؟ اس کے پیار کے انداز نے اور دیوانگی نے یقین دلایا تھا' دل بھی دھڑک دھڑک کر کہتا تھا۔ ''وہ میرے عشق میں جنونی ہو چکا ہے۔ زبان کا دھنی ہے۔ تین ماہ بعد ضرور آئے گا۔ میرے حاملہ ہونے والی بات کو عدالت میں اچھالے گا۔ کمزور ہونے کے باوجود چوہدری جیسے پہاڑ سے ٹکرائے گا اور پہلی ہی پیشی میں مجھے رہائی دلا کر اس جیل سے باہر لے جائے گا۔''

برے حالات میں کسی کو جو سب سے مضبوط سہارا ملتا ہے' وہ محبت کا ہوتا ہے' اعتماد کا

ہوتا ہے۔ اسے سلطان احمد پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ اسی کے سہارے جیل کی چار دیواری میں رہ کر کھلی فضاؤں کی خواب دیکھتی رہتی تھی۔ دل بہلتا رہتا تھا اور وقت گزرتا جارہا تھا۔ ایک ماہ بعد جیلر کی طرف سے تمام قیدیوں تک یہ اطلاع پہنچائی گئی کہ کل صبح ایک مجسٹریٹ مصلح الدین معائنے کے لئے تشریف لارہے ہیں۔ صبح کا گجر بجتے ہی تمام قیدی اٹھ کر غسل کریں گے۔ صاف ستھرے کپڑے پہنیں گے۔ جیل کے قواعد اور اصولوں کے مطابق پوری طرح ڈسپلن کا مظاہرہ کریں گے۔

بلوری نے پریشان ہو کر مائی جینا سے پوچھا۔ ''کیا وہ مجسٹریٹ میرا بھی معائنہ کرے گا؟''

''ارے کچھ نہیں ہوگا... بڑے بڑے سرکاری افسر بس ایسے ہی معائنے کے لئے' خانہ پری کے لئے آتے ہیں۔''

''یہاں کی عورتیں کہہ رہی تھیں' جو سرکاری افسران ادھر آتے ہیں' وہ جوان عورتوں سے دلچسپی لیتے ہیں۔ بڑی لگاوٹ سے باتیں کرتے ہیں۔ وی آئی پی رجسٹر میں جیل کی نیک نامی اور بہترین کارکردگی کی رپورٹ لکھنے سے پہلے رشوتیں وصول کرتے ہیں۔ کوئی جوان عورت نگاہوں میں سما جائے تو اسے بھی وصول کر لیتے ہیں۔''

مائی جینا نے کہا۔ ''سب ہی ایسے نہیں ہوتے۔ تجھے کس بات کا ڈر ہے؟ تو چوہدری صاحب کی چیز ہے۔ کوئی تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔''

اسے ایک ذرا اطمینان ہوا۔ چوہدری جیسے دشمن کی نامہربانیاں' بعض حالات میں مہربانیاں بن جاتی تھیں۔ وہ جیل کی صعوبتیں نہیں اٹھا رہی تھی۔ اس کی ضرورت کی ہر چیز مہیا کر دی جاتی تھی۔ ایک حاکم نے اس کے مقدر میں لکھ دیا تھا۔ ''جملہ حقوق محفوظ ہیں۔'' لہٰذا نہ کوئی اسے ہاتھ لگا سکتا تھا' نہ بری نیت سے دیکھ سکتا تھا۔

دوسرے دن سول کورٹ کا مجسٹریٹ مصلح الدین معائنے کے لئے آیا۔ عدالت کا ایک پیش کار اور ایک منشی اس کے ساتھ تھا۔ سلامت علی بھی یاری دوستی میں ساتھ چلا آیا تھا۔ اس نے مجسٹریٹ سے کہا تھا۔ ''میرے ایک وفادار ملازم کی عزیزہ جیل میں ہے۔ اس کا نام بلوری ہے۔ اس کے رشتہ داروں کو ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے' نہ ہی کسی کی لکھی

ہوئی چٹھی اس کے پاس پہنچائی جاتی ہے۔ میں اس سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

مجسٹریٹ مصلح الدین نے کہا۔ ''پھر تو اس لڑکی کی کوئی اہمیت ہوگی۔ تب ہی ایسی کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔''

اس مجسٹریٹ سے حقائق چھپائے نہیں جاسکتے تھے۔ لہٰذا سلامت علی نے بلوری اور چوہدری کی پوری داستان سنادی۔ تمام روداد سننے کے بعد مجسٹریٹ نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے سیاستدان ایک کمزور لڑکی کی آبرو لوٹیں یا قومی خزانہ لوٹتے رہیں' کوئی ان کا محاسبہ کرنے والا نہیں ہے۔ میں اپنے ملک کی چھوٹی سی عدالت کا مجسٹریٹ ہوں۔ بڑی بڑی عدالتوں کے چیف جسٹس اور بار کے وکلاء ان کے خلاف کچھ نہیں کر پاتے۔''

اسے بلوری سے ہمدردی ہوگئی تھی۔ وہ وعدہ کرتے ہوئے بولا۔ ''جب میں قیدی عورتیں سے باتیں کروں تو تم ایسے وقت بلوری کو ایک طرف لے جا کر اس سے باتیں کر سکتے ہو۔''

دوسری طرف بلوری دعائیں مانگ رہی تھی۔ ''میرا سلطان کسی بہانے سے کوئی راستہ نکال کر معائنہ کرنے والوں کے ساتھ آجائے۔ رب کرے کسی بھی طرح آجائے۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے' تین ماہ سے پہلے بھید کھل گیا تو میں کچھ نہیں کر پاؤں گی۔ وہ کم بخت میرے بچے کو مار ڈالے گا۔ اس طرح اس پر تو کوئی آنچ نہیں آئے گی مگر میری رہائی کا راستہ پتہ نہیں پھر کتنی مدت کے لئے بند ہو جائے گا؟''

مجسٹریٹ اپنی ٹیم کے ساتھ جیل کے مختلف حصوں میں جارہا تھا۔ جو قیدی ہنر مند تھے' ان سے ترکھان اور قالین بافی وغیرہ کا کام لیا جارہا تھا۔ وہ لوگ قالین بنانے کے علاوہ میز کرسیاں اور طرح طرح کے فرنیچر تیار کررہے تھے۔ مجسٹریٹ کو دینی تعلیمات کا شعبہ بھی دکھایا گیا۔

جیل میں یوں بھی نمازیوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جو ہنر مند نہیں ہوتے تھے اور محنت ومشقت کے عادی بھی نہیں ہوتے تھے۔ ان نکموں سے جھاڑو پونچھے اور ٹوائلٹ کی صفائی کا کام لیا جاتا تھا۔ انہیں جیل خانے کا مہتر اور بھنگی کہا جاتا تھا۔ وہ بدبو اور غلاظتوں سے بچنے کے لئے پانچوں وقت کے نمازی بن جایا کرتے تھے۔

وہاں قیدی عورتوں کے لئے درجنوں سلائی مشینیں تھیں۔ وہ سلائی کڑھائی کا کام کیا کرتی تھیں۔ اس روز بلوری کو بھی وہاں کام کرنے کے لئے بٹھا دیا گیا۔ وہ بڑی حد تک سینا پرونا جانتی تھی۔ ان کام کرنے والیوں میں شامل ہوگئی۔ جب مجسٹریٹ اپنی ٹیم کے ساتھ اس شعبے میں آیا تو وہ ایک ایک فرد کا منہ تکنے لگی' مایوس ہونے لگی۔ آنے والوں میں اس کا سلطان احمد نہیں تھا۔ ان کے ساتھ جیل کا اسٹاف بھی تھا۔ مجسٹریٹ ان سے قیدیوں کے بارے میں کوئی نہ کوئی سوال کرتا تھا۔ جو اچھی کارکردگی دکھاتے تھے' ان کے نام بھی پوچھتا رہتا تھا۔

اس سلائی گھر میں مجسٹریٹ کے علاوہ سلامت علی بھی ان عورتوں کی کارکردگی کے متعلق سوالات کر رہا تھا اور ان کے نام پوچھتا جا رہا تھا۔ بلوری کسی سلائی مشین پر نہیں تھی۔ بٹن کے کاج بنانے کے لئے دوسری عورتوں کے ساتھ فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اگرچہ فرش پر بیٹھ کر معمولی کام کرنے والیوں کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی تھی۔ پھر بھی مجسٹریٹ اور سلامت علی کی نگاہیں کئی بار بلوری کی طرف گئیں۔ وہ روپ رنگ اور چہرے کے نقوش کے اعتبار سے دوسروں سے مختلف تھی۔ سلامت علی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا پھر بولا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پھر بولی۔ ''بلوری...!''

آخر وہ مل ہی گئی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''کم بخت بہت ہی زبردست ہے۔ انارکلی کے حسن کے متعلق کہا گیا تھا کہ شہنشاہ اس کی خاطر تخت.... اور سپاہی اپنی تلوار چھوڑ سکتا ہے۔ ہمارے جیسے سیاستدان اس کی خاطر اپنی پارٹی اور پٹڑی بدل سکتے ہیں۔''

اس نے پوچھا۔ ''جیل میں کب سے ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''مجھے اپنی بدنصیبی کی تاریخ یاد نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے' ماں کے پیٹ سے نکل کر یہاں آ گئی تھی۔ اب کبھی کھلا آسمان نہیں دیکھ سکوں گی۔''

سلامت علی نے ہاتھ کے اشارے سے ایک طرف چلنے کو کہا۔ پھر اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ ''میں زیادہ لمبی بات نہیں کر سکوں گا۔ جیل کا اسٹاف ہمارے آس پاس ہے۔ بس اتنا سمجھ لو' ایڈووکیٹ سلطان احمد میرا خاص وکیل ہے۔ اس نے پیغام دیا ہے کہ ایک

ماہ گزر چکا ہے اور دو ماہ رہ گئے ہیں۔ وہ کوئی ذریعہ اختیار کر کے یہاں آنا نہیں چاہتا۔ آئے گا تو وہ دشمن چوہدری بدک جائے گا۔ تم پر اور ہم پر شبہ کرنے لگے گا۔''

اس کی دعا قبول ہوگئی تھی۔ سلطان احمد خود تو نہیں آیا تھا۔ مگر اس نے اپنا ایک قاصد بلوری کے پاس بھیج دیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے حاوی ہونے والی مایوسی ایکدم سے ہوا ہو گئی تھی۔ وہ خوش ہو کر سن رہی تھی۔ وہ بول رہا تھا۔ ''تم حوصلہ رکھو' آج اگست کی پہلی تاریخ ہے۔ اگلے ماہ ستمبر کی تیس تاریخ کو میں تمہارے بارے میں ایکشن لوں گا۔ تمہارے سلسلے میں انکوائری کراؤں گا۔ تب یہ بھید کھولا جائے گا کہ تم ماں بننے والی ہو۔ ہماری پارٹی کے لیڈر اور ان کے وکلاء تمہیں خصوصی نگرانی میں رکھنے کا مطالبہ کریں گے اور تم پر ظلم نہیں ہونے دیں گے۔ اس طرح تمہارے بچے کو ضائع نہیں کیا جا سکے گا۔''

وہ ذرا چپ ہوا پھر اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے چہرے سے خوشی اور احسان مندی ظاہر ہو رہی ہے۔ پہلے کی طرح سنجیدہ اور مایوس رہو۔ یوں منہ بنا کر یہاں سے جاؤ' جیسے میری کوئی بات تمہیں پسند نہیں آئی ہے۔ بعد میں میرے حوالے سے کہہ سکتی ہو کہ میں خواہ مخواہ تم سے دلچسپی لے رہا تھا۔''

وہ اس کی ہدایت کے مطابق عمل کرنے لگی۔ ناگواری سے منہ بنا کر وہاں سے چلتی ہوئی آ کر عورتوں کے درمیان فرش پر بیٹھ گئی۔ پھر سوئی دھاگہ لے کر ایک قمیص میں کاج بنانے لگی۔ مجسٹریٹ کے ساتھ کھڑا ہوا اسسٹنٹ جیلر اسے دیکھ رہا تھا۔ جب مجسٹریٹ اپنی ٹیم کے ساتھ واپس چلا گیا تو اس نے جیلر کے سامنے بلوری کو بلا کر پوچھا۔ ''سلامت علی تم سے کیا کہہ رہا تھا؟''

بلوری نے انجان بن کر پوچھا۔ ''کون سلامت علی؟ یہاں کوئی قیدی کسی عورت سے بات نہیں کرتا ہے۔ میرے پاس تو کوئی سلامت علی نہیں آیا تھا۔''

جیلر نے کہا۔ ''کسی قیدی کا نام سلامت علی نہیں ہے۔ بلکہ مجسٹریٹ کے ساتھ جو شخص آیا تھا اور تمہیں ایک طرف لے جا کر باتیں کر رہا تھا۔ ہم اس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔''

وہ ناگواری سے بولی۔ ''سب ہی مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہ مجھ سے اور کیا

باتیں کرے گا؟ جب میری خوبصورتی اور جوانی کی تعریفیں کرنے لگا اور کہنے لگا کہ مجھے جیل سے نکال کر اپنی حویلی میں رکھے گا‘ تب میں ناگواری سے منہ پھیر کر چلی آئی۔ اگر وہ مجسٹریٹ کا کوئی خاص بندہ ہے تو ہوا کرے“۔

جیلر نے کہا۔ ”وہ اپوزیشن کا ایک بہت بڑا سیاسی لیڈر رہا ہے۔ تین برس پہلے منسٹر رہ چکا ہے۔ تم نے چوہدری صاحب کے بارے میں کوئی بات تو نہیں کی ہے؟“

”میں خواہ مخواہ چوہدری صاحب کی باتیں کیوں کروں گی؟ اگر وہ میرے چوہدری صاحب کے بارے میں کوئی بات کرتا تو اسے کھری کھری سنا دیتی۔“

جیلر اس کی باتوں سے مطمئن ہو گیا۔ جب وہ واپس اپنے کمرے میں آئی تو بہت خوش تھی۔ سلامت علی کی باتوں سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ سلطان احمد نظروں سے دور ہونے کے باوجود دن رات اس کی رہائی کے لئے کوششیں کر رہا ہے۔ سلامت علی جیسے اپوزیشن پارٹی کے بہت بڑے لیڈر نے اسے حوصلہ دیا تھا کہ دو مہینے رہ گئے ہیں۔ اگلے مہینے کی آخری تاریخ تک اس کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے گا۔

سلامت علی اس رات اپنی حویلی میں بیٹھ کر خوب پیتا رہا اور سوچتا رہا۔ ”اقتدار کی کرسی میں جتنی کشش ہے‘ اتنی ہی بلوری میں ہے اور وہ کم بخت چوہدری دلاور حیات دونوں پر ہاتھ صاف کر رہا ہے۔“

نشے کی حالت میں وہی اسے دکھائی دے رہی تھی۔ کبھی آ رہی تھی‘ کبھی جا رہی تھی۔ کبھی مستی میں جھوم کر رقص کر رہی تھی اور اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔

سلامت علی کو اپنی بیٹی شہناز سے بہت محبت تھی۔ اسے جی جان سے چاہتا تھا۔ صبح جب نشہ اترا۔ تب اس نے سوچا۔ ”اگر میں بلوری کو چوہدری سے چھین لینے کے لئے جیل سے نکال لوں گا تو میری بیٹی کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ شہناز اسے سوکن بنانے کا جھوٹا وعدہ کر چکی ہے۔ اسے یقین ہے کہ میں بلوری کو جیل سے باہر نہیں آنے دوں گا۔ مجھے بیٹی کی خاطر اپنے شوق کو مارنا ہوگا۔ بلوری جیسی حسینائیں کہیں بھی مل سکتی ہیں۔ مگر بیٹی نہیں ملے گی۔ وہ ایک ہی ہے۔ اس کی ماں آئندہ اولاد پیدا کرنے کی قابل نہیں رہی ہے اور میں دوسری شادی نہیں کروں گا۔ مجھے صرف اپنی بیٹی کے بارے میں سوچنا چاہئے۔“

اس نے جیل سے آنے کے بعد فون کے ذریعے سلطان احمد سے کہہ دیا تھا کہ بلوری خیریت سے ہے۔ یہ سن کر خوش ہو رہی تھی کہ ٹھیک دو ماہ بعد اس کے بارے میں ایکشن لیا جائے گا اور اسے جیل سے رہا کرانے کی بھرپور کوششیں کی جائیں گی۔

سلطان احمد گن گن کر دن گزار رہا تھا۔ اگرچہ شہناز کے ساتھ بہترین رومانی اور جذباتی لمحات گزر رہے تھے۔ دنیا بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ موجودہ حالات یقین دلا رہے تھے کہ وہ ساری زندگی اسی طرح عیش و عشرت میں گزار سکتا ہے۔ مگر جو دیوانے ہوتے ہیں‘ وہ محبت کے ویرانے چاہتے ہیں۔ ہنستی کھیلتی محفلوں میں ان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔

وہ اپنے اندر کے عشقیہ جذبات کو شہناز سے چھپاتا تھا۔ ورنہ حقیقت یہی تھی کہ وہ اس کے قریب رہ کر بھی اس سے دور اپنی بلوری کے بالکل قریب پہنچ جایا کرتا تھا۔ یوں دیکھا جائے تو وہ شہناز کے اعتماد کو دھوکہ دے رہا تھا۔ مگر نادان نہیں تھا۔ یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک سیاستدان کی بیٹی سے کھیل رہا ہے۔ وہ سرپھری مغرور لڑکی بھی اس سے کھیل رہی ہے۔ کسی بھی دن اپنے سیاستدان باپ کی طرح پٹڑی بدل سکتی ہے۔

دوسرا مہینہ بھی گزر گیا۔ بلوری بڑی سہمی ہوئی زندگی گزار رہی تھی۔ کئی بار بیمار ہو چکی تھی۔ تیسرے مہینے بیمار ہوئی تو کچھ ایسے مسائل پیدا ہوئے جو ایام حمل کے ابتدائی مرحلوں میں پیش آتے ہیں۔ ڈاکٹر سے رجوع کرنا اور علاج کرانا ضروری ہو گیا تھا۔

جیل خانے کا وہ بوڑھا اگرچہ ایک ناکام ڈاکٹر تھا۔ لیکن عورتوں کے امراض کو اور ان کے مسائل کو خوب سمجھتا تھا۔ مائی جینا نے پریشان ہو کر کہا۔ ”دھی رانی...! میں تیرا حوصلہ دیکھ رہی ہوں۔ مگر اب یہاں حوصلے سے بھی کام نہیں چلے گا۔ علاج بہت ضروری ہو گیا ہے۔ وہ خبیث ڈاکٹر تیری مشکل آسان کر سکتا ہے۔ اس سے علاج نہیں کرائے گی تو اندر جو خرابی ہے‘ وہ بڑھتی چلی جائے گی۔ یہاں کی قیدی عورتیں تیری بیماری کو تاڑ رہی ہیں۔ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہیں اور آپس میں کھسر پھسر کرتی رہتی ہیں۔“

بلوری نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔ ”مائی جینا! میری سمجھ میں نہیں آتا‘ میں کیا کروں۔ اس بوڑھے سے علاج نہیں کراؤں گی‘ تب بھی بھید کھلنے ہی والا ہے۔ یہاں کی عورتوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا ہے۔ شاید میری تکلیف کو سمجھ رہی ہیں۔ آج نہیں تو

کل...میری بیماری کی خبر جیلر تک ضرور پہنچائیں گی۔"

مائی جینا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔"سلامت علی نے تجھ سے کہا تھا' اس مہینے کی آخری تاریخ تک تیرا مسئلہ اٹھایا جائے گا۔ابھی تین ہفتے باقی ہیں۔اس بوڑھے ڈاکٹر کو کسی بھی طرح اپنا رازدار بنانا ہی ہوگا۔"

ڈاکٹر نو سے رجوع کرنا گویا خطرہ مول لینے والی بات تھی۔وہ دونوں بڑی دیر تک اس مسئلے پر تبادلہ خیال کرتی رہیں۔آخر اسی نتیجے پر پہنچیں کہ ایک خبیث ڈاکٹر پر بھروسہ نہیں کیا جائے گا تو آس پاس رہنے والی عورتیں اس کے پیٹ میں چھپے ہوئے راز تک پہنچ جائیں گی۔دوسری صبح بلوری نے جیلر تک خبر پہنچائی کہ وہ بیمار ہے۔ڈاکٹر سے ملنا چاہتی ہے۔مائی جینا نے بھی اپنی بیماری کا بہانہ کیا۔اس طرح ان دونوں کو ڈاکٹر کے پاس جانے کی اجازت مل گئی۔

جیل کے شفا خانے میں بیمار عورتوں اور مردوں کی لائن لگی رہتی تھی۔بلوری چونکہ وی آئی پی قیدی تھی۔اس لئے لائن میں لگنا ضروری نہیں تھا۔اسے دیکھتے ہی ڈاکٹر کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے کہا۔"آؤ بلوری!یہاں بیٹھو۔بتاؤ...کیا تکلیف ہے؟"

ڈاکٹر ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ایک ایک مریض کو بلا کر ان کا معائنہ کرتا تھا اور دوائیں لکھ کر دیتا تھا۔بلوری نے کھڑکی کے باہر مریضوں کی بھیڑ دیکھی۔وہاں مائی جینا بھی کھڑی ہوئی تھی۔اس نے کہا۔"میرے ساتھ مائی جینا آئی ہے۔اسے بلاؤ۔پھر میں اپنی تکلیف بیان کروں گی۔"

وہ بولا۔"اسے بلانا کیا ضروری ہے؟جو بات ہے' مجھ سے کہو۔ڈاکٹر میں ہوں مائی جینا نہیں ہے۔"

"بات کچھ ایسی ہے کہ مائی جینا میری تکلیف بیان کرے گی' میں کچھ نہیں بولوں گی۔"

ڈاکٹر نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔پھر سپاہی سے کہا۔"باہر مائی جینا کھڑی ہے۔اسے اندر بھیجو۔"

سپاہی وہاں سے چلا گیا۔ڈاکٹر نے اس کی گوری گوری کلائیوں کی طرف اپنا ہاتھ

بڑھاتے ہوئے کہا۔"مجھے نبض تو دیکھنے دو۔"

وہ فوراً ہی پیچھے ہٹ گئی۔اس نے پوچھا۔"کیا ہوا؟تم بیمار ہو مجھ سے علاج کرانے آئی ہو۔پھر کیوں اس طرح کترا رہی ہو؟"

اس نے پریشان ہو کر دروازے کی طرف دیکھا۔اسی وقت مائی جینا اندر آگئی۔ڈاکٹر کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئی پھر بولی۔"ڈاکٹر...!میں نے بلوری کو اپنی دھی بنایا ہے۔تمہیں یہ کیسی لگتی ہے؟"

وہ مسکرا کر بلوری کو دیکھتے ہوئے بولا۔"کیا بتاؤں' یہ کیسی لگتی ہے؟میں نے آج تک جیسی لڑکی نہیں دیکھی' یہ ویسی ہی لگتی ہے۔مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟جو بات ہے' صاف صاف بولو۔"

مائی جینا نے کہا۔"بلوری یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ اس پر کوئی مصیبت آئے تو کیا تم اس کا ساتھ دو گے؟"

وہ کرسی پر سیدھا ہو کر سینہ تان کر بولا۔"ربّ دی سوں...!اس پر کوئی بھی مصیبت آئے گی تو میں جی جان سے اس کا ساتھ دوں گا۔"

بلوری نے پوچھا۔"کیا تم ایک مرد کی زبان سے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کر رہے ہو؟"

وہ الجھ کر کبھی بلوری کو اور کبھی مائی جینا کو دیکھنے لگا۔اس کے اندر بیٹھا ہوا شیطان کہہ رہا تھا۔"ضرور کوئی خاص معاملہ ہے۔اس لئے گھما پھرا کر باتیں کی جارہی ہیں۔"

اس نے پھر ایک بار سینہ تان کر کہا۔"آزما کر دیکھ لو' میں ہر حال میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

مائی جینا نے کہا۔"تو پھر اس کا معائنہ کرو۔"

پھر وہ بلوری سے بولی۔"جا بیٹی!پارٹیشن کے پیچھے چلی جا۔"

وہاں کمرے میں ایک طرف بڑا سا پردہ لگایا گیا تھا۔جس کے پیچھے عورتوں کا معائنہ کیا جاتا تھا۔بلوری اس پردے کے پیچھے جا کر ایک اسٹریچر بیڈ پر لیٹ گئی۔ڈاکٹر وہاں آیا تو وہ اپنی تکلیف بیان کرنے لگی۔اس نے تھوڑی دیر تک اس کا معائنہ کیا۔جبکہ وہ بہت

ہی پہنچا ہوا گھاگھ ڈاکٹر تھا۔ یہ سمجھ گیا تھا کہ وہ حاملہ ہے اور تیسرے مہینے کا حمل ہے۔ اس کے باوجود اسے ادھر ادھر سے چھو رہا تھا۔ چھونے کے بہانے اس کے بدن کو سہلا رہا تھا۔

وہ اس کی نیت کو سمجھ رہی تھی۔ اٹھ کر بیٹھ گئی وہ بڑی خباثت سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اچھا تو یہ بات ہے۔ تم پچھلے دو تین ماہ سے اپنا حمل چھپا رہی ہو؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں۔ مائی جینا کے پاس چلو۔ وہیں باتیں ہوں گی۔''

وہ اسٹریچر بیڈ سے اترنا چاہتی تھی۔ اس نے ہاتھ تھام کر کہا۔ ''میری جان...! اس بچے کو راز میں رکھنے کا مطلب کیا ہے؟ ویسے میں بہت کچھ سمجھ سکتا ہوں۔ نادان نہیں ہوں۔ پھر بھی تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔''

وہ اپنا ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی۔ وہ اسے اور مضبوطی سے تھام کر بولا۔ ''میرے ہاتھوں میں رہو گی تو بھلا ہوگا۔ ورنہ پتہ نہیں کیا ہونا چاہئے اور کیا ہو جائے گا؟''

مائی جینا نے پردے کے پیچھے آ کر کہا۔ ''ڈاکٹر! تم آرام سے بیٹھ کر بھی باتیں کر سکتے ہو؟''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''اے بڑھیا! تُو ہمارے درمیان بولنے والی کون ہوتی ہے؟''

بلوری نے پریشان ہو کر کہا۔ ''ڈاکٹر! ابھی تم نے وعدہ کیا تھا' مصیبت میں میرے کام آؤ گے۔ مائی جینا میری ماں ہے۔ اسے غیر نہ سمجھو۔ میں تمہیں ربّ کا واسطہ دیتی ہوں۔ میرے کام آؤ۔ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتی مگر عمر بھر دعائیں دیتی رہوں گی۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہ جو مجھے عمر قید کی سزا ملی ہے' کیا تمہاری دعاؤں سے سزا بدل جائے گی؟ مجھے رہائی مل جائے گی؟''

وہ مایوس ہو کر رونے کے انداز میں بولی۔ ''میں اور کیا کر سکتی ہوں؟ اگر تم میرے رازدار نہیں بنو گے' یہ بھید کھولو گے تو میں زندہ نہیں رہوں گی۔ اپنے بچے کے ساتھ مر جاؤں گی۔''

ڈاکٹر کے منہ میں دانت نہیں تھے۔ پیٹ میں آنت نہیں تھی۔ مگر خواہشات شیطان کی آنتوں کی طرح دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ پوپلے منہ سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میری جان! مرنے کی باتیں نہ کرو۔ میں تمہارے کام آؤں گا۔ مگر معلوم تو ہو' بچے کو کب تک چھپانا چاہتی ہو؟ جلد ہی تمہارا پیٹ ماں بننے کا اشتہار بن جائے گا۔ ابھی بچہ دانی

میں مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ میں دوائیں دوں گا۔ انجکشن لگاؤں۔ پھر توانائی کے لئے دوائیں دوں گا تو تمہاری طبیعت سنبھلتی رہے گی مگر یہ بات چھپنے والی نہیں ہے۔''

وہ بولی۔ ''میں صرف تین ہفتوں تک چھپانا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد بھید کھل جائے' کوئی بات نہیں۔''

وہ خرانٹ بوڑھا اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں' تم اپنے بچے کی سلامتی چاہتی ہو۔ دو چار ہفتے اور گزر جائیں گے تو ابارشن نہیں ہو سکے گا' بچہ گرایا نہیں جا سکے گا۔''

اس نے مائی جینا کو دیکھا پھر کہا۔ ''مگر یہ جیل کے قانون کے خلاف ہے۔ اگر یہ بات باہر تک جائے گی تو جیلر کا قانونی محاسبہ ہوگا اور اس ناجائز بچے کے باپ کا نام سامنے آئے گا۔ چوہدری صاحب اور جیلر کبھی یہ نہیں چاہیں گے۔''

مائی جینا نے کہا۔ ''وہ نہیں چاہیں گے۔ بچے کو جبراً ختم کیا جائے گا تو بلوری کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ جیل میں مرے گی تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بتا دے گی کہ اس کے ساتھ کیا کچھ ہوا تھا؟''

ڈاکٹر نے اسے گھور کر کہا۔ ''بڑھیا! تُو نے اسے قانون سکھایا ہے۔ یہ تیری باتوں پر چل رہی ہے اور اپنی جان کو مصیبت میں ڈال رہی ہے۔''

بلوری نے جلدی سے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اتنا سا قانون میں بھی جانتی ہوں کہ جیل میں کسی عورت کو حاملہ نہیں ہونا چاہئے اور کسی بھی وجہ سے اس کی موت واقع نہیں ہونی چاہئے۔ اگر کسی قیدی عورت کا مرض لاعلاج ہے تو اسے ہوسپٹل میں رکھ کر باقاعدہ ڈاکٹروں کی رپورٹ حاصل کرنی پڑتی ہے۔ تاکہ اس کی موت ہو تو جیلر پر کوئی عذاب نہ آئے۔''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''تم دونوں ہی قانون بگھار رہی ہو۔ اگر بیمار نہ پڑتیں تو کبھی میرے پاس نہ آتیں۔ مجھے یہ بھید معلوم نہ ہوتا۔ میں تمہارا رازدار بن سکتا ہوں۔ مگر جانتی ہو' جب بھید کھلے گا اور مجھ سے پوچھا جائے گا کہ میں نے یہ بات کیوں چھپائی تھی تو میرے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ عمر قید تو ہو ہی چکی ہے۔ مزید سخت سزائیں دی جائیں

گی۔کیا میں اس عمر میں سزائیں برداشت کرسکوں گا؟"

مائی جینا مایوس ہورہی تھی اور بلوری پریشان ہورہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر اس نے کہا۔"ڈاکٹر! میں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ میرا ساتھ دو گے تو تم بھی مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ تمہارا بھی محاسبہ کیا جائے گا۔ یا میرے مولا! میں کیا کروں؟ اگر میرے بچے کو کچھ ہوگا اور مجھے رہائی نہیں ملے گی تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔"

یہ کہہ کر وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ ڈاکٹر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ پھر اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔"تم رو رہی ہو۔ مجھے بہت دکھ ہورہا ہے۔ پلیز۔ آنسو پونچھ لو۔ میں سوچتا ہوں کہ تمہارے لئے کیا' کیا جاسکتا ہے؟"

وہ تینوں پارٹیشن سے باہر آگئے۔ ڈاکٹر نے کرسی پر بیٹھ کر ایک کاغذ پر دوائیں لکھتے ہوئے کہا۔"میں ابھی انجکشن لگارہا ہوں۔ پھر ان دواؤں سے تمہیں آرام آجائے گا۔ آرام آئے' تب بھی بیماری کا بہانہ کرکے کل یہاں چلی آنا۔ تب میں سوچ کر بتاؤں گا' تمہارے لئے کیا کرسکتا ہوں؟"

اس نے نسخہ لکھ کر کمپاؤنڈر کو دیا۔ پھر اپنی الماری میں سے ایک انجکشن نکال کر بلوری کو لگاتے ہوئے کہا۔"تمہارے بازو بہت چکنے ہیں' تم سر سے پاؤں تک چکنی ہو۔ زندگی میں پہلی بار سوچ رہا ہوں اور الجھ رہا ہوں کہ تمہارے لئے کیا کرسکتا ہوں اور تم میرے لئے کیا کرسکتی ہو؟ یہ یاد رکھو...! کل تم یہاں آؤ گی اور کل تک میری زبان بند رہے گی۔ میں اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر سوچنے کے بعد ہی تمہارے کام آسکوں گا۔"

وہ دونوں اس شفاخانے سے باہر آگئیں۔ مائی جینا نے کہا۔"تُو کوٹھری میں جا۔ دوائیں کھا کر آرام کر۔ مجھے تو مشقت کے لئے جانا ہے۔"

بلوری نے پوچھا۔"تمہارا کیا خیال ہے' یہ بوڑھا ڈاکٹر ہمارا رازدار بن کر رہ سکے گا؟ مجھے جہاں تک معلوم ہے' اس خبیث نے کبھی کسی کے ساتھ نیکی نہیں کی اور ہم نے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ یہ ہمارا ساتھ دے گا تو بعد میں اس پر بھی الزام آئے گا۔ ہمیں اسے رازدار نہیں بنانا چاہئے تھا۔"

"مجبوری تھی۔ تیری حالت بہت ہی خراب ہوگئی تھی۔ یہاں تو آنا ہی تھا۔ اس کم بخت کو رازدار بنانا ہی تھا۔ ہم سے غلطی ہوئی بھی ہے اور نہیں بھی ہوئی۔ ہم حالات سے مجبور ہیں۔ تُو جا... شام کو باتیں ہوں گی۔"

مائی جینا کام کرنے کے لئے اس باورچی خانے کی طرف چلی گئی' جہاں جیل کے اسٹاف کے لئے کھانا پکایا جاتا تھا۔ قیدیوں کے کھانے پکانے کے لئے الگ باورچی خانہ تھا۔ وہاں مرد قیدی کام کیا کرتے تھے۔

بلوری آہنی سلاخوں کے پیچھے اپنی کوٹھری میں آگئی۔ وہ پچھلی رات سے پریشان تھی۔ اچھی طرح سو نہیں پائی تھی۔ اب دوائیں کھا کر سونا چاہتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر کی باتوں نے اسے الجھا دیا تھا۔ عقل سمجھا رہی تھی' وہ اس کا رازدار بن کر اپنے لئے مصیبتیں مول نہیں لے گا۔ اس نے فی الحال یہ کہہ کر ٹال دیا ہے کہ کل تک زبان بند رکھے گا۔

جیلر بلوری کا خاص خیال رکھتا تھا۔ وہ اس سے اجازت لے کر ڈاکٹر سے ملنے گئی تھی۔ یہ جانتی تھی کہ جیلر اس بڈھے سے ضرور معلوم کرے گا کہ بلوری کو کیا تکلیف ہے؟

پھر وہی سوال ستا رہا تھا۔"کیا ڈاکٹر میرے کام آئے گا؟ کیا اگلے تین ہفتوں تک میرا رازدار بن کر رہ سکے گا؟"

کوئی جان بوجھ کر اپنا نقصان نہیں کرتا اور نہ ہی کسی مصیبت کو دعوت دیتا ہے۔ اس ڈاکٹر کو بلوری کی مدد کرکے نہ تو دولت ملنے والی تھی' نہ وہاں سے رہائی... پھر بھلا وہ اس کے کام کیوں آتا؟

بلوری جس پہلو سے بھی ڈاکٹر کے متعلق سوچ رہی تھی' مایوس ہوتی جارہی تھی۔ شام کو مائی جینا نے آکر کہا۔"میں کل بھی تیرے ساتھ جانے والی تھی۔ لیکن ڈاکٹر نے مجھے کل کی پرچی نہیں دی ہے۔ وہ کم بخت تجھ سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہے۔ میری موجودگی اسے آج بھی گراں گزرتی رہی ہے۔"

بلوری نے کہا۔"وہ خبیث میرے کام نہیں آئے گا۔ میں وہاں جاکر کیا کروں؟"

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔"پر میرا تجربہ کہتا ہے' وہ کام آئے گا۔"

بلوری کے دل میں ایک اُمید پیدا ہوئی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مائی جینا کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ''تُو صبح اس کے پاس گئی تھی۔ اب شام ہوگئی ہے۔ اس نے جیلر تک تیرے خلاف کوئی رپورٹ نہیں پہنچائی ہے۔ اگر پہنچائی ہوتی تو اب تک تیرا محاسبہ ہو چکا ہوتا۔ چوہدری تک بھی خبر پہنچ چکی ہوتی۔ پھر پتہ نہیں کیا سے کیا ہوتا رہتا؟ مگر ایسا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔''

اس کی باتیں سن کر بلوری کے اندر حوصلہ پیدا ہو رہا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''تم حقیقی باتیں کہہ رہی ہو۔ میں صبح سے اتنی پریشان ہوں کہ ایسی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ واقعی میرے خلاف کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ اس ڈاکٹر نے وعدے کے مطابق اپنی زبان بند رکھی ہے۔''

مائی جینا نے کہا۔ ''رب کرے اس کی زبان بند ہی ہو جائے۔ وہ کبھی تیرے بارے میں کچھ نہ بول سکے۔''

''کیوں اسے کوس رہی ہو۔ اس نے خاموشی اختیار کی ہے۔ اس سے اُمید بندھ رہی ہے۔ میرا دل کہتا ہے' وہ ہمارا ساتھ ضرور دے گا۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔ کل وہاں جائے گی تو اس کے دل کی بات معلوم ہو سکے گی۔''

وہ رات اس نے بڑی بے چینی سے سوتے جاگتے گزار دی۔ دوسری صبح سپاہی سے کہا۔ ''مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔''

سپاہی نے کہا۔ ''ڈاکٹر نے گیارہ بجے آنے کو کہا ہے۔ اس وقت مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔''

وہ اپنی چٹائی پر آ کر بیٹھ گئی۔ مائی جینا سے بولی۔ ''میں بے چینی سے مری جا رہی ہوں۔ پتہ نہیں' اس نے کیا سوچا ہے؟ کس طرح میرا ساتھ دینا چاہتا ہے؟ ساتھ دے گا بھی یا نہیں؟ دل میں کھد بھد سی ہو رہی ہے۔ کم بخت نے گیارہ بجے بلایا ہے۔''

وہ بولی۔ ''سپاہی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس وقت وہاں مریضوں کی بھیڑ ہوتی ہے۔ تیرا معاملہ الگ ہے۔ کیا ہونا چاہئے' کیا نہیں ہونا چاہئے... اس پر لمبی بحث ہو سکتی ہے۔ تُو صبر سے بیٹھ جا۔ میں کام پر جا رہی ہوں۔''

دوسری عورتیں وہاں سے اپنی ڈیوٹی پر جا رہی تھیں۔ مائی جینا بھی چلی گئی۔ وہ سر پکڑ

کر بیٹھی رہی۔ طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ حالات عجیب طرح پیش آتے ہیں جو ہونا ہے' وہ فوراً ہی نہیں ہو جاتا۔ انتظار کی سولی پر لٹکتے رہنا پڑتا ہے۔ جان جاتے جاتے نہیں جاتی۔ کام ہوتے ہوتے نہیں ہوتا۔ اکثر لوگ ایسی ہی تقدیر لکھوا کر دنیا میں آتے ہیں۔

روز ہی گیارہ بجتے ہیں' آخر اس روز بھی بج گئے۔ سپاہی نے آہنی سلاخوں والا دروازہ کھولا۔ وہ فوراً ہی وہاں سے نکل کر تیر کی طرح چلتی ہوئی ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئی۔ مریضوں کی بھیڑ چھٹ گئی تھی۔ صرف دو ہی رہ گئے تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں جلدی سے نمٹا رخصت کر دیا۔ پھر اس سے کہا۔ ''تم نے میری نیند اڑا دی ہے۔ میں تمام رات اچھی طرح سو نہ سکا۔ کبھی سوتا رہا' کبھی جاگتا رہا اور سوتے جاگتے تمہارے بدن سے کھیلتا رہا۔''

بلوری کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ ناگواری سے بولی۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ چوہدری صاحب نے مجھے یہاں رکھا ہے؟ مجھے ہاتھ لگانا تو کیا' کوئی بری نیت سے دیکھ بھی نہیں سکتا۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''اسی لئے تو تمہاری طلب اور بڑھ گئی۔ بے شک۔ کوئی تمہیں ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ لیکن تم میرے ہاتھ آئے بغیر مجھ سے کوئی کام نہیں لے سکو گی۔ تمہارے ہونے والے بچے کو میں ہی بچا سکتا ہوں۔''

وہ پریشان ہو کر اس کا منہ تک رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔ ''جب یہ ظاہر ہوگا کہ تم ماں بننے والی ہو اور چوہدری صاحب تمہارے بچے کو ضائع کرانا چاہیں گے تو اس مقصد کے لئے جیلر میری ہی خدمات حاصل کرے گا۔ یہاں کوئی اور ڈاکٹر نہیں ہے۔ باہر کے کسی ڈاکٹر کو راز دار نہیں بنایا جائے گا۔ ایسے وقت میں.... صرف میں ہی تمہارے کام آؤں گا۔''

وہ سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ ''ہائے ربا...! میں کب تک ناکردہ گناہوں کی سزا پاتی رہوں گی؟ یہ بڈھا ایک نئی دلدل میں دھنسنے کے لئے بلا رہا ہے۔ کیسی شرمناک بات ہے' مجھے تو مر جانا چاہئے۔''

سوچنا آسان ہے' مگر مرنے کو جی نہیں چاہتا۔ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔ اس آسرے پر مزید جینے کو جی چاہتا ہے کہ آنے والا کل بہتر ہوگا۔

اس کا بچپن جتنا خوبصورت اور بہتر تھا۔ جوانی اُتنے ہی بدترین حالات سے دوچار

ہوتی جارہی تھی۔ ایسے مسائل جھیلتے وقت اسے دو مسرتیں ملنے والی تھیں۔ ایک تو ہونے والا بچہ اس کی ممتا کے جذبات میں شدت پیدا کر رہا تھا۔ دوسرا سلطان اس کی پائل کو اپنی دھڑکنوں سے لگا کر اس کے اندر محبتیں جگا رہا تھا۔ زندگی سے محبت کرنا اور جینا سکھا رہا تھا۔

ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک گئی۔ فوراً ہی اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ بولا۔ ''میں اتنی دیر سے بول رہا ہوں اور تم بہری بن گئی ہو۔ کہاں پہنچی ہوئی ہو؟''

وہ بولی۔ ''تمہاری باتیں سن کر رونا آ رہا ہے۔ تم عمر میں میرے مرحوم باپ سے بھی بہت بڑے ہو۔ میرے دادا کے برابر ہو۔ مجھ سے ایسی باتیں کرتے ہوئے...''

وہ فوراً ہی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''فضول باتیں نہ کرو۔ نہ میں نے کبھی شادی کی ہے نہ میری کوئی بیٹی' نواسی یا پوتی ہے۔ اگر کوئی ہوتی بھی تو وہ کسی کی داشتہ بن کر یوں منہ کالا کر کے ایک ناجائز بچہ پیٹ میں لے کر کسی ڈاکٹر کے پاس نہ جاتی۔ تم جیسی ہو ویسی ہی باتیں کرو۔''

وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔ ''جب ایک کو سب کچھ دیا ہے تو مجھ میں کیا کیڑے پڑے ہیں؟ بازاری عورت جوان اور بڈھے کو نہیں دیکھتی۔ بس اپنا دھندہ جاری رکھتی ہے۔ تم دو چار ہفتوں تک بچے کی بات چھپانا چاہتی ہو۔ اس کے بعد بھی میری مدد حاصل کرنا چاہتی ہو تو سیدھی اور صاف بات کہتا ہوں' جس بدن پر یہ ناز ہے کہ اسے چوہدری صاحب کے سوا کوئی نہیں چھو سکتا۔ اسے مجھے چھو لینے اور پا لینے دو۔''

پھر وہ سیدھا ہو کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔ ''کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ ابھی اور اسی وقت بولو.... راضی ہو یا نہیں۔ میں ابھی جیلر صاحب کے پاس اپنی تحریری رپورٹ بھیجتا ہوں۔''

وہ کاغذ اور قلم لے کر میز پر جھک کر لکھنے لگا۔ وہ ایک تحریری رپورٹ اس کے بچے کو قتل کرنے والی تھی۔ اسے جیل کی چار دیواری میں بدستور داشتہ بنا کر رکھنے والی تھی۔ وہ رونے لگی' کہنے لگی۔ ''بڈھے کھوسٹ...! تُو کیا ہے؟ منہ میں دانت نہیں ہیں۔ بدن پر گوشت نہیں ہے۔ میں ایک ہاتھ سے دبوچوں گی تو تیرا دم نکل جائے گا۔''

وہ لکھتے لکھتے رُک گیا' سر اٹھا کر بولا۔ ''ٹھیک کہتی ہو۔ ہم جیسے بوڑھے اس عمر میں بھلا کیا کر سکتے ہیں؟ مضبوطی سے عورت کی کلائی بھی پکڑ نہیں سکتے۔ ہم کچھ بھی نہیں کر

سکتے۔ مگر ہوس اس عمر میں بھی بری طرح مچلتی ہے۔ ہم دریا میں اتر نہیں سکتے۔ تیر نہیں سکتے۔ مگر کنارے بیٹھ کر پانی میں پاؤں ڈال کر ذرا تسکین حاصل کرتے رہتے ہیں کہ دریا کو کنارے کنارے ہی سہی.... پا تو رہے ہیں۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے''

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''مجھ سے تمہیں کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں تو صرف نظارۂ حسن سے ہی بہلتا رہوں گا۔ تم خواہ مخواہ پارسا بنو گی' انکار کرو گی تو اپنے ساتھ اپنے بچے کی بھی زندگی ہار جاؤ گی۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''تم مرد ہم عورتوں کے ساتھ کیسے کیسے سلوک کرتے ہو؟ کبھی احساس نہیں ہوتا کہ اس دنیا کو کتنا غلیظ بناتے جا رہے ہو؟ کیسے ہو تم لوگ...؟ عورتوں سے پیدا ہوتے ہو اور عورتوں کی ہی عزت کو تماشہ بناتے رہتے ہو؟''

وہ جیسے کچھ نہیں سن رہا تھا۔ سر جھکائے کاغذ پر لکھتا جا رہا تھا۔ جب رپورٹ مکمل ہوگئی اور وہ نیچے دستخط کرنے لگا تو اچانک ہی بلوری نے جھپٹ کر اس کاغذ کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔ بڑے درد' بڑے کرب سے کہا۔ ''میں اپنے بچے کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ اب تجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ میں کیا چاہتی ہوں' وہ سن لے... تیری بات ماننے سے پہلے یہ ضمانت چاہتی ہوں کہ تُو میرا ساتھ دے گا۔''

''میں زبان کا پکا ہوں' جو کہہ رہا ہوں۔ وہی کروں گا۔''

''شیطان کے پاس زبان نہیں ہوتی۔ صرف ہوس ہوتی ہے۔ میں چاہتی ہوں' جب بھید کھلے تو یہاں میری مدد کرنے والے موجود رہیں۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تیری مدد کرنے والے...؟ میں نے تو سنا ہے' جیل سے باہر تیرا اپنا پرایا کوئی نہیں ہے۔ جو اپنے تھے' وہ سب مر چکے ہیں۔ پھر یہاں اپنی مدد کے لئے کسے بلانا چاہتی ہے؟''

''میرے جو مددگار ہیں' میں ان کا پتہ ٹھکانا اور فون نمبر نہیں جانتی۔ صرف نام جانتی ہوں۔ وہ مشہور و معروف لوگ ہیں۔ کیا تُو میرا پیغام ان تک پہنچا سکے گا؟''

جیل سے باہر اس ڈاکٹر کے کئی لوگوں سے تعلقات تھے۔ جیل کے اندر ایسے اثر ورسوخ والے مجرم تھے جو نشہ کرتے تھے۔ ڈاکٹر جیلر کے تعاون سے چرس اور نشیلی دوائیں باہر سے منگواتا تھا۔ یہ کہنا چاہئے کہ ڈرگ مافیا سے اس کے تعلقات رہتے تھے۔ وہ ان میں سے کسی کو رازدار بنا کر بلوری کا پیغام اس کے مطلوبہ افراد تک پہنچا سکتا تھا۔

اس نے کہا۔ ”میں تمہارا پیغام کہیں بھی پہنچا سکتا ہوں۔ تم ان کے نام بتاؤ؟“

”نام بتانے سے پہلے میرا ایک مطالبہ ہے‘ اسے پورا کرو۔“

”تمہارا مطالبہ کیا ہے؟“

”میں ایک تیز دھار والا چاقو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔“

وہ گھبرا کر بولا۔ ”چاقو...؟ تم اپنے پاس چاقو کیوں رکھو گی...؟“

وہ بڑے عزم سے بولی۔ ”اپنے آخری فیصلے پر عمل کرنے کے لئے چاقو لازمی ہے۔ میں ان کے نام بتاؤں گی اور اس پارٹیشن کے پیچھے خود کو تیرے سامنے پیش کروں گی۔ مگر اس کے بعد کیا ہوگا‘ یہ میں نہیں جانتی۔ اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد تُو دھوکہ دے سکتا ہے۔ جو نام میں بتاؤں گی انہیں جیلر کو بتا سکتا ہے۔ میرا راز کھول سکتا ہے۔ ان حالات میں موت میرے لئے لازمی ہوگی۔ لہٰذا یہ ضروری مطالبہ پورا کر۔ ابھی مجھے چاقو لا کر دے۔“

وہ بوڑھا مکار ڈاکٹر ان لمحات میں مکاری بھول گیا۔ اس کا منہ تکنے لگا‘ سوچنے لگا۔ بلوری نے پوچھا۔ ”کیا سوچ رہا ہے؟“

”تم جانتی ہو‘ میں ایک قیدی ڈاکٹر ہوں۔ مجھے کوئی ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔“

”باتیں نہ بناؤ جھوٹ نہ بولو۔ جو قیدی زخمی ہوتے ہیں‘ ان کے زخموں کی چیر پھاڑ کے لئے چاقو اور قینچی یہاں رکھے جاتے ہیں۔ مجھ سے بحث نہ کرو۔ ابھی چاقو لاؤ۔ ابھی تمہاری ہوس پوری ہوگی۔“

وہ بڑی بے چارگی سے اور للچائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”کیوں مجھے آزمائش میں مبتلا کر رہی ہو؟ اگر تم نے خودکشی کی تو بڑے ہنگامے ہوں گے۔ جیلر اور چوہدری کی تو شامت آئے گی ہی.... مجھ پر بھی یہ الزام آئے گا کہ خودکشی کے

لئے چاقو میں نے دیا تھا۔“

”عقل سے سوچو تو تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا اور نہ ہی میں خودکشی کروں گی۔ میں تو تمہاری شرط پوری کروں گی۔ یہ دیکھتی رہوں گی کہ میرا پیغام مطلوبہ افراد تک پہنچ رہا ہے یا نہیں اور وہ میری مدد کو آتے ہیں یا نہیں؟ اگر ایسا نہ ہوا تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔ لہٰذا تم ایسا وقت نہ آنے دو۔“

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے بلوری کو تکنے لگا۔ یہ جانتا تھا کہ بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ اس دنیا سے جاتے جاتے مکھن جیسی بلوری ملے گی تو سیدھا جنت میں جائے گا۔

ہوس نہیں مانتی۔ جس کے ذہن پر مسلط ہو جائے‘ اسے دین کا رہنے دیتی ہے نہ دنیا کا۔ بس آخری خواہش ہے‘ پوری ہو جائے۔ اس کے بعد بھی آخری خواہش کے لئے سانسیں ملتی رہیں گی یا نہیں... بس ابھی جو آخری عمر ہے‘ وہ پیاسی نہ رہے۔

وہ بڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں ابھی چاقو لا کر دوں گا۔ لیکن جیسا کہوں گا‘ ویسا ہی کرو گی۔“

”تم کیا کہنا چاہتے ہو اور مجھے کیا کرنا چاہئے؟“

”میں تمہارا پیغام مطلوبہ افراد تک پہنچا دوں گا۔ پیغام پہنچنے میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے یہاں بھید کھل جائے اور تمہاری جان پر بن آئے تو تم خودکشی نہیں کرو گی۔ مجھ پر بھروسہ کرو گی‘ مجھے تھوڑا وقت دو گی۔ میں تمہیں اور تمہارے بچے کو مرنے نہیں دوں گا۔“

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلا کر بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ تم جیسا کہہ رہے ہو‘ ویسا ہی کروں گی۔“

ڈاکٹر وہاں سے اٹھ کر دواؤں کے اسٹور کی طرف گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک چاقو تھا۔ وہ اس کے قریب بیٹھ کر چاقو کھولتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو.... یہ تیز دھار والا چاقو ہے۔ اسے بند کر کے اپنے لباس میں چھپا کر رکھنا۔ جس طرح تم میرے رحم و کرم پر ہو۔ اسی طرح میری بھی خیر خیریت تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ اگر کسی نے اس چاقو

کو تمہارے پاس دیکھ لیا تو میری شامت آ جائے گی... یہ لو۔"

بلوری نے چاقو لے کر اس کی دھار دیکھی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "فوراً اسے بند کرو اور اپنے لباس میں چھپاؤ۔"

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ "لباس میں کیسے چھپاؤں؟ ابھی تو اس پارٹیشن کے پیچھے لباس اتاروں گی۔ اس وقت بھی یہ چاقو میرے ہاتھ میں رہے گا۔"

"نہیں... مجھے دو۔ میں اسے دراز میں رکھتا ہوں۔ جب یہاں سے جاؤ گی تو تمہیں دے دوں گا۔"

"نہیں۔ چاقو تو میرے پاس ہی رہے گا۔ پارٹیشن کے پیچھے چلو۔ پہلے اس چاقو سے میں تمہاری دونوں آنکھیں نکالوں گی۔ اس کے بعد اپنا نظارہ کراؤں گی۔"

وہ گھبرا کر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا۔ "یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟"

وہ ایک ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے نفرت سے بولی۔ "اُچھلتا کیا ہے بیٹھ جا۔ تیرے جیسے مردوں نے مجھے جینے مرنے کا ڈھنگ سکھا دیا ہے۔ میں نے بھی کچھ مکاریاں حاصل کی ہیں۔ آرام سے بیٹھ اور میری بات سن۔"

وہ شکست خوردہ انداز میں بیٹھ کر اس کا منہ تکنے لگا۔ اس نے کہا۔ "یہ کھلا ہوا چاقو اب میرے ہاتھ میں رہے گا۔ آئندہ میں کسی وقت بھی اپنی جان پر کھیل سکتی ہوں۔ اب میرے بچے کی بات کھلے گی تو کوئی میرا کیا بگاڑ لے گا؟"

وہ کھلے ہوئے چاقو کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے بولی۔ "جیلر کیا کرے گا؟ میرا بچہ گرائے گا؟ چوہدری بھی یہی چاہے گا کہ بچہ مر جائے اور میں زندہ رہوں۔ مگر اب چوہدری اور جیلر کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تُو ابارشن کے لئے میرے پاس آئے گا تو اسی چاقو سے چیر ڈالوں گی۔ یہاں کے سپاہی مجھے قابو میں کرنا چاہیں گے تو اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔ اس کے بعد جو ہوگا' وہ چوہدری اور جیلر کے لئے ناقابل برداشت ہوگا۔"

اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔ وہ گم صم سا ہو کر بڑھاپے کی ساری ہوس' ساری مستیاں بھول گیا تھا۔ اس کی لکھی ہوئی رپورٹ مڑی تڑی سی میز پر رکھی ہوئی تھی۔ بلوری نے اسے ڈاکٹر کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "چل اٹھ میرے ساتھ چل اور یہ رپورٹ جیلر کو

پیش کر۔"

وہ عاجزی سے بولا۔ "بلوری...! تمہیں خدا کا واسطہ ہے..."

بلوری نے کہا۔ "اچھا۔ تجھے بھی ربّ یاد آتا ہے؟"

"مجھے طعنے نہ دو۔ میں تمہیں چاقو دے کر بری طرح پھنس گیا ہوں۔ اب تو جی جان سے تمہارے کام آؤں گا۔ ابھی تمہارا پیغام مطلوبہ افراد تک پہنچاؤں گا۔"

"اب پیغام پہنچانے کی ضرورت نہیں رہی۔ جب بات یہاں کھلے گی تو تُو دیکھے گا کہ میں کس طرح اپنے مدد کرنے والوں کو یہاں بلاتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر بولی۔ "چل اٹھ... جیلر کے پاس چل۔ نہیں چلے گا تو میں تنہا جاؤں گی پھر سپاہی تجھے یہاں سے اٹھا کر وہاں پہنچا دیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی۔ اس کا انتظار نہیں کیا۔ وہاں سے جانے لگی۔ وہ فوراً ہی اس کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے بولا۔ "رُک جاؤ بلوری! تھوڑی دیر کے لئے میری بات مان لو۔ میں کوئی ایسی تدبیر کروں گا' جس پر عمل کرنے سے کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا۔ تم پر اور تمہارے بچے پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

وہ تیزی سے چلتی جا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "میں جو کرنے جا رہی ہوں' اس کے نتیجے میں بھی مجھ پر اور میرے بچے پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ تُو زیادہ نہ بول... آگے چل کر دیکھ! میں کیا کرتی ہوں اور کیا ہونے والا ہے؟"

بلوری نے ڈاکٹر کے پاس آنے سے پہلے خود نہیں سوچا تھا کہ نوبت یہاں تک آئے گی؟ اپنی جان پر کھیل جانے کا حوصلہ کر کے خود ہی حمل ضائع کرے گی اور جتنی قوتیں اسے اب تک کچلتی رہی ہیں' ان سب کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج بن جائے گی۔

جب وہ ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو لے کر جیلر کے پاس پہنچی تو وہ اور دوسرے سپاہی اسے دیکھتے ہی اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ دو سپاہی اس کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ اس نے چاقو کی نوک کو اپنے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "خبردار کوئی میری طرف آئے گا تو میں یہ چاقو اپنے سینے میں اتار لوں گی۔"

ڈاکٹر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر جیلر سے کہا۔ "یہ پاگل ہو گئی ہے۔ اپنی جان پر کھیل

جائے گی۔ سپاہیوں کو حکم دیں' کوئی اس کے قریب نہ جائے۔"

جیلر نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے۔ بلوری! تمہارے پاس چاقو کہاں سے آیا ہے؟"

وہ ایک طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "جہاں سے بھی آیا ہے۔ میری سلامتی کے لئے یا میری جان لینے کے لئے آیا ہے۔"

وہ جیلر کے کمرے میں ایسے گوشے کی طرف آ کر کھڑی ہو گئی کہ پیچھے سے یا دائیں بائیں سے کوئی اس کی طرف نہ آ سکے۔ سامنے سے آنے والوں پر وہ نظر رکھ سکتی تھی۔ اس نے کہا۔ "جیلر صاحب! یہ چاقو میں نے اس بڈھے ڈاکٹر سے حاصل کیا ہے۔ تمہارے اور چوہدری دلاور حیات کے لئے بری خبر ہے... میں ماں بننے والی ہوں۔"

جیلر کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے بے یقینی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ سچ کہہ رہی ہے؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "جی ہاں۔ اس نے اپنا حمل چھپایا ہوا تھا۔ آج میرے پاس آئی اور میں نے معائنہ کیا تو پتہ چلا' یہ تیسرا مہینہ ہے۔"

بلوری نے کہا۔ "یہ جھوٹ بولتا ہے۔ اس نے آج نہیں کل میرا معائنہ کیا تھا اور کل سے اب تک مجھ سے میرے بدن کا سودا کر رہا ہے۔ یہ جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ میری عزت سے کھیلنا چاہتا تھا' اس لئے کھیلنا چاہتا تھا کہ تم نے اور چوہدری نے مجھے بازاری بنا دیا ہے۔ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ میں ایک کی داشتہ ہوں تو سب ہی کی داشتہ بن سکتی ہوں۔ لعنت ہے' تم لوگوں پر... میں تم سب پر تھوکتی ہوں۔"

جیلر نے غصے سے گرجتے ہوئے کہا۔ "اے! کیا بکواس کر رہی ہے؟ میں ابھی تجھے...."

وہ غصے میں آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ بلوری نے چاقو کی نوک اپنے سینے میں چبھو لی۔ وہاں سے خون رسنے لگا۔ وہ بولی۔ "دیکھ... میں کیا کر سکتی ہوں؟ اگر یہاں میں نے جان دے دی تو یہ بات چھپی نہیں رہے گی۔ باہر ایڈووکیٹ سلطان احمد اور اپوزیشن کا سب سے بڑا لیڈر سلامت علی میری جان پر کھیل جانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ اس معاملے کو

ایسا اچھالیں گے کہ تیرے اور چوہدری کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔"

اس کے حلق کے نیچے سینے پر ایک ذرا سا لہو ابھر آیا تھا۔ وہ لہو پکار رہا تھا چیلنج کر رہا تھا کہ بلوری جنون میں مبتلا ہے' جو کہہ رہی ہے' وہ کر گزرے گی اور جب کر گزرے گی تو اس کی ہلاکت اور اس کے ماں بننے والی بات چھپائے نہیں چھپے گی۔

وہ چیخ کر بولی۔ "جیلر! تم بڑی مکاری سے آہستہ آہستہ قریب آ رہے ہو۔ اگر پیچھے نہ گئے تو میں..."

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ چاقو کے دستے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اسے فضا میں بلند کیا۔ چاقو کی نوک ٹھیک اس کے سینے کی طرف تھی۔ جیلر جھنجلا کر پیچھے جاتے ہوئے بولا۔ "نہیں۔ نہیں میں آگے نہیں بڑھوں گا۔ تمہارے قریب کوئی نہیں آئے گا۔"

اس نے سپاہیوں سے کہا۔ "اے! پیچھے ہٹو۔ دور چلے جاؤ۔ کوئی اس کے قریب نہ جائے۔"

بلوری نے کہا۔ "یہاں ایک بھی سپاہی نہیں رہے گا۔ انہیں باہر جانے کا حکم دو۔"

جیلر نے حکم دیا۔ تمام سپاہی باہر چلے گئے۔ اس نے کہا۔ "دیکھو بلوری! جب سے یہاں آئی ہو۔ ہم نے تم سے کبھی مشقت نہیں لی۔"

وہ نفرت سے بولی۔ "کیونکہ مشقت کے لئے رات کی تاریکیوں میں چوہدری کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ کیا تم اپنی بہن یا بیٹی کو کسی چوہدری کے پاس بھیج سکتے ہو؟"

وہ بڑی نفرت سے زہر اُگل رہی تھی اور وہ اندر ہی اندر تلملا رہا تھا۔ مجبوراً اس کی باتوں کو' اس کی حرکتوں کو برداشت کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "اوپر والے نے تمہیں حق حلال کی روزی حاصل کرنے کے لئے یہاں جیلر کی نوکری دی۔ مگر تم عورتوں کے دلال بن گئے ہو۔"

وہ بولا۔ "دیکھو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارے جیسی پنڈ کی لڑکی ہو یا ہم جیسا کوئی بڑا افسر..... سب ہی اس شخص کے آگے مجبور ہوتے ہیں' جس کے پاس پاور ہوتا ہے' اختیارات ہوتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "پاور کسے کہتے ہیں؟ جس کے پاس طاقت ہو۔ ایسی طاقت جس کے

آگے تم جیسے جیلر اور بڑے بڑے پولیس افسر جھک جائیں۔ اس وقت میرے ہاتھوں میں
پاور ہے۔ مجھے اپنی زندگی پر کبھی اختیار نہیں رہا۔ میں تم لوگوں کے مصرف میں رہی۔ پر آج
موت پر اختیار ہے۔ ابھی جس لمحے چاہوں' اپنی جان پر کھیل سکتی ہوں۔ میری موت تم
لوگوں کی موت ہوگی اور تم سب کبھی مرنا نہیں چاہو گے۔ لہٰذا اس وقت پاور میرے ہاتھوں
میں ہے' میں جو کہوں گی وہی تم کرو گے۔"

"یہ چاقو پھینک دو۔ تم جو کہو گی' میں کروں گا۔ ابھی آزما کر دیکھ لو۔"

"اپوزیشن پارٹی کے لیڈر سلامت علی کو ابھی فون کرو اور میری بات کراؤ۔"

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ میں ابھی بات کراؤں گا مگر
پہلے چوہدری صاحب سے بات کروں گا۔ وہ تمہاری بہتری کے لئے تمہارے مطالبات
ضرور مانیں گے....."

وہ حقارت سے بولی۔ "چوہدری اور میری بہتری چاہے گا...؟ خواہ مخواہ وقت
ضائع نہ کرو۔ چالاکیاں دکھا کر' باتوں میں لگا کر مجھے زیر کرنے کی حماقت نہ کرنا۔ اس سے
پہلے ہی تمہیں میری لاش ملے گی۔ سلامت علی سے بات کرا رہے ہو یا نہیں...؟"

وہ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ وہ بولی۔ "اُن سے کہو گے کہ میری زندگی
اور موت کا مسئلہ ہے تو وہ تمام مصروفیات چھوڑ کر پہلے مجھ سے بات کریں گے۔"

وہ بولا۔ "میں تمہاری مرضی کے مطابق رابطہ کرا رہا ہوں۔ مگر تم اچھا نہیں کر رہی
ہو۔ اس بات کو جیل سے باہر نہیں جانا چاہئے۔ اس میں ہم سب کا نقصان ہے' تمہارا بھی
نقصان ہے۔"

"تم لوگوں نے اب تک مجھے نقصان اٹھانا ہی سکھایا ہے۔ میں اس کی عادی ہو
چکی ہوں۔ میری نہیں اپنی فکر کرتے رہو۔"

رابطہ ہو گیا۔ دوسری طرف سے سلامت علی کے سیکرٹری کی آواز سنائی دی۔ وہ
بولا۔ "میں سینٹرل جیل کا جیلر بول رہا ہوں۔ سلامت صاحب سے بہت ضروری بات کرنی
ہے۔ فوراً ان سے رابطہ کراؤ۔"

سلامت علی غیر ضروری لوگوں سے بات نہیں کرتا تھا۔ ہمیشہ اس کا سیکرٹری یہ کہہ

کر ٹال دیتا تھا کہ صاحب سیٹ پر موجود نہیں ہیں یا کسی میٹنگ میں مصروف ہیں۔ سینٹرل
جیل کی بات سن کر سلامت علی نے فوراً ہی فون اٹینڈ کیا۔ پھر پوچھا۔ "ہیلو کون..؟"

"میں جیلر جبار خان بول رہا ہوں۔ بلوری آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔"

اس نے تعجب سے پوچھا۔ "بلوری...؟ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے...؟ ٹھیک
ہے۔ فون اسے دیں۔"

جیلر نے بلوری کی طرف ریسیور بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو بات کرو۔"

بلوری نے محتاط نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ کمرے میں جیلر کے سوا
کوئی نہیں تھا۔ وہ بولی۔ "ریسیور میز پر رکھ کر دور چلے جاؤ۔"

وہ ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "تم جو کہہ رہی ہو' میں وہی
کر رہا ہوں۔ پھر بھی آخری بار سمجھا رہا ہوں' یہ تم اچھا نہیں کر رہی ہو۔ ہم پر بھروسہ کرو۔ کم از کم
مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں اپنی جوان بیٹی کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچنے دوں
گا۔ جو کہو گی' وہی کروں گا۔ پر رب دا واسطہ.... اس معاملے کو جیل سے باہر نہ جانے دو۔"

اس نے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ "ریسیور میز پر رکھو اور دور ہو جاؤ۔"

جیلر نے بڑی بے بسی سے اس چاقو کو دیکھا' جو بلوری کے ہاتھ میں بہت بڑی
طاقت بن گیا تھا۔ وہ اپنے جارحانہ اقدامات سے ثابت کر چکی تھی کہ اسے جبراً قابو کرنے کی
کوشش کی جائے گی تو اس سے پہلے ہی اپنی جان دے دے گی اور وہ جان دینے کا ایک نمونہ
دکھا چکی تھی۔ سینے سے رسنے والا لہو ذرا بہتے بہتے خشک ہو رہا تھا۔ یہ حقیقت بیان کر رہا تھا....
خون پھر خون ہے' ٹپکے گا تو جم جائے گا۔

وہ لہو تو بہت ہی کم مقدار میں تھا۔ اگر وہ جنون میں مبتلا ہو جانے والی اپنا تمام لہو
اُچھالتی تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ پھر جیلر اور چوہدری سے بدترین حالات سنبھالے نہیں
سنبھلتے۔ وہ ریسیور کو میز پر رکھ کر وہاں سے دور ہو گیا۔ بلوری فون کے پاس آ گئی۔ چاقو اس
کے ایک ہاتھ میں تھا۔ اس کی نوک سینے کی طرف تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے ریسیور اٹھا
کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو.... کیا آپ سلامت علی صاحب بول رہے ہیں؟"

"ہاں۔ کیا تم بلوری ہو؟"

"جی ہاں۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ اگر یہاں آنے میں دیر کریں گے تو میں مرجاؤں گی۔"

"ایسی کیا بات ہے؟ مجھے بتاؤ' وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"میرا حمل ظاہر ہوگیا ہے۔ اب اگر جیلر اور سپاہیوں کے قابو میں آؤں گی تو یہ میرے بچے کو ضائع کر دیں گے۔ فی الحال میرا پلڑا بھاری ہے۔ میرے ہاتھ میں چاقو ہے' خود کو زخمی کر چکی ہوں۔ ان میں سے کوئی مجھے گرفتار کرنا چاہے گا تو اس سے پہلے ہی جان پر کھیل جاؤں گی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنے بچے کے ساتھ زندہ رہوں تو فوراً سلطان احمد کے ساتھ یہاں آ جائیں۔ ان لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی کریں اور مجھے تحفظ فراہم کریں۔"

"بلوری! تم نے تو کمال کر دیا ہے۔ میں جلد سے جلد پوری تیاریوں کے ساتھ آ رہا ہوں۔ بس اتنا بتا دو' تم کتنی دیر تک اس سچویشن کو... میرا مطلب ہے' اس صورتحال کو اپنے قابو میں رکھ سکتی ہو؟"

وہ بولی۔ "جب تک یہ سارے دشمن مجھ سے دور رہیں گے' تب تک میں زندہ رہوں گی۔ اگر یہ لوگ میری موت کی پرواہ نہیں کریں گے اور مجھے گرفتار کرنا چاہیں گے تو اس سے پہلے ہی میں اپنی جان دے دوں گی۔"

"دیکھو... اس وقت تم غصے میں ہو۔ پوری طرح عقل سے کام نہیں لے سکو گی۔ میرا ایک مشورہ مان لو۔ انہیں یہی دھمکیاں دیتی رہو کہ جان پر کھیل جاؤ گی' ان کے ہاتھ نہیں آؤ گی۔ مگر حقیقتاً تم جان نہیں دو گی۔ اگر وہ تمہیں گرفتار کرنے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو گرفتاری پیش کر دو گی۔ تب تک میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گی۔ آپ جلد سے جلد آنے کی کوشش کریں۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر پھر پیچھے کی طرف چلتی ہوئی کمرے کے اسی گوشے میں آ گئی' جہاں ہر طرف سے محفوظ تھی۔ اس کے پیچھے سے اور دائیں بائیں سے کوئی نہیں آ سکتا تھا۔

جیلر اس کی باتیں سنتا رہا تھا اور سوچتا رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "آخر تم نے بات بڑھا ہی دی۔ یہ معاملہ جیل سے باہر جا رہا ہے۔ اب میں چاہوں تو میرے سپاہی تمہیں گرفتار کر سکتے ہیں۔ جان دینا چاہو گی تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اب تم زندہ رہو یا مر جاؤ۔ ہم پر تو یہ الزام آئے گا کہ ہماری وجہ سے جیل کی چار دیواری میں تم سے بدکاری ہوئی ہے۔ لیکن تمہاری ہلاکت کا الزام ہم پر نہیں آئے گا کیونکہ یہ سراسر خودکشی کا کیس ہوگا۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے کے پاس آ کر بولا۔ "تمہاری موجودہ پوزیشن کیا ہے' یہ میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ اس کمرے میں تنہا رہ کر عقل سے سوچو! ہمارا ساتھ دو گی تو جان دینے کی نوبت نہیں آئے گی۔ تمہارا بچہ بھی محفوظ رہے گا۔ چوہدری صاحب اپنی نیک نامی کی خاطر تمہارا کیس کمزور کریں گے اور جلد سے جلد یہاں سے رہائی دلائیں گے۔"

وہ دروازے کے باہر آ کر اسے بند کرتے ہوئے بولا۔ "میں اس وقت آؤں گا' جب تمہارے حمایتی یہاں آ جائیں گے۔ بس ایک بات پر غور کرو۔ رہائی ہمارے ذریعے بھی مل سکتی ہے اور اپوزیشن والوں کے ذریعے بھی... لیکن ہم سے جو رہائی ملے گی' اس میں تمہاری اور تمہارے بچے کی سلامتی ہے۔ ورنہ تمہارے حمایتی جیسے ہی یہاں آئیں گے' ہم تمہیں گرفتار کرنا چاہیں گے اور یہ چاہیں گے کہ تم اپنی جان پر کھیل جاؤ... سوچو! اپنے بچے کی سلامتی کی خاطر سوچو...!"

یہ کہہ کر اس نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ پھر دوسرے کمرے میں آ کر دوسرے فون کے ذریعے چوہدری دلاور حیات کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر اس کے پرسنل سیکرٹری نے پوچھا۔ "ہیلو...! فرمائیے...؟"

"میں جیلر جبار خان بول رہا ہوں۔ صاحب سے فوراً بات کراؤ۔"

"سوری... وہ میٹنگ میں ہیں۔ میں آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔"

"ان سے ابھی کہو' بات اتنی ضروری ہے کہ وہ میٹنگ کو بھول جائیں گے۔"

"آل رائٹ۔ آپ ہولڈ کریں۔"

وہ ریسیور کان سے لگائے انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد چوہدری دلاور حیات کی جھنجھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ہیلو جبار خان...! میں نے تم سے کہا تھا' بلوری کی کوئی بھی

بات ہو تو تم اپنے طور پر نمٹ لیا کرو۔ الیکشن قریب ہیں۔ میں بہت مصروف ہوں۔ کسی داشتہ کے لئے سوچنے کی ایک ذرا سی فرصت نہیں ہے۔"

"سر! بات یہ ہے کہ..."

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ریسیور سے "ٹوں ٹوں ٹوں...." کی آواز ابھرنے لگی۔ یعنی "بھوں بھوں بھوں...." اپنے آقا کے پیچھے بھونکتے رہو۔ آگے پیچھے دم ہلاتے رہو' اس کی مرضی ہوگی تو تمہاری سنے گا۔ ورنہ لات مار دے گا۔ ایک سرکاری افسر کی کیا حیثیت تھی؟ آقا نے اسے لات ماردی تھی۔

جبار خان جھنجھلا گیا۔ کریڈل پر انگلی رکھ کر اسے گالیاں دیتے ہوئے دوبارہ نمبر ڈائل کرنے لگا۔ "یہ جاگیردار اور سرمایہ دار حکمران بن کر عذاب جاں بن جاتے ہیں۔ ہمیں انسان نہیں جانور سمجھتے ہیں۔ مصیبت کے وقت پھندے سے لٹکا کر چھوڑ دیتے ہیں۔"

رابطہ ہوگیا۔ پھر پرسنل سیکرٹری کی آواز سنائی دی۔ جبار خان نے غصے سے کہا۔ "اپنے صاحب سے کہو' ان کے سر پر موت منڈلا رہی ہے۔ اگر ابھی مجھ سے بات نہ کی تو اپنی کرسی سے ایسے گریں گے کہ انہیں اٹھانے والا کوئی نہیں ہوگا۔"

پرسنل سیکرٹری نے کہا۔ "میں ابھی بات کراتا ہوں۔ آپ ہولڈ کریں۔"

وہ پھر ریسیور کو کان سے لگائے انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد چوہدری کی جھنجھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "تم کیا بکواس کررہے ہو؟ یہ میرا سیکرٹری کیا کہہ رہا ہے؟"

جبار خان نے کہا۔ "میں بکواس نہیں کررہا ہوں۔ فی الحال الیکشن لڑنا بھول جائیں۔ بلوری آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ تین ماہ کا حمل ہے۔ اپوزیشن کا ایک بڑا لیڈر سلامت علی اس کا حمایتی ہے۔ ابھی اسے قانونی تحفظ دینے کے لئے یہاں پہنچنے والا ہے۔"

چوہدری دلاور حیات حیرانی سے اور پریشانی سے یہ باتیں سن رہا تھا۔ اس نے غصے سے کہا۔ "وہ حاملہ ہوئی' تین ماہ بھی گزر گئے اتنی بڑی بات مجھے معلوم ہونے سے پہلے دشمنوں کے کانوں تک کیسے پہنچ گئی؟ کیا میں نے اسی لئے تمہیں ترقی دی تھی' جیلر بنایا تھا کہ میری پیٹھ میں چھرا گھونپ دو اور دشمنوں سے مل جاؤ...؟"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں دشمنوں سے مل کر بھی اپنی جان نہیں بچا سکوں گا۔

مجھ پر یہ الزام آئے گا کہ بلوری جیل کی چاردیواری میں رہ کر حاملہ کیسے ہوگئی؟"

"وہ جیسے بھی ہوگئی' یہ تم سمجھو.... مجھے دھمکیاں کیوں دے رہے ہو؟ کیا یہ سمجھ رہے ہو کہ بلوری مجھے الزام دے گی' ایک ناجائز بچے کا باپ کہے گی اور میں تسلیم کرلوں گا....؟"

"آپ کو تسلیم کرنا ہی ہوگا۔ دنیا کی ہر عدالت میں ایک عورت جس مرد کو اپنے بچے کا باپ کہتی ہے' اسے سچ تسلیم کیا جاتا ہے۔"

وہ جھنجھلا کر بولا۔ "داشتاؤں اور بازاری عورتوں کا یہ بیان تسلیم نہیں کیا جاتا۔"

"بلوری ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اب تک اس پر بدکاری کا الزام ثابت نہیں ہوا ہے' نہ ہی اپوزیشن والے ثابت ہونے دیں گے۔"

"اپوزیشن والے یہ بھی ثابت نہیں کرسکیں گے کہ جیل کی چاردیواری میں رہنے والی میرے پاس منہ کالا کرنے آیا کرتی تھی۔"

"بلوری خود یہ بیان دے گی کہ اسے کس طرح جیل کی چاردیواری سے نکال کر آپ کے محل میں پہنچایا جاتا تھا؟"

"تم اس الزام سے انکار کرسکتے ہو۔ یہ کہہ سکتے ہو کہ جیل کے قیدیوں سے اس کے ناجائز تعلقات تھے۔"

"ایسا کہوں گا' تب بھی مجھ پر بات آئے گی کہ میرے جیل کی قیدی عورتیں عیاش قیدیوں تک کیسے پہنچ جاتی ہیں؟ الزام یہاں کے قیدیوں پر آئے یا آپ پر.... قانون کی گرفت میں تو میں ہی آؤں گا۔ جیسے ہی یہ کیس رجسٹرڈ ہوگا' آپ تمام اختیارات سے محروم ہ جائیں گے۔ اپنے بچاؤ کے لئے کچھ نہیں کرسکیں گے۔ پھر میرے لئے کیا کرپائیں گے؟"

"جو کہتا ہوں' اس پر فوراً عمل کرو۔ ابھی میں وسیع اختیارات کا مالک ہوں۔ دیکھ کہ کیا کرتا ہوں؟"

اس نے پوچھا۔ "آپ ابھی کیا کرسکیں گے؟"

"تم اس جیل کی چاردیواری کے حکمران ہو۔ دروازے بند رکھو۔ کسی کو اندر آ کی اجازت نہ دو۔ میں ابھی ایمرجنسی نافذ کراتا ہوں۔ جیل کے باہر جلسے جلوس کی اور احتجا کرنے والوں کی بھیڑ نہیں لگے گی۔ انہیں وہاں سے بھگا دیا جائے گا۔"

"یعنی اس طرح بات پورے شہر میں پھیلے گی۔ اپوزیشن والوں کے ساتھ پریس رپورٹرز اور فوٹو گرافرز بھی ہوں گے۔ آپ کب تک ان احتجاج کرنے والوں کو روک پائیں گے؟"

چوہدری نے کہا "تمہیں جتنا بھی وقت ملے' بلوری کا حمل گرا دو۔ میں اپنے فیملی ڈاکٹر کو بھیج رہا ہوں۔ وہ اس کا علاج کرے گا۔ ماں بننے کے آثار بالکل ہی مٹ جائیں گے۔"

"معاف کیجئے چوہدری صاحب! آپ اس وقت بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔ بعد میں بھی طبی معائنے سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ بلوری ماں بننے والی تھی۔ پھر یہ کہ اس وقت میں یا میرا کوئی سپاہی بلوری کے قریب پہنچ نہیں سکتا۔ کیونکہ اس کے ہاتھ میں چاقو ہے۔ وہ اپنے آپ کو زخمی کر چکی ہے۔ اس کے بعد خود کو ہلاک کر دینا چاہتی ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ وہ سالی کتیا مر جائے گی تو میرے خلاف بیان دینے والی نہیں رہے گی۔"

"آپ اپنے ہی بارے میں سوچ رہے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ اس کی ہلاکت میرے گلے کا پھندہ بن جائے گی۔ یہ اچھی طرح سن لیں اور سمجھ لیں' میں اسے مرنے نہیں دوں گا۔ وہ زندہ رہے گی تو میں اور میرے بیوی بچے بھی زندہ رہیں گے۔ آپ کی جوتیوں میں رہ کر جو غلطیاں کی ہیں' ان کی تھوڑی بہت سزا بھگت لوں گا۔ اگر آپ اپنے ساتھ میرے بچاؤ کی بھی تدبیر کر سکتے ہیں تو ضرور کریں۔ ابھی میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ "اچھی بات ہے۔ میرا ایک ڈاکٹر وہاں آ رہا ہے۔ ابھی دشمنوں کو بلوری سے ملنے نہ دو۔ پہلے میرا ڈاکٹر اس کا معائنہ کرے گا۔"

"سوری چوہدری صاحب! میں نادان بچہ نہیں ہوں۔ آپ کا وہ خاص ڈاکٹر بلوری سے ملنے کے بعد کیا کرے گا' یہ میں جانتا ہوں۔ وہ کوئی ایسی دوا کھلائے گا' جس سے بلوری کی زبان پہلے تو بند ہو جائے گی۔ پھر وہ رفتہ رفتہ مر جائے گی۔ آپ ایسی کوئی چال نہ چلیں کہ خود تو صاف بچ نکلیں اور میں پھنس جاؤں۔ بہرحال میں نے خطرے سے آگاہ کر دیا ہے۔ اب آپ جو کرنا چاہیں گے' میں حتی الامکان آپ کا ساتھ دوں گا۔ ورنہ اپنے بیوی بچوں کی خاطر موجودہ حالات سے سمجھوتہ کروں گا۔"

"تمہیں میری طاقت اور اختیارات کا اندازہ نہیں ہے۔ میں تم پر اور تمہارے بیوی بچوں پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ ابھی اپنے طور پر کچھ کروں گا اور جلد ہی تم سے رابطہ کروں گا۔ تب تک میرے دشمنوں کو سنبھالو اور کسی طرح بلوری کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کرو۔ اگر اس لڑکی کو میرے خلاف بیان دینے سے روک سکو گے تو میں تمہیں کل ہی دس لاکھ روپے دوں گا۔ مزید جو سہولتیں اور رعایتیں چاہو گے' وہ سب تمہیں ملیں گی۔ کسی بھی طرح اس مشکل سچویشن پر قابو پانے کی کوشش کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ وہ سلامت علی اپنے لوگوں کے ساتھ وہاں آئے تو مجھے فون پر اطلاع دینا۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔"

چوہدری نے ریسیور رکھ کر سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ الیکشن سر پر تھے۔ اسے زیادہ سے زیادہ نیک نامی حاصل کرنی تھی۔ ایسے وقت ایک پنڈ سے بدکاری کا الزام اٹھانے والی خلاف توقع اس کے منہ پر کالک ملنے والی تھی۔ ہر الیکشن میں تین لاکھ ووٹوں سے کامیابی حاصل کرنے والا' سیاست کی شطرنج پر کبھی کسی مہرے سے نہ پٹنے والا ایک معمولی لڑکی سے پٹنے والا تھا۔

غصہ اس بات کا تھا کہ جسے اب تک مسلتا رہا تھا' کچلتا رہا تھا۔ اب وہ اسے کچلنے والی تھی۔ وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے یوں چبانے لگا' جیسے خود کو کچل رہا ہو' سزا دے رہا ہو کہ اس نے ایسی غلطی کیوں کی؟ یہ حقیقت دیر سے کیوں سمجھ میں آ رہی ہے کہ پھول بننے والی لڑکیاں حالات کی ٹھوکریں کھا کر کانٹوں کی طرح چبھنے لگتی ہیں اور بلوری تو کانٹا نہیں .... بارود بن گئی تھی۔ الیکشن سے پہلے ہی اسے ایک دھماکے سے اڑا دینے والی تھی۔

وہ بڑبڑانے لگا۔ "مجھ سے بڑی بھول ہوتی رہی۔ اقتدار کے نشے میں معمولی مہروں کو نظر انداز کرتا رہا۔ ایڈووکیٹ سلطان احمد میرے قدموں میں بچھا رہتا تھا۔ جب مجھے چھوڑ کر سلامت علی کی جوتیوں میں گیا' تب ہی یہ یاد رکھنا چاہئے تھا کہ بلوری کا کیس اس کے حوالے کیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ میں نے اسے داشتہ بنا کر رکھا ہے۔ جب چاہتا ہوں' جیل کی چار دیواری سے نکال کر اپنے پاس بلا لیتا ہوں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اسی طرح بڑبڑانے لگا۔ "وہ میرا بہت بڑا راز... بہت بڑی کمزوری لے کر دشمن کے پاس گیا اور میں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ ہم جیسے

سیاستدان اسی غرور میں مارے جاتے ہیں کہ جب چاہیں گے' سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر دیں گے۔"

پھر اس نے سوچا۔" جسے ٹھوکریں مار چکا ہوں۔ اسے واپس اپنے قدموں میں لانا ہوگا۔ اس کا سر سہلانا اور اسے پچکارنا ہوگا۔ اگر وہ بلوری کو اپنے قابو میں رکھے گا تو وہ عدالت میں کبھی میرے خلاف بیان نہیں دے گی۔ مگر... کس طرح اس سے رابطہ کیا جائے؟"

ان دنوں موبائل فون نہیں تھے۔ رابطہ کرنے کے معاملے میں لوگ گھروں کے اور دفتروں کے فون تک محدود رہتے تھے۔ اس نے پرسنل سیکرٹری کو بلا کر کہا۔ "معلوم کرو' جس کم بخت سلطان احمد کو میں نے ایڈووکیٹ بنایا' وہ آج کل کہاں ہے اور اس کا فون نمبر کیا ہے؟ سلامت علی کو معلوم نہ ہو کہ میں سلطان احمد سے بات کرنے والا ہوں۔"

وہ حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ چوہدری نے فون کے ذریعے ہوم منسٹر سے رابطہ کیا۔ اسے اپنے مختصر سے حالات بتائے اور کہا۔ "جیل کی ایک قیدی لڑکی بلوری کے سلسلے میں اپوزیشن والے انکوائری کرانا چاہیں گے۔ آپ کسی بھی طرح انکوائری روک دیں۔ میرے خلاف کوئی فائل تیار نہ کرنے دیں۔"

ہوم منسٹر نے کہا۔ "ہم اپنی پارٹی کی نیک نامی قائم رکھنے کے لئے آپ کی بھرپور مدد کریں گے۔ لیکن بیشتر پولیس اور انٹیلی جنس کے افسران دیانت دار اور فرض شناس ہوتے ہیں۔ ان کی کارکردگی' ان کی ملازمت اتنی پکی ہوتی ہے کہ ہم ان کے سروس ریکارڈ میں کسی طرح کا دھبہ لگا کر نہ تو موجودہ عہدوں سے نیچے گرا سکتے ہیں اور نہ ہی کہیں ان کا ٹرانسفر کرا سکتے ہیں۔"

چوہدری دلاور حیات نے اپنی پارٹی کے لیڈر سے بات کی۔ اس سے کہا۔ "میری پوزیشن بہت ہی خطرے میں ہے۔ اگر بلوری کے سلسلے میں میرا نام لیا جائے گا اور انکوائری شروع ہوگی تو میں قانون کے شکنجے میں آ جاؤں گا۔ مجھ پر ایسا شرمناک الزام ہوگا کہ جیل میں رہ کر بھی الیکشن نہیں لڑ سکوں گا۔ میرا مخالف امیدوار میرے علاقے سے باآسانی نیشنل اسمبلی میں پہنچ جائے گا۔"

پارٹی لیڈر نے کہا۔ "ایسا تو ہم ہونے نہیں دیں گے۔ ہمارا ووٹ بینک کم نہیں ہوگا۔

اسے بڑھنا چاہئے۔ آپ قانونی داؤ پیچ لڑائیں۔ اپنے کیس کو کسی حد تک کمزور کرنے کی کوشش کریں۔ میں آپ کے سیاسی مخالفین سے نمٹنے کے لئے جوڑ توڑ شروع کر رہا ہوں۔"

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے' ایک چیونٹی کو کچلنے کے لئے ہاتھیوں کی فوج تیار ہونے لگتی ہے۔ سلامت علی پریس رپورٹرز اور فوٹو گرافرز کے ساتھ جیل کے احاطے میں آ گیا۔ جیلر نے کہا۔ "سلامت علی صاحب! آپ بلوری سے مل سکتے ہیں۔ لیکن ہم کسی پریس رپورٹر کو اس سے بات کرنے نہیں دیں گے۔ نہ ہی اس کی تصویریں اتارنے دیں گے۔"

سلامت علی نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ یہ حضرات باہر میرا انتظار کریں گے۔ لیکن ابھی انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسران یہاں پہنچ رہے ہیں۔ آپ انہیں قانونی کارروائیاں کرنے سے کیسے روک سکیں گے؟"

جیلر بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اپنی پریشانیوں کو چھپا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "پہلے آپ بلوری سے ملاقات کریں۔ پھر بعد میں دوسری باتیں ہوں گی۔"

وہ دونوں وہاں سے اس کمرے میں آ گئے' جہاں بلوری ہاتھ میں چاقو لئے کھڑی تھی۔ گریبان سے اوپر سینے کی صاف وشفاف جلد پر خون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔

سلامت علی نے کہا۔ "بلوری! میں آ گیا ہوں۔ اب تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہئے۔"

پھر اس نے جیلر سے پوچھا۔ "یہ زخمی ہے۔ آپ نے اس کی مرہم پٹی کیوں نہیں کرائی؟"

جیلر سے پہلے بلوری نے کہا۔ "میں کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دوں گی۔ پہلے آپ میرے معاملات سنبھالیں گے۔ اس کے بعد جو کہیں گے' میں وہی کروں گی۔"

سلامت علی نے اس کے ہاتھ میں چاقو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس وقت یہ چاقو ایٹم بم سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ سرکاری کرسیوں کو ہلا رہا ہے۔ تم جو کہو گی' جیلر کو وہی کرنا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں' جس حالت میں چاقو لئے کھڑی ہو۔ اس حالت میں تمہاری تصویریں اتاری جائیں اور بیان لیتے وقت بھی تمہاری مختلف تصویریں اتاری جائیں۔"

بلوری نے جلدی سے کہا۔ "آپ جو کہہ رہے ہیں' یہی میرا مطالبہ ہے۔ پریس والوں کو یہاں آنا چاہئے۔"

سلامت علی نے کہا۔ ''وہ سب میرے ساتھ آئے ہیں۔ آپ کیا کہتے ہیں مسٹر جبار خان! بلوری کا مطالبہ تسلیم کریں گے؟ انہیں اندر بلائیں گے؟''

جبار خان نے حکم دیا کہ پریس رپورٹرز اور فوٹو گرافرز کو کمرے میں بلایا جائے۔ ایسے ہی وقت انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسران وہاں پہنچ گئے۔ جبار خان کی جیسے کمر ٹوٹ گئی۔ وہ ایک کرسی پر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

وہاں سب ہی بلوری سے دور تھے۔ پہلے اس کی تصویریں اتاری گئیں۔ پھر اس سے طرح طرح کے سوالات کئے جانے لگے۔ سوال و جواب کی ریکارڈنگ ہونے لگی۔ بلوری شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر چوہدری دلاور حیات کے بارے میں تفصیلی بیان دے رہی تھی کہ کس طرح اس نے ایک شریف خاندان کی کنواری لڑکی پر بدکاری کا الزام لگا کر اسے جیل میں پہنچایا؟ پھر راتوں کو اپنے پاس بلاتا رہا۔ جیلر بڑی رازداری سے رات کے وقت اسے چوہدری کی کوٹھی میں پہنچاتا رہا ہے۔

انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسر نے پوچھا۔ ''مسٹر جبار خان! آپ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟''

جبار خان نے کہا۔ ''بلوری مجھے الزام دے رہی ہے۔ میں نہیں جانتا' یہ گناہوں کا کھیل کس طرح کھیلتی رہی؟ رات دس بجے کے بعد میں ڈیوٹی پر نہیں رہتا۔ صبح فجر کی نماز پڑھنے کے بعد یہاں آتا ہوں۔ یہ آہنی سلاخوں کے پیچھے رہ کر بھی رات کے وقت کس طرح اپنے یاروں کے پاس جاتی تھی' میں نہیں جانتا۔''

اسسٹنٹ جیلر اور وہاں کے دوسرے اسٹاف کو بلا کر سوالات کئے گئے۔ ان سب نے بھی یہی کہا' وہ بلوری کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کہ وہ جیل کی چار دیواری میں رہ کر کس طرح اپنا منہ کالا کرتی رہی ہے؟

ان سب نے چوہدری دلاور حیات کا نام نہیں لیا۔ اس کے خلاف کوئی بیان نہیں دیا۔ انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''مسٹر جبار خان! آپ پورے جیل خانے کے انچارج ہیں۔ یہاں کی تمام ذمہ داریاں آپ پر ہیں۔ ڈیوٹی رات کو کریں یا دن کو کریں۔ دن رات یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے' قانوناً اس کا جواب آپ ہی سے طلب کیا جائے گا۔ فی الحال آپ

کو زیر حراست رکھا جائے گا۔ آپ پولیس اور انٹیلی جنس والوں کی نگرانی میں اپنے جیل اسٹاف کا محاسبہ کریں گے۔ بلوری کی پوری رپورٹ تیار کریں گے۔''

اسسٹنٹ جیلر اور دوسرے اعلیٰ عہدیدار بھی معتوب ہوئے۔ بلوری کے بارے میں یہ طے کیا گیا کہ اسے پولیس اور انٹیلی جنس والوں کی نگرانی میں رکھا جائے گا اور پولیس ڈیپارٹمنٹ کا ذمہ دار ڈاکٹر بلوری کو اٹینڈ کیا کرے گا۔

جبار خان نے کہا۔ ''میں زیر حراست ہوں۔ مگر کیا آخری بار اپنی وائف اور بچوں سے باتیں کر سکتا ہوں؟''

اسے اجازت دی گئی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر چوہدری دلاور حیات کے نمبر ڈائل کئے۔ ادھر چوہدری بے چینی اس کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ فوراً ہی ریسیور اٹھا کر بولا۔ ''ہیلو.... میں بول رہا ہوں۔''

جبار خان نے بڑی مکاری سے کہا۔ ''ہاں بیٹے حماد...! میں نے تمہیں اور تمہاری ممی کو بلوری کے متعلق بتایا تھا۔ یہ معاملہ کچھ ایسا الجھ گیا ہے کہ مجھے حراست میں لیا جا رہا ہے۔ اب میں فون پر باتیں بھی نہیں کر سکوں گا۔ ویسے میں نے اور میرے پورے اسٹاف نے یہ بیان دیا ہے کہ بلوری رات کو جیل سے باہر کبھی نہیں گئی۔ اس چار دیواری میں رہ کر کس طرح منہ کالا کرتی رہی' یہ ہمیں معلوم نہ ہو سکا۔ وہ خواہ مخواہ چوہدری دلاور حیات صاحب پر الزام لگا رہی ہے۔ ان کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

دوسری طرف چوہدری نے خوش ہو کر کہا۔ ''شاباش جبار خان! تم میرے بہت کام کے آدمی ہو۔''

ادھر انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسر نے گھور کر جبار خان سے پوچھا۔ ''یہ تم اپنے بیٹے سے چوہدری کی باتیں کیوں کر رہے ہو؟ کیا بیٹے کے ذریعے چوہدری تک یہ پیغام پہنچا رہے ہو کہ اس کیس میں اس کی پوزیشن کمزور نہیں ہے؟ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے؟ لاؤ ریسیور مجھے دو۔ یقیناً تم چوہدری صاحب سے باتیں کر رہے ہو۔''

انٹیلی جنس کا افسر ریسیور لینے کے لئے آگے بڑھا۔ جبار خان نے اسے کریڈل پر رکھ کر رابطہ ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے مجھے ایک فون کرنے کی اجازت دی۔ بہت

بہت شکریہ...اس کے بعد مجھے فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اعلیٰ افسر کے حکم سے اسے حراست میں لے لیا گیا۔ بلوری نے آگے بڑھ کر اپنا چاقو اعلیٰ افسر کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔ "خدا کا شکر ہے... آپ جیسے ذمہ دار اور فرض شناس افسران ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ اگرچہ میں بری طرح برباد ہو چکی ہوں۔ کسی کو منہ دکھانے کی قابل نہیں رہی ہوں۔ پھر بھی یہ اطمینان ہے کہ میری فریاد سنی جائے گی اور ظالموں کو کڑی سے کڑی عبرتناک سزائیں دی جائیں گی۔"

اس بوڑھے ڈاکٹر کو بھی حراست میں لیا گیا تھا۔ اس کے کمپاؤنڈر نے بلوری کے زخموں کی مرہم پٹی کی۔ اس نے سلامت علی سے پوچھا۔ "میری مدد کرنے کے لئے آپ سب آئے ہیں سلطان احمد کیوں نہیں آیا؟"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ اس نے جواب دیا۔ "تمہارا سلطان احمد لندن میں ہے۔"

پھر اس نے بلوری کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا اس نے تمہیں بتایا ہے' وہ میرا ہونے والا داماد ہے؟"

وہ بولی۔ "ہاں۔ بتایا ہے۔ وہ صاف اور سیدھی باتیں کرنے والا سچا اور کھرا آدمی ہے۔ اس نے کہا تھا' جس راستے پر چل رہا ہے' وہاں اتنی طاقت' اتنی توانائی اور ایسے مضبوط ذرائع حاصل کرے گا کہ یہاں سے میری رہائی ممکن ہو جائے گی اور میں دیکھ رہی ہوں' ایسا ہی ہو رہا ہے۔"

"بے شک۔ میں تمہیں رہائی دلاؤں گا۔ یہ بتاؤ' رہائی پانے کے بعد تم کہاں جاؤ گی؟ سنا ہے' تمہارا کوئی نہیں ہے۔ کس کے سہارے زندگی گزارو گی؟"

"ربّ نے مجھے پیدا کرنے کے بعد ماں باپ کا سہارا دیا۔ جب بہت زیادہ مصائب میں گرفتار ہوئی تو سلطان احمد کو فرشتہ بنا کر بھیج دیا۔ اس کے بعد آپ سب میرے مددگار بن کر آ گئے ہیں۔ مجھے صرف اپنے ربّ کا سہارا ہے۔ یہاں سے رہائی پانے کے بعد وہی میرے لئے مزید سہارے پیدا کرے گا۔"

سلامت علی نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ "اپنی عقل سے بھی کچھ سوچنا چاہئے۔

اپنی تدبیر سے بھی ایک اچھا مستقبل بنانا چاہئے۔ تم جیسی بے سہارا لڑکی کا ایک ہی مضبوط سہارا ہوتا ہے' وہ یہ کہ کسی سے شادی کر لو۔ تم اس قدر بدنام ہو چکی ہو کہ شاید کوئی تمہیں شریک حیات بنانا نہیں چاہے گا۔ لیکن ساری زندگی کے لئے سہارا بننا ضرور چاہے گا۔"

"میں نہیں جانتی' رہائی کے بعد میری زندگی کیسے گزرے گی؟ یہ بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی تو موجودہ حالات سے نمٹنا ہے۔ پھر آگے کی سوچوں گی۔"

سلامت علی اس سے باتیں کرنے کے بعد اپنی حویلی میں آ گیا۔ اس کے متعلق سوچنے لگا تو عقل نے سمجھایا۔ "بلوری سے بات نہیں بنے گی۔ شہناز نہ جانے کب تک سلطان احمد کو میرا داماد بنائے رکھے گی؟ تب تک میں بلوری کو کسی طرح بھی حاصل نہیں کر سکوں گا۔ کیونکہ سلطان احمد بہت ہی جذباتی طور پر اس سے وابستہ ہے۔ اسی کی خاطر میری بیٹی کا تابعدار بنا ہوا ہے۔"

شہناز نے بلوری کو اپنی سوکن بنانے کا جھوٹا وعدہ کیا تھا۔ پلاننگ یہ تھی کہ اسے نہ جیل سے باہر آنے دیا جائے گا' نہ وہ اس کی سوکن بن پائے گی۔ اب ایک باپ کو بیٹی کے جذبات اور اس کی ضرورت کے مطابق یہی کرنا تھا۔

سلطان احمد' شہناز' سلامت علی اور چوہدری دلاور حیات کے لئے پنڈ کی ایک معمولی سی لڑکی بہت اہم تھی۔ صحیح کھیل کھیلا جاتا تو وہ سلطان احمد کے حصے میں آتی۔ مگر صحیح راستے پر کون چلتا ہے؟ غلط راستے پر سب ایک دوسرے کو بھٹکاتے ہیں۔ بلوری اس وقت تک سلامت علی کے لئے اہم تھی' جب تک وہ عدالت میں چوہدری کے خلاف بیان نہ دیتی۔

چوہدری کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کے بعد اس کا دوسرا منصوبہ یہ تھا کہ بلوری پر بدکاری کا الزام ثابت ہو رہا ہے۔ وہ ناجائز بچے کی ماں بن چکی ہے۔ اس بدکاری کے الزام کو زیادہ سے زیادہ مستحکم بنا کر اسے جیل میں ہی رہنے دیا جائے گا۔ شہناز جب چاہے گی' سلطان احمد کو اپنی زندگی سے نکال باہر کرے گی۔ سلامت علی الیکشن میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد بلوری سے اسی طرح فیضیاب ہوتا رہے گا' جس طرح اب تک چوہدری دلاور حیات ہوتا رہا تھا۔

سلطان احمد کو بلوری کے موجودہ معاملات سے بے خبر نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ لہٰذا

سلامت علی نے فون کے ذریعے اسے تمام تفصیلات بتائیں۔ سلطان احمد نے کہا۔ ''اتنی بڑی بات ہوگئی' آپ نے مجھے فوراً اطلاع کیوں نہیں دی؟''

''مجھے اتنا وقت ہی نہیں ملا۔ اچانک ہی بلوری نے اطلاع دی تھی۔ پہلے اس کی مدد کرنی تھی' قانونی طور پر مجھے مضبوط محاذ بنانا تھا۔ یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ تم یہ دیکھو کہ میں نے کتنی کامیابی سے یہ کھیل کھیلا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ بلوری کو تحفظ فراہم کیا ہے۔ جیلر کو اور وہاں کے اسٹاف کو زیرِ حراست اور زیرِ نگرانی رکھا گیا ہے۔ بلوری محفوظ رہے گی۔ اس کا حمل گرایا نہیں جائے گا۔ بچہ سلامت رہے گا۔ کتنی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد تمہیں اطلاع دے رہا ہوں۔ اب تم جب چاہو' یہاں آسکتے ہو۔''

''میں پہلی فلائٹ سے وہاں پہنچنے کی کوشش کروں گا اور بلوری کا مقدمہ خود لڑوں گا۔''

''نہیں سلطان احمد! یہ اب صرف تمہارا نہیں' ہمارا بہت اہم سیاسی معاملہ ہوگیا ہے۔ ہمارے پارٹی لیڈر کا بہت ہی تجربہ کار وکیل اس کا مقدمہ لڑے گا۔ تم صرف مقدمے کی کارروائیاں دیکھتے رہو گے۔ ہم چوہدری کو اقتدار کی کرسی سے گرا کر بلوری کو جیل سے باہر نکال لائیں گے۔''

سلطان یہی چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح بلوری جیل سے رہا ہو جائے۔ فی الحال اس کی سمجھ میں یہی آ رہا تھا کہ سلامت علی نہایت دیانتداری سے اس کی رہائی کے لئے کوششیں کر رہا ہے۔ لہٰذا وہ مطمئن ہوگیا۔ دوسرے ہی دن شہناز سے رخصت ہو کر ملتان آگیا۔

چوہدری دلاور حیات نے سلطان کے متعلق معلومات حاصل کی تھیں۔ پتہ چلا' اس کی ٹھوکروں سے نکل کر جانے والا واپس نہیں آئے گا۔ کیونکہ سلامت علی اسے اپنا داماد بنانے والا ہے۔ سلطان احمد بہت بڑی کامیابی حاصل کر رہا تھا۔ لہٰذا چوہدری نے سمجھ لیا' وہ اس کے کام نہیں آئے گا۔

اقتدار کی کرسی بہت مضبوط ہوتی ہے۔ جب تک اس پر بیٹھنے والا جم کر بیٹھا رہتا ہے' تب تک سب اس کی جی حضوری کرتے ہیں اور اسی کی خوشنودی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ چوہدری کی پوزیشن اس لحاظ سے ذرا مضبوط تھی کہ جیلر جبار خان اور دوسرے اسٹاف نے اس کے خلاف کوئی بیان نہیں دیا تھا۔ اس بات سے صاف انکار کیا تھا کہ بلوری کو رات

کے وقت جیل کی چاردیواری سے باہر بھیجا جاتا تھا۔ ان میں سے کسی نے اس جرم کا اقرار نہیں کیا تھا۔ فی الحال چوہدری بہ خیریت تھا۔ اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ ایک شعبے کا وزیر تھا۔ کسی ثبوت کے بغیر اس کے خلاف اخبار میں کچھ لکھا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

جبار خان کی جگہ جو دوسرا جیلر آیا اور نیا اسٹاف رکھا گیا' وہ بھی چوہدری کی اور موجودہ حکمرانوں کی جی حضوری کرنے والے تھے۔ چوہدری نے انہیں حکم دیا تھا کہ بلوری کے ساتھ محبت اور ہمدردی سے پیش آتے رہیں۔ اسے پہلے کی طرح تمام سہولتیں دی جائیں اور یہ سمجھایا جائے کہ وہ چوہدری کی حمایت میں بیان دے کر ہی اپنے بچے کے ساتھ صحیح سلامت جیل سے رہا ہو سکتی ہے۔

چوہدری کا ایک خاص آدمی ہر دوسرے تیسرے دن بلوری سے ملنے آتا تھا۔ اسے طرح طرح سے سمجھاتا تھا کہ سلطان احمد اور سلامت علی سب ہی کمزور مہرے ہیں۔ کوئی چوہدری کے سامنے ٹھہر نہیں پائے گا۔ اگر وہ اس کی حمایت میں بیان دے گی تو فائدے میں رہے گی۔ رہائی کے بعد بھی اسے رہنے کے لئے ایک مکان اور لاکھوں روپے دیئے جائیں گے۔

سلامت علی اور انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسران کی طرف سے بلوری کی خاص نگرانی ہو رہی تھی۔ سلطان احمد لندن سے آگیا تھا۔ اسے بلوری سے ملاقات کرنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ کیونکہ وہ انٹیلی جنس والوں کی طرف سے آتا تھا۔ اس لئے نیا جیلر اس کی آمد پر اعتراض نہیں کرتا تھا۔

تقریباً ڈھائی ماہ بعد سلطان سے سامنا ہوا تو بلوری خوشی سے کھل گئی۔ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''تم سچ مچ مجھے دل و جان سے چاہتے ہو۔ میں تمہیں کبھی بھلا نہیں پاؤں گی۔ تمہاری محبت سے اور مہربانیوں سے میرا بچہ محفوظ ہے اور مجھے رہائی پانے کا یقین ہو رہا ہے۔''

''مجھے بھی یقین ہے۔ میں نے تمہاری رہائی کی خاطر سلامت علی اور اس کی بیٹی سے جو سودا کیا ہے' اس کے مطابق عمل کر رہا ہوں۔ انہیں شکایت کا موقع نہیں دے رہا

ہوں۔ اس لئے سلامت علی بڑی دیانتداری سے تمہاری رہائی کی کوششیں کر رہا ہے۔
اپوزیشن پارٹی کا ایک بہت بڑا وکیل تمہارا کیس لڑنے والا ہے۔ یقیناً ہماری جیت ہوگی۔"

پھر اس نے بلوری کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "تمہیں ایک خوشخبری سناتا ہوں۔ شہناز
نے وعدہ کیا ہے' رہائی کے بعد تمہیں کہیں جانے نہیں دے گی۔ بلکہ اپنی سوکن بنا کر لے
آئے گی۔ یعنی تم میری دلہن بنوگی۔"

بلوری نے بڑی بے یقینی سے اسے دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تمہیں یقین نہیں
ہو رہا ہے؟ جبکہ شہناز نے خود اپنی زبان سے کہا ہے۔ میں تمہارے لئے ایسی دیوانگی کا
مظاہرہ کر چکا ہوں کہ وہ میرا دل جیتنے کے لئے تمہیں سوکن کی حیثیت سے قبول کرے گی۔"

وہ بولی۔ "عورت بہت مجبور ہو کر کسی سوکن کو قبول کرتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں
آتا' شہناز کی کیا مجبوری ہے؟ جبکہ تم اس کے تابعدار بنے ہوئے ہو۔ اسے کسی معاملے میں
مجبور نہیں کرتے ہو۔"

"میں نے کہا نا' وہ میرا دل جیتنے کے لئے تمہیں قبول کرنا چاہتی ہے۔"

"جب وہ تمہیں اپنی دولت سے جیت چکی ہے۔ ہر طرح سے اپنا پابند بنا چکی
ہے تو پھر تمہارا دل جیت کر کیا کرے گی؟"

اس نے ذرا سوچتے ہوئے' سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ جسے ہارنے
کا خوف ہوتا ہے' وہی جیتنے کا سامان کرتے ہیں۔ وہ بہت ہی بے خوف' نڈر' مغرور اور
سرپھری ہے۔ مگر پچھلے دو ماہ سے دیکھتا آ رہا ہوں' وہ میری ہر بات مان لیتی ہے۔ میں نہیں
جانتا' اس کے دل میں کیا ہے؟ بس اتنا جانتا ہوں کہ اس نے تمہیں اپنی سوکن بنانے کا وعدہ
کیا ہے۔"

"کسی کے دل میں کیا ہے' یہ ہم نہیں جانتے۔ کیا تم جانتے ہو' سلامت علی کے دل
میں کیا ہے؟ کیا وہ کسی لالچ کے بغیر' کسی مقصد کے بغیر مجھے یہاں سے رہائی دلائے گا؟"

"یقیناً اس کا مقصد یہی ہے کہ میں ایک لیبل کے طور پر اس کی بیٹی کا شوہر بن
کر رہوں۔"

وہ بولی۔ "لیبل تو کہیں سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ تمہاری طرح کتنے ہی خوبرو

اور اسمارٹ نوجوان تم سے زیادہ ضرورت مند ہوتے ہیں۔ تم نہ سہی اور سہی۔ سلامت علی بیٹی
کے لئے کسی کو بھی خرید سکتا ہے۔"

سلطان احمد نے کہا۔ "ہم کچھ اور سوچتے ہیں' عورتوں کی چھٹی حس کچھ اور سمجھتی
ہے۔ تم کیا سمجھ رہی ہو؟"

"وہی سمجھ رہی ہوں' جو حالات سمجھا رہے ہیں۔ سلامت علی بھی دوسرا چوہدری
دلاور حیات ہے۔ پتہ نہیں کیوں' کرسی اور بستر کے معاملے میں سیاستدانوں کی دُم ٹیڑھی ہی
رہا کرتی ہے۔ اس نے ابھی کھل کر کچھ نہیں کہا ہے۔ مگر یہ اشارہ دے رہا ہے کہ رہائی کے بعد
ساری عمر مجھے سہارا دے سکتا ہے۔ تم عورتوں کی چھٹی حس کی بات کر رہے ہو۔ میری اسی حس
نے اس کے چور لہجوں اور تیوروں کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔"

وہ ناگواری سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "یہ ہمارا ہاتھ پکڑ کر سہارا دینے والے
بڑے لوگ بڑے ہی دوغلے اور کمینے ہوتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "دیکھو... غصے اور جوش میں نہ آنا۔ وہ جلد ہی میرا مقدمہ شروع کرانے
والا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم اس پر کسی طرح کا شبہ اور بے اعتمادی ظاہر کرو اور میری بات بنتے
بنتے بگڑ جائے۔"

"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں تمہاری خاطر بدستور جی حضوری کرتا رہوں گا۔"

"میں اتنا چاہتی ہوں کہ بڑے لوگوں کو خاص طور پر سیاستدانوں کو اپنا دوست نہ
سمجھو' ان پر اندھا اعتماد نہ کرو۔ میں یہاں چار دیواری میں رہ کر دیکھ نہیں سکتی کہ کون میرے
لئے کیا کر رہا ہے؟ تم ان کے ساتھ رہتے ہو۔ بہت کچھ دیکھ سکتے ہو' بہت کچھ سمجھ سکتے ہو۔"

وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ "میں ان سے
دھوکہ نہیں کھاؤں گا۔ ان باپ بیٹی کی ایک بہت بڑی کمزوری میرے ہاتھوں میں ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "کیسی کمزوری؟"

"مجھے سلامت علی پر کبھی شبہ نہیں رہا۔ یہی سوچتا رہا کہ وہ اپنی ضرورتیں پوری
کرنے کی خاطر میرے کام آتا رہے گا۔ مگر تم ٹھیک کہتی ہو' ان بڑے لوگوں کو اور خاص طور پر
سیاستدانوں کو سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ کس وقت پٹری بدل لیتے ہیں' ان کی تبدیلیاں

سمجھ میں نہیں آتیں۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ "میں نے شہناز پر کبھی بھروسہ نہیں کیا۔ وہ اتنی مغرور اور سرپھری ہے کہ کسی وقت بھی مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک سکتی ہے۔ میں نے پہلی ملاقات میں، پہلی رات کو اپنی حرکتوں سے اس پر یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ تم سے کمتر ہے، کبھی تمہاری جگہ نہیں لے سکے گی۔ تب اس نے ایک قیامت برپا کردی تھی۔ اپنے گھر کی چیزوں کو توڑنے پھوڑنے لگی تھی۔ مجھے وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ ہم دونوں کو گالیاں دیتی رہی تھی۔"

وہ ذرا چپ ہوا۔ پھر بلوری کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "ابھی مجھے یاد آرہا ہے۔ جب باپ کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے اس کی بیٹی کی انسلٹ کی ہے تو وہ بھی مجھے فون پر گالیاں دینے لگا تھا۔"

بلوری نے حیرانی سے پوچھا۔ "اتنی بڑی بات ہوگئی اور تم پھر بھی سلامت علی پر بھروسہ کررہے ہو؟"

وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "کبھی کبھی عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ بعد میں دونوں باپ بیٹی نے مجھ سے معافی مانگی تھی۔ شہناز نے روتے روتے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے کرتے مجھے اپنی طرف مائل کرلیا۔ اسی رات جب اس نے یہ کہا کہ وہ تمہیں میری دلہن بنائے گی اور اپنی سوکن کی حیثیت سے قبول کرے گی۔ تب میرے دل سے تمام غبار دُھل گیا۔ میری نظروں میں اس کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔"

"وہ تمہارے لئے کتنی ہی بدل جائے، مگر اس کا غرور اور تندمزاجی نہیں بدلے گی۔"

"ہاں یہ بات میرے دل و دماغ میں چھپی ہوئی تھی کہ وہ مغرور اور سرپھری لڑکی کسی وقت بھی مجھے ٹھوکریں مار سکتی ہے۔ مجھ سے پہلے دو بوائے فرینڈز کو ٹھکرا چکی ہے۔ اس کی یہ ساری منفی باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ اس لئے میں نے اس کی ایک شرمناک ویڈیو فلم اپنے پاس چھپا کر رکھی ہے۔"

بلوری نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ سمجھنا چاہتی تھی کہ شرمناک فلم سے کیا مراد ہے؟ وہ اسے بتانے لگا۔ کس طرح شہناز جب نشے میں ہوتی ہے اور اپنے

حسن و شباب کو ہر زاویے سے دیکھنا چاہتی ہے تو بے لباس ہوتے ہوئے اپنی ویڈیو فلم تیار کراتی ہے۔ کبھی کبھی انہیں دیکھ کر خوش ہوتی رہتی ہے کہ وہ کتنی حسین اور پرکشش ہے۔

بلوری نے پوچھا۔ "وہ ویڈیو فلم تم نے چھپا کر رکھی ہے؟"

اس نے زیرلب مسکراتے ہوئے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ بلوری نے پوچھا۔ "تم اسی وجہ سے کہہ رہے تھے کہ ان باپ بیٹی کی ایک کمزوری تمہارے ہاتھوں میں ہے؟"

اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ "تم اس کمزوری سے کس طرح فائدہ اٹھاؤ گے؟ کیا انہیں بدنام کرنے کے لئے پریس والوں کو وہ فلم دکھاؤ گے؟"

"بے شک جب وہ تمہارے ساتھ ننگا پن کریں گے تو..."

وہ آگے نہ بول سکا۔ وہ میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ "بس کرو۔ جب تم بھی ننگے پن پر اتر آؤ گے تو ان میں اور تم میں کیا فرق رہے گا؟ تم صرف شہناز کو نہیں، بلوری کو بھی ننگا کرو گے۔ وہ بڑے لوگ تو ہمارے بدن کو نمائش کی چیز بناتے ہی ہیں۔ کیا تم بھی یہی کرو گے؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ "جانتے ہو جب پہلی بار میرے کپڑے اتارے گئے تو مجھ پر کیا گزری تھی...؟ میں تو اسی رات مرگئی تھی اور اس رات سے آج تک اپنا مردہ اٹھائے پھر رہی ہوں۔"

اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ "چوہدری دلاور حیات ہو یا سلامت علی جیسے سیاستدان... جتنی بھی برائیاں ہیں، وہ ہم سے شروع کرتے ہیں۔ اپنے گھر سے کیوں شروع نہیں کرتے؟ اس لئے کہ شرم و حیا کو سمجھتے ہیں۔ مگر صرف اپنی ماں، بہن اور بیٹی کی حد تک۔ تمام مردوں نے یہ قانون بنایا ہے کہ شرم و حیا کے پیش نظر عورت کا بدن صرف ایک مرد کے آگے کھولنا چاہئے۔ باقی تمام مردوں کے لئے وہ اچھوتی ہے، مقدس ہے۔ کیونکہ وہ ماں بھی ہے، بہن بھی ہے، بیٹی ہے۔ جب انہوں نے یہ قانون بنایا ہے، اس کے تقدس کو تسلیم کیا ہے تو پھر کیوں اسے ننگا کرتے ہیں؟"

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ وہ بڑی شرمندگی سے بولا۔ "میں گھر جاتے ہی اسے جلا ڈالوں گا۔"

"تم یہی کرو گے۔ ورنہ میں تمہارا منہ نہیں دیکھوں گی۔"

وہ جلدی سے سر اٹھا کر بولا۔ ''ایسا نہ کہو۔ میں تمہیں دیکھنے کے لئے ہی جی رہا ہوں۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔ مجھے بتاؤ' میں کب تک تمہاری پائل سے بہلتا رہوں گا؟''

''میں کیا جواب دوں؟ ہم نہیں جانتے' ہمارے مقدر میں کیا لکھا ہے؟ میرے مقدمے کا فیصلہ کیا ہوگا؟ وہ جو بڑے لوگ ہمارا سہارا بنے ہوئے ہیں' وہ کس مرحلے پر پہنچ کر کس طرح ہمیں دھوکہ دیں گے؟ ہم نہیں جانتے۔ لیکن انہیں شرمناک طریقے سے بلیک میل نہیں کریں گے۔ تم مجھے ہار جاؤ گے۔ ان کی ہوس کے جہنم میں جھونک دو گے۔ لیکن کبھی کسی عورت کو ننگا نہیں کرو گے۔''

''تم درست کہتی ہو۔ ہم چھوٹے لوگ ہی سہی۔ مگر ہمارا ایمان چھوٹا نہیں ہے۔ ہم اپنے ایمان میں استحکام پیدا کریں گے۔ صرف خدا پر بھروسہ کریں گے۔''

اس ملک کے لوگوں کی یہی مجبوری ہے کہ وہ ایمان کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ صرف خدا پر بھروسہ کرتے ہیں۔ سیاستدانوں کے خلاف نہ کوئی سیاسی ہتھکنڈہ استعمال کرتے ہیں' نہ ظالموں کے خلاف کوئی شرمناک چال چلتے ہیں۔ ایمان کو مستحکم بنائے رکھنا اور اللہ پر بھروسہ کرنا انہیں بہت مہنگا پڑتا رہتا ہے۔ کمال ہے کہ قیام پاکستان سے اب تک وہ یہ مہنگائی قبول کرتے آرہے ہیں۔ مگر شیطانوں کے مقابلے میں شیطانی چالیں منظور نہیں ہیں۔

سلطان احمد نے گھر آکر اس ویڈیو فلم کو جلا ڈالا۔ یہ شرافت اور ایمان کا تقاضہ ہے۔ ہم لڑیں گے۔ ضرور لڑیں گے مگر صرف اللہ کے بھروسے پر اور ایمان کے ہتھیار سے...

شہناز ایک ہفتے کے اندر ہی سلطان احمد سے ملنے چلی آئی۔ باپ نے پوچھا۔ ''تم اچانک آئی ہو۔ خیریت تو ہے؟''

''پاپا...! میں سلطان احمد کے معاملے میں بہت سیریس ہوں۔ پہلے سوچا تھا' جب چاہوں گی ٹھکرا دوں گی۔ لیکن اس نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ میرے اندر سما کر رہ گیا ہے۔ میں اسی کے ساتھ اپنی لائف گزاروں گی۔''

''تو پھر یہاں دھوم دھام سے شادی کے انتظامات کرنے ہوں گے۔ لیکن یہ الیکشن کے بعد ہی ہوگا۔''

''الیکشن چھ ماہ بعد ہوں گے اور میں اتنا انتظار نہیں کروں گی۔ ابھی شادی کروں

گی اور ابھی اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔''

باپ نے سمجھایا۔ ''بیٹی! یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ہمارا سیاسی خاندان پورے ملک میں مشہور ہے۔ میری ایک خاص سیاسی اہمیت ہے۔ اگر دھوم دھام سے شادی نہ کی گئی تو باتیں بنائی جائیں گی۔ تم کسی معمولی خاندان کی بیٹی ہوتیں تو لندن میں ہی کورٹ میرج کر لیتیں۔''

''میں یہی کہنے والی تھی۔ سلطان احمد کو میں بھی مجبور کروں گی۔ آپ بھی مجبور کریں کہ وہ میرے ساتھ لندن جائے اور کورٹ میرج کرے۔ ہم وہاں جشن منائیں گے۔ آپ بھی دونوں کے لئے لندن آجائیں۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''شہناز! تم تو ہتھیلی پر سرسوں جماتی ہو۔ دیکھ رہی ہو' میں الیکشن کے علاوہ بلوری کے معاملے میں بھی الجھا ہوا ہوں۔ چوہدری کی پوزیشن کمزور کرنا چاہتا ہوں۔ مگر اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ صرف بلوری کا بیان ہی اسے گناہ گار ثابت کر سکتا ہے۔ وہ کم بخت چھٹا ہوا بدمعاش سیاستدان ہے۔ کسی بھی ہتھکنڈے سے اس کا بیان بدلوا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی کورٹ میرج بھی نہیں کروں گی۔ مگر اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔''

اس نے سلطان احمد کو بلایا اور کہا۔ ''میں یہاں ملتان کی گرمی برداشت نہیں کر سکتی۔ میرے ساتھ لندن چلو۔''

اس نے کہا۔ ''کیسی باتیں کر رہی ہو؟ بلوری کا مقدمہ شروع ہو رہا ہے۔ اگلے ہفتے پہلی پیشی ہے۔ جب تک اس کے حق میں فیصلہ نہیں ہوگا' میں یہ شہر چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔''

وہ ناراض ہو کر بولی۔ ''کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ تم بلوری کو پھر اہمیت دے رہے ہو۔''

''میں ہمیشہ ہی اسے اہمیت دیتا رہا ہوں اور یہ بات تم تسلیم کر چکی ہو۔ اسے اپنی سوکن بنانے کے لئے بھی راضی ہو گئی تھیں۔ اب کیا ارادہ ہے؟''

وہ اس کے قریب آکر بولی۔ ''میرے ساتھ لندن چلو۔ وہاں ہمیں معلوم ہوتا رہے گا کہ بلوری کے مقدمے کا فیصلہ کیا ہو رہا ہے؟ جب اس کے حق میں فیصلہ ہوگا' وہ رہا ہو

کر باہر آئے گی تو میں اپنا وعدہ پورا کروں گی۔"

"تم بے تکی باتیں کر رہی ہو۔ یہاں مقدمے کی کارروائی ہو گی۔ مجھے ایک ایک پل کی رپورٹ ملتی رہے گی۔ میں عدالت میں بیٹھ کر تمام کارروائیاں دیکھتا رہوں گا۔ اپنی بلوری کی رہائی کی خوشخبری سنوں گا اور تم ہو کہ مجھے یہاں سے ہزاروں میل دور لے جانا چاہتی ہو۔"

وہ مغرور تھی۔ پہلے کی طرح گرم مزاج تھی۔ اسے غصہ بھی آتا تھا۔ مگر سلطان کے آگے ذرا کمزور پڑ جاتی تھی۔ اس کے اندر کی عورت سمجھاتی تھی کہ اسے کسی ایک مرد سے ہارتے رہنا چاہئے۔ ہار کر جیتنے والی عورت ہی ازدواجی زندگی کا صحیح لطف اٹھاتی ہے اور اس نے پچھلے دو ماہ میں ایک مرد اور عورت کی مسرتیں صرف سلطان احمد سے ہی حاصل کی تھیں۔

وہ اسے چھو کر سمجھنے کی کوششیں کرنے لگی۔ "یہ کیا ہے؟ کیسا مرد ہے؟ دوسروں سے بالکل الگ کیوں لگتا ہے؟ اس کے آگے کوئی اور اچھا کیوں نہیں لگتا؟ میں بچپن میں کھلونے بدل لیا کرتی تھی۔ جوانی میں دو بوائے فرینڈز بدلے۔ مگر اس تیسرے نے مجھ پر مہر لگا دی ہے۔ میں اس کے شکنجے میں ہوں۔ آزاد نہیں ہو سکوں گی۔"

وہ بڑی محبت سے بولا۔ "شہناز! جائز اور ناجائز باتوں کو سمجھا کرو۔ اس وقت جو میں کہہ رہا ہوں وہ بالکل جائز ہے۔ مجھے بلوری کے قریب رہنا چاہئے۔ پلیز مقدمے کا فیصلہ ہو جانے دو۔"

وہ بولی۔ "اچھی بات ہے۔ جب تک فیصلہ نہیں ہوگا۔ میں بھی یہیں رہوں گی۔ تم سے دور ہو کر ایسا لگتا ہے جیسے تم ساتھ نہ رہے تو میں بیمار پڑ جاؤں گی۔"

اس نے گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ وہ اسے بازوؤں میں سمیٹ کر بولا۔ "اگر میں سچ مچ تمہاری کمزوری بن گیا ہوں تو بلوری میری کمزوری ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہیں گے تب ہی بات بنے گی۔"

شہناز نے وہاں رہنے کا فیصلہ کیا تو باپ پریشان ہو گیا۔ کیونکہ وہ سلطان کے بغیر نہیں رہتی تھی۔ اب وہاں شہر والی کوٹھی میں اس کے ساتھ دن رات رہنے والی تھی۔ اس کے ایسے گہرے تعلقات کو پورے خاندان والے دیکھتے۔ پھر خاندان والوں سے یہ بات باہر

والوں تک پہنچتی۔ وہ لندن میں بے لگام رہ کر زندگی گزارتی تھی۔ وہاں کوئی تنقید کرنے والا نہیں تھا۔ مگر یہاں تو بیٹھے بٹھائے بدنامی مول لینے والی بات تھی۔

سلامت علی نے پریشان ہو کر کہا۔ "بیٹی! تم اس طرح نہیں مانو گی۔ اب تو یہی ایک راستہ رہ گیا ہے کہ کل تمام خاندان والوں کو بلایا جائے اور ان کے سامنے تمہارا نکاح سلطان احمد سے پڑھا دیا جائے۔ الیکشن بھی قریب ہیں۔ میں تمہارے حوالے سے کسی بھی بدنامی کو ہوا دینا نہیں چاہوں گا۔"

شہناز نے خوش ہو کر سلطان احمد کو بلایا۔ اسے یہ خوشخبری سنائی۔ اس نے کہا۔ "سوری... مقدمے کا فیصلہ ہونے تک میں سولی پر لٹکا رہوں گا۔ پتہ نہیں میری بلوری کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ کیا ایسی صورت میں تم سے نکاح قبول کر سکوں گا؟"

وہ غصے سے پاؤں پٹخ کر بولی۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر رہے ہو۔"

"مجھے انکار نہیں اقرار ہے مگر ایک ہفتے بعد....."

شہناز نے پوچھا۔ "اگر ہفتے بعد اس کے حق میں فیصلہ نہ ہوا تو....؟"

"تو میں پھر اپیل کروں گا پھر مقدمہ لڑوں گا...پلیز شہناز! بحث نہ کرو۔ میں جانتا ہوں اس مقدمے میں تمہارے پاپا کا پلڑا بھاری ہے۔ چوہدری کمزور ہو رہا ہے۔ تم جس طرح نکاح کے معاملے میں اپنی ضد منوا رہی ہو۔ اسی طرح بلوری کا مقدمہ جیتنے کے لئے اپنی ضد منواؤ گی تو تمہارے پاپا زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ وہ تمہاری خوشی کی خاطر کچھ بھی کریں گے مگر بلوری کو عزت سے رہائی دلائیں گے۔"

وہ قریب آ کر بولا۔ "اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے میرے ساتھ ساری زندگی گزارنا چاہتی ہو تو میری بات مان لو۔ صرف ایک ہفتے کی بات ہے۔"

وہ بولی۔ "ٹھیک ہے۔ میں ایک ہفتے تک انتظار کروں گی۔"

سلامت علی نے کہا۔ "مگر تمہیں میری عزت کا خیال رکھنا ہوگا۔ شادی ہونے تک تم سلطان احمد سے یہاں دن میں صرف ایک بار ایک منگیتر کی حیثیت سے مل سکو گی۔"

اس نے باپ کے سامنے ذرا بے بسی سے سلطان احمد کو دیکھا۔ اس نے اس کا

ہاتھ پکڑ کر باپ سے دور لے جاتے ہوئے بڑی آہستگی سے کہا۔ ''جو محبت ٹھہر ٹھہر کر، ترس ترس کر ملتی ہے۔ اس کا مزہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ پلیز۔ میری بات مان لو۔ ایک ہفتے بعد تم میری دلہن بنو گی اور ضرور بنو گی۔''

اس نے ایک گہری سانس لے کر محبوب کو دیکھا۔ وہ اپنے آگے کسی کی بات نہیں مانتی تھی۔ مگر اس کی ماننے لگی تھی۔ سر جھکا کر بولی۔ ''اچھی بات ہے۔''

صدیاں گزرنے میں دیر نہیں لگتی۔ پھر ایک ہفتہ گزرنے میں بھلا کیا وقت لگتا؟ آخر پہلی پیشی کا دن آ گیا۔ اس روز عدالت کا کمرہ عام لوگوں سے زیادہ سیاستدانوں سے بھرا ہوا تھا۔ ملک کے بہت بڑے سیاستدان ایک غریب لڑکی کے مقدمے میں ملوث ہو کر ایک دوسرے سے ٹکرانے وہاں پہنچے ہوئے تھے۔

ملزمہ بلوری پر دو طرح کے الزامات تھے۔ ایک الزام یہ تھا کہ وہ اپنے پنڈ والے مکان میں بدکاری کرتے وقت پکڑی گئی تھی۔ اس وقت کے انسپکٹر کفیل احمد کو یہ معلوم تھا کہ بعد میں گرفتار ہونے والے بدکاری سے انکار کرتے ہیں۔ اس لئے اس نے ایک فوٹو گرافر کو بلا کر بلوری کی اور اس کے یار کی چند تصویریں اتروا دی تھیں۔

سرکاری وکیل نے ان تصویروں کو عدالت میں پیش کیا پھر کہا۔ ''ملزمہ بلوری پر دوسرا الزام یہ ہے کہ یہ پچھلے پانچ ماہ سے جیل میں ہے۔ جیل کی چار دیواری میں رہ کر حاملہ ہو گئی ہے۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق اسے تیسرے مہینے کا حمل ہے۔ اس وقت کے جیلر کو اور جیل کے دوسرے ذمہ دار اسٹاف کو حراست میں لیا گیا ہے۔ ان کے بیانات بھی قلم بند کئے گئے ہیں۔''

عدالت کی کارروائی بہت طویل تھی۔ جیلر جبار خان کو اور دوسرے اسٹاف کو باری باری بلا کر ان سے طرح طرح کے سوالات کئے گئے۔ ان سب نے ایک ہی بات کہی کہ بلوری کو دوسری قیدی عورتوں کی طرح سخت نگرانی میں رکھا جاتا تھا۔ وہ کبھی جیل سے باہر نہیں گئی۔ اس نے اسی چار دیواری میں رہ کر سب کی آنکھوں میں دھول جھونکی ہے۔ وہیں کسی قیدی سے اپنا منہ کالا کیا ہے اور اس کے بچے کی بن رہی ہے۔

بلوری کو کٹہرے میں بلا کر سوالات کئے گئے۔ اس نے دور بیٹھے ہوئے چوہدری

دلاور حیات کو نفرت سے دیکھتے ہوئے صاف طور پر کہا۔ ''وہ جو عزت دار چوہدری دلاور حیات یہاں بیٹھا ہوا ہے، اسی نے مجھے ایک بدکار عورت بنایا ہے۔ پہلے مجھ پر بدکاری کا جھوٹا الزام لگا کر جیل میں پہنچایا پھر جیلر جبار خان کی مدد سے مجھے جبراً رات کے وقت اپنی کوٹھی میں بلاتا تھا اور صبح ہونے سے پہلے واپس انہی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیتا تھا۔ میرے ہونے والے بچے کا باپ صرف اور صرف چوہدری دلاور حیات ہے۔''

سرکاری وکیل نے کہا۔ ''بس آگے نہ بولو۔ چوہدری صاحب پر جھوٹا الزام نہ لگاؤ۔ یہ ہمارے ملک کے ایک اہم شعبے کے وزیر ہیں۔ یہ سراسر زیادتی ہے کہ ان پر جھوٹا الزام لگا کر انہیں عدالت میں آنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ میں ابھی ایک ایسا قیدی گواہ پیش کر رہا ہوں، جس کے بیان کے بعد معزز چوہدری صاحب تمام الزامات سے بری ہو جائیں گے۔''

پھر ایک گواہ کو پیش کیا گیا۔ جب وہ کٹہرے میں آیا تو اسے دیکھتے ہی بلوری اور چوہدری دونوں ہی چونک گئے۔ وہ وہی رفیق عرف فیقے تھا، جس کے ساتھ پہلی بار بلوری کو بدکاری کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ فیقے اس کے باپ بشیر کریانہ والے کی دکان میں ملازم تھا۔ اسے چوہدری نے خرید لیا تھا اور اپنا آلہ کار بنا کر اس کے ذریعے بلوری کو بدنام کرتے ہوئے موجودہ حالات تک پہنچایا تھا۔

چوہدری نے نئے جیلر سے پوچھا۔ ''تم اس بندے کو کہاں سے پکڑ لائے ہو؟''

نئے جیلر نے کہا۔ ''یہ اب سے تین ماہ پہلے اوکاڑہ جیل میں تھا۔ اسے وہاں سے ہمارے جیل میں ٹرانسفر کیا گیا تھا۔ کیا آپ اسے جانتے ہیں؟''

چوہدری نے کہا۔ ''بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ بس اتنا یقین دلاؤ، یہ میرے حق میں بیان دے گا یا نہیں...؟''

''چوہدری صاحب! میں کچا کھیل نہیں کھیلتا۔ اب تک سات جیلوں کا جیلر رہ چکا ہوں۔ یہ آٹھویں جیل میں آیا ہوں اور آپ کی تابعداری کر رہا ہوں۔ دیکھئے تو سہی کیا ہوتا ہے؟''

فیقے نے سرکاری وکیل کے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام رفیق عرف فیقے ہے۔ بلوری کے باپ بشیر کریانہ والے کی دکان اوکاڑہ شہر میں تھی اور یہ اپنی

ماں، بہن کے ساتھ چک نمبر باون میں رہتی تھی۔ اس کا باپ ہفتے میں ایک یا دو بار بیوی اور بیٹیوں سے ملنے جاتا تھا۔ گھر کی ضرورت کا تمام سامان میں ان کے گھر پہنچایا کرتا تھا۔ اس طرح آتے جاتے بلوری سے باتیں ہوتی رہتی تھی۔"

اس نے دوسرے کٹہرے میں کھڑی ہوئی بلوری کو بڑی حسرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے دل میں سما گئی تھی' میں اسے دل وجان سے چاہتا تھا۔"

سرکاری وکیل نے پوچھا۔ "اس کے ساتھ تمہیں بھی جیل میں ڈالا گیا تھا پھر تم وہاں سے کیسے فرار ہوئے؟"

اس نے کہا۔ "سب ہی جانتے ہیں' جیل میں قیدیوں نے بغاوت کی تھی۔ بڑے ہنگامے ہوئے تھے۔ ان ہنگاموں سے فائدہ اٹھا کر میں چند قیدیوں کے ساتھ وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ زبردست پلاننگ کے مطابق ہوا تھا۔ باہر مجھے ایک نیا پاسپورٹ اور نقد رقم دی گئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں اس ملک سے باہر چلا جاؤں۔"

چوہدری دلاور حیات نے پریشان ہو کر نئے جیلر کو اور سرکاری وکیل کو دیکھا۔ وکیل نے اس کی باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم زیادہ باتیں نہ کرو۔ صرف اتنا بتاؤ' دوبارہ جیل میں کیسے آ گئے؟"

"تقدیر میں جیل یاترا لکھی تھی۔ جو پاسپورٹ مجھے دیا گیا تھا' وہ جعلی ثابت ہوا اور مجھے پھر جیل میں پہنچا دیا گیا۔"

سرکاری وکیل نے پوچھا۔ "یہ بتاؤ' ملتان جیل میں پہنچ کر کیا ہوا؟ بلوری سے کیسے ملاقات ہوئی؟ یہ تمہارے پاس کس طرح جاتی تھی یا تم کس طرح اس کے پاس پہنچ جایا کرتے تھے؟"

"میں نے ملتان جیل میں اب تک تین مہینے گزارے ہیں۔ ابھی دو دن پہلے جیلر صاحب نے مجھے دور ہی سے بلوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بلوری ہے۔ اگر تم عدالت میں یہ بیان دو گے کہ وہ تمہارے ساتھ منہ کالا کرتی رہی ہے اور اب تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے تو تمہارے باپ کو بہنوں اور بھائیوں کو پانچ لاکھ روپے دیئے جائیں گے۔"

نئے جیلر نے اٹھ کر کہا۔ "جج صاحب! یہ جھوٹ بول رہا ہے۔"

جج نے کہا۔ "آرڈر' آرڈر.... چپ چاپ بیٹھے رہو۔"

پھر فیقے سے کہا گیا کہ وہ اپنا بیان جاری رکھے۔ اس نے کہا۔ "مجھ پر چوہدری دلاور حیات کے بڑے احسانات ہیں۔ اب سے پہلے بھی انہوں نے میرے باپ کو دوسری شادی کرنے اور میری بہنوں کو سہاگن بنانے کے لئے پانچ لاکھ روپے دیئے تھے اور مجھ سے کہا تھا کہ ایک رات بلوری کے مکان میں جا کر اس کے ساتھ بدکاری کا ڈرامہ پلے کرنا ہے۔"

چوہدری نے غصے سے اٹھ کر کہا۔ "یہ بکواس کر رہا ہے۔"

جج نے پھر کہا۔ "آرڈر' آرڈر... خاموش بیٹھے رہیں۔ آپ کو بھی بولنے کا موقع دیا جائے گا۔"

چوہدری اپنی جگہ بیٹھ گیا پھر جیلر کی طرف جھک کر غصے سے بولا۔ "کتے کے بچے! یہ تو کس گواہ کو پکڑ لایا ہے؟"

وہ عاجزی سے بولا۔ "مجھے کیا معلوم تھا' یہ یہاں آ کر بدل جائے گا؟"

چوہدری پریشانی سے فیقے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اس کا تابعدار تھا۔ اس کا آلہ کار بن کر بلوری کو بدنام کر چکا تھا۔ مگر اب اچانک ہی پٹڑی بدل رہا تھا۔ اس کی حمایت میں بولنے کے بجائے مخالفت بول رہا تھا۔

فیقے نے کہا۔ "جب جیل میں قیدیوں نے بغاوت کی اور میں چند قیدیوں کے ساتھ فرار ہوا تو باہر چوہدری صاحب کے آدمیوں نے ہی مجھے پاسپورٹ اور نقد رقم دی تھی۔ چوہدری صاحب کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ جن کے ذریعے انہوں نے میرا پاسپورٹ بنوایا ہے' اُن سے جلدی میں ایسی غلطیاں ہوئی ہیں کہ وہ پاسپورٹ جعلی ثابت ہوا اور میں دوبارہ پکڑا گیا۔"

اس نے بلوری کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "شاید تقدیر کو یہی منظور تھا کہ میں دوبارہ بلوری کا سامنا کروں اور پانچ لاکھ روپے کے لالچ میں اس کے ساتھ جو جھوٹا بدکاری کا ڈرامہ پلے کیا ہے' اس کی تلافی کروں۔ جج صاحب...! یہ لڑکی ایک شریف گھرانے میں پیدا ہوئی ہے۔ جس رات اس پر بدکاری کا الزام لگایا گیا۔ اس رات میں نے اس کے ساتھ کوئی

گناہ نہیں کیا تھا۔''

سرکاری وکیل نے کہا۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو' تمہارے ساتھ اس کی اتاری ہوئی تصویریں ابھی عدالت میں پیش کی گئی ہیں۔ یہ تمہاری بدکاریوں کا کھلا ثبوت ہے۔''

وہ بولا۔ ''میں ابھی ثابت کردوں گا' یہ تصویریں سراسر فراڈ ہیں۔''

اس نے چوہدری کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ''یہ بھی ثابت کردوں گا کہ جیل کی چاردیواری میں بلوری کے ساتھ یہ چوہدری منہ کالا کرتا رہا ہے۔ زبردستی اس کی عزت سے کھیلتا رہا ہے۔''

جج نے پوچھا۔ ''کیا تم کوئی ٹھوس ثبوت پیش کرسکتے ہو؟''

''ایسا ثبوت پیش کروں گا کہ دنیا کی کوئی عدالت اسے جھٹلا نہیں سکے گی۔ میں بلوری کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ اس کے لئے تڑپتا تھا۔ مگر یہ جانتا تھا کہ کبھی اسے حاصل نہیں کرسکوں گا۔ یہ بات میری پیدا کرنے والی ماں جانتی تھی' جو اسی غم میں مرگئی۔ میرا باپ جانتا ہے۔ مگر شرم کے مارے کسی کے آگے زبان نہیں کھولتا اور وہ بات' وہ حقیقت یہ ہے کہ میں زنخا ہوں...''

ایک دم سے پوری عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ یہ سناٹا صرف چند لمحے تک رہا۔ پھر سب ہی ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ بولنے لگے۔ بلوری مارے خوشی کے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ شہناز اور سلطان احمد بھی وہاں موجود تھے۔ دونوں کی آنکھیں خوشی سے بھیگ رہی تھیں۔ بلوری دونوں ہاتھ اٹھا کر فیقے کو دعائیں دے رہی تھی۔ ''فیقے ...! میں واری... میں صدقے... یا میرے ربا! اس کی سچائی کو مکے مدینے پہنچادے...''

وہ کٹہرے میں کھڑی خوشی سے مچل رہی تھی۔ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے دعائیں دے رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ''لوگو...! دیکھو۔ یہ ہے' اصل مرد جو خود کو زنخا کہہ رہا ہے۔ لیکن اس نے مردوں سے بھی بڑا کام کردکھایا ہے۔ کوئی سیاستدان' کوئی وکیل چوہدری کا جھوٹ اور فراڈ ثابت نہیں کرسکتا تھا۔ مگر اس نے کردکھایا ہے۔ اسے سلام کرو... اے لوگو...! اسے سلام کرو۔''

وہ دونوں ہاتھ پیشانی پر رکھ کر' سر جھکا کر اسے سلام کرنے لگی۔ اس کے رونے کا اور دعائیں دینے کا انداز ایسا تھا کہ عدالت کے کمرے میں سب ہی متاثر ہو رہے تھے اور

چوہدری کی طرف نفرت سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے پیچھے شہناز اور سلطان احمد بیٹھے ہوئے تھے۔ شہناز نے اس کی طرف جھک کر کہا۔ ''چوہدری..! شیم آن یو....''

سلطان احمد نے بھی اس کی طرف جھک کر کہا۔ ''لعنت ہے تم پر...''

آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے جب انہیں ایسا کہتے ہوئے سنا تو وہ بھی لعنت ملامت کرنے لگے۔ اسے کچھ نہ کچھ کہنے لگے۔ کمرے میں ہر طرف سے آوازیں ابھرتے ابھرتے بلند ہونے لگیں۔ چوہدری پریشان ہو کر دائیں بائیں اور پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ پھر اٹھ کر وہاں سے جانے لگا۔ اپوزیشن پارٹی کی طرف سے مقرر کئے گئے وکیل نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ''میں جج صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ چوہدری دلاور حیات کو اس کمرے سے باہر نہ جانے دیا جائے۔''

جج نے پولیس آفیسر کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر چوہدری کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ ''پلیز۔ آپ اپنی جگہ جا کر بیٹھ جائیں۔''

بلوری کے وکیل نے کہا۔ ''جناب عالی! یہ ثابت ہو رہا ہے کہ پہلے جیلر جبار خان نے بلوری سے بدکاری کے سلسلے میں چوہدری دلاور حیات کا ساتھ دیا۔ جب جبار خان اور اس کے تمام اسٹاف کو حراست میں لیا گیا اور دوسرا جیلر آیا تو اس نے بھی چوہدری دلاور حیات کا ساتھ دیا۔ کیونکہ چوہدری صاحب اقتدار میں ہیں۔ جو چاہتے ہیں' کرگزرتے ہیں۔ لہٰذا آپ سے درخواست ہے' اس قدر ثبوت حاصل ہونے کے بعد چوہدری صاحب کی ضمانت منسوخ کی جائے اور انہیں حراست میں لینے کا حکم دیا جائے۔''

جج نے کہا۔ ''بے شک۔ جس کے ساتھ زنا کیا جاتا ہے' وہی عورت زناکار کو پہچانتی ہے۔ چوہدری دلاور حیات نے اپنی بے گناہی کے سلسلے میں جو گواہ اور ثبوت فراہم کئے تھے' وہ سب جھوٹے اور فراڈ ثابت ہوچکے ہیں۔ لہٰذا چوہدری دلاور حیات کی ضمانت منسوخ کی جاتی ہے۔ عدالت حکم دیتی ہے کہ انہیں حراست میں رکھ کر ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ آج سے پندرہ دن بعد اس مقدمے کی سماعت ہوگی۔''

عدالتی کارروائی پندرہ دنوں کے لئے ملتوی ہوگئی۔ فیقے نے چوہدری کی بازی الٹ کر رکھ دی تھی۔ حالات بلوری کے موافق ہوگئے تھے۔ شہناز نے فوراً ہی قریب آ کر

اس کا ہاتھ تھام کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہائے...! میں شہناز ہوں۔''

بلوری نے کہا۔ ''اپنا نام نہ بتاتیں' تب بھی سلطان کے ساتھ دیکھ کر تمہارا تعارف ہو چکا ہے۔''

وہ بولی۔ ''آج تم سے مل کر اس عدالت کی کارروائی دیکھ کر مجھے تم سے کتنی محبت' کتنی ہمدردی ہو رہی ہے' میں زبان سے نہیں کہہ سکتی۔ واقعی تم پر بہت مظالم ڈھائے گئے ہیں۔ تم نے بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ یہاں ملاقات کی اجازت نہیں ہے۔ فی الحال اتنا ہی کہتی ہوں' آئی لو یو....''

بلوری نے کہا۔ ''بہت بہت شکریہ۔''

ایسے وقت اس نے دور فیقے کی طرف دیکھا۔ وہ پولیس والوں کے ساتھ جارہا تھا۔ نگاہیں ملتے ہی اس نے ایک ہاتھ لہرایا۔ محبت سے مسکرایا' بلوری نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر پیشانی پر رکھتے ہوئے بڑی عقیدت سے اسے سلام کیا۔ پھر سلطان احمد سے کہا۔ ''تم کسی وقت' کسی دن بھی فیقے سے ملو اور اس کا شکریہ ادا کرو۔ اس سے کہو' میں اس سے ملوں گی۔ رہائی پانے کے بعد ضرور ملوں گی۔''

چوہدری دلاور حیات پولیس کی کسٹڈی میں اس کے قریب سے گزر رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو بلوری نے کہا۔ ''ایک چیونٹی ہاتھی کو کس طرح مارتی ہے' یہ سارے ہاتھی دیکھتے ہیں۔ پھر بھی سبق حاصل نہیں کرتے۔ تھو ہے تجھ پر...''

چوہدری غصے سے بپھر گیا۔ اسے مارنے کے لئے رُک کر ہاتھ اٹھایا تو سلطان احمد بلوری کے سامنے ڈھال بن گیا۔ پولیس والوں نے چوہدری کو دونوں طرف سے پکڑ لیا۔ افسر نے کہا۔ ''چوہدری صاحب! یہ آپ کی نیشنل اسمبلی نہیں' عدالت ہے۔''

اس مقدمے میں سب سے دھماکہ خیز بات یہی تھی کہ نیشنل اسمبلی کے ممبر کو جو حکمران پارٹی کا بہت اہم لیڈر تھا' اسے حراست میں لیا گیا تھا۔ اعلیٰ حکام نے اپنی پارٹی کی نیک نامی قائم رکھنے کے لئے جج کے فیصلے میں ایک تھوڑی سی تبدیلی کی۔ چوہدری دلاور حیات کو کسی حوالات یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں رکھا گیا۔ بلکہ اسے اس کی کوٹھی میں پہنچا دیا گیا۔

فیصلہ کرنے والے جج کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا گیا کہ چوہدری کو اس کی کوٹھی میں نظر بند رکھا گیا ہے۔ اخبارات پر سنسر لگا دیا گیا' یہ تاکید کی گئی کہ اپوزیشن والے چوہدری کے خلاف جو بھی بیان دیں' انہیں شائع نہ کیا جائے۔ اتنی سختی کی گئی' ایسی پابندی عائد کی گئی کہ اسی شہر کے رہنے والے بلوری کے معاملات سے بے خبر رہے۔ آئندہ مقدمے کی سماعت کو ملتوی کیا گیا۔ یہ طے کیا گیا کہ معاملات کو آہستہ آہستہ دبایا جائے گا۔ پھر اس کیس کو مٹی میں ملا دیا جائے گا۔

ان دنوں نہ تو موبائل فون تھا نہ کمپیوٹر۔ اندر کی ڈھکی چھپی خبریں گھر گھر پہنچانے کے ذرائع نہیں تھے۔ عوام کی لاعلمی اور بے خبری میں جو بھی ہوتا تھا' اسے پر نہیں لگتے تھے۔ بڑے سے بڑے معاملے اور بڑی سے بڑی خبر کو دبانا بہت آسان تھا۔

جلسے جلوس پر پابندیاں لگا دی گئی تھیں۔ اپوزیشن والے کھلے عام اسٹیج پر آ کر چوہدری کے خلاف کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ لاٹھی چارج کے ذریعے انہیں منتشر کیا جاتا تھا۔ پھر بھی وہ نہ مانتے تو فائرنگ شروع ہو جاتی تھی۔ بھگدڑ مچتی تھی۔ یوں حکمرانوں کے خلاف احتجاجی مہم ناکام رہتی تھی۔

طبی معائنے سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ فیقے زنخا ہے۔ اس میڈیکل رپورٹ کے بعد یہ بھی ثابت ہو چکا تھا کہ اس رات پنڈ میں کوئی بدکاری نہیں ہوئی تھی۔ بلوری پر خواہ مخواہ الزام عائد کر کے اسے جیل میں پہنچایا گیا ہے۔ یہ بھی ثابت ہو چکا تھا کہ جیل میں فیقے سے کبھی اس کے ناجائز تعلقات نہیں رہے تھے اور وہ بچہ کسی شک و شبہ کے بغیر چوہدری کا تھا۔ اگر دوسری بار بلوری کی پیشی ہوتی تو وہ باعزت طور پر بری ہو جاتی۔ کیونکہ اس پر جبر کیا گیا تھا۔ جبراً اسے ماں بنایا جا رہا تھا۔ چونکہ فیقے بھی بدکاری کے قابل نہیں تھا' اس لئے اسے بھی رہائی مل سکتی تھی۔

لیکن حکمران جماعت نے عدالتی قوانین کا گلا دبوچ لیا تھا۔ کوئی ان کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا کہ اگلی سماعت کب ہوگی؟ ایک بے گناہ لڑکی کو کب باعزت طور پر بری کیا جائے گا؟

چوہدری کو نہ حراست میں رکھا گیا تھا' نہ اس کا محاسبہ کیا جا رہا تھا۔ وہ بڑے عیش و

آرام سے الیکشن لڑنے کی تیاریاں کررہا تھا۔

اس کے برعکس بلوری کی پوزیشن اب وی آئی پی والی نہیں رہی تھی۔اس سے ساری سہولتیں‘ ساری رعایتیں چھین لی گئی تھیں۔دوسری قیدی عورتوں کی طرح اس سے محنت ومشقت لی جارہی تھی۔تین وقت کی روٹیاں کم سے کم ملتی تھیں۔وہ بھی غیر معیاری ہوتی تھیں۔دال میں کنکر پتھر ہوتے تھے‘ روٹی میں بھوسا ملا ہوتا تھا۔جیلر اس سے کہتا تھا۔”تُو نے عدالت میں چوہدری صاحب پر تھوکا تھا۔دیکھ! اب تیرے ساتھ اور کیا ہوتا رہے گا؟“

سلطان احمد پریشان تھا۔اسے بلوری سے ملنے کی اجازت نہیں دی جارہی تھی۔قیدیوں سے ملنے کی اجازت دینے والے بھی حکمران پارٹی کے لوگ تھے۔اس لئے اپوزیشن والے بھی ایک مظلوم اور بے یارومددگار لڑکی سے مل نہیں پاتے تھے۔

شہناز عدالت میں بلوری سے ملنے کے بعد بہت متاثر ہوئی تھی۔اس نے اپنے باپ سے‘ سلطان سے ضد کی تھی کہ ایک ہفتے بعد شادی ہوجانی چاہئے۔مگر اب دو ماہ گزر چکے تھے۔نہ وہ لندن واپس جارہی تھی۔نہ ہی شادی کے سلسلے میں کوئی تقاضہ کررہی تھی۔

اس نے سلطان سے کہا۔”تمہارا دکھ میرا دکھ ہے۔کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے‘ میں بلوری کی جگہ ہوں۔جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بدنامیاں اٹھارہی ہوں‘ سزائیں بھگت رہی ہوں۔پتہ نہیں‘ اس بے چاری کے ساتھ اور کیا ہورہا ہوگا؟ میں صرف سوچ سکتی ہوں۔اس پر تو قیامتیں ٹوٹ رہی ہوں گی۔“

وہ سلطان احمد کا دل جیتنے کے لئے اس کے اندر سما جانے کے لئے پہلے بلوری سے محبت کا ڈھونگ رچا رہی تھی۔یہ کہہ کر دھوکہ دے رہی تھی کہ جب وہ رہا ہوگی تو اسے اپنی سوکن بنا لے گی۔لیکن یہ جھوٹ رفتہ رفتہ سچ بنتا جارہا تھا۔سلطان احمد اس کے حواس پر اس قدر چھا گیا تھا کہ اسے ساری زندگی کے لئے اپنا بنا کر رکھنے کی خاطر وہ بلوری سے بھی ٹوٹ کر محبت کرنے لگی تھی۔

اب تو بلوری کی ایسی حالت ہوگئی تھی کہ کوئی بھی اسے دیکھ کر صرف محبت نہ کرتا بلکہ اس پر ترس بھی کھاتا۔اس سے کچھ زیادہ ہی مشقت لی جارہی تھی۔وہ صرف گالیاں ہی

نہیں سنتی تھی‘ لات جوتے بھی کھاتی تھی۔چھ ماہ میں آدھی ہوکر رہ گئی تھی۔بدن پر برائے نام گوشت رہ گیا تھا۔گال پچک گئے تھے‘ رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔

جس دن قومی اسمبلی کے الیکشن ہورہے تھے۔اس روز وہ دردِ زِہ میں مبتلا تھی۔اسے لیٹنے بیٹھنے کے لئے جو چٹائی دی گئی تھی‘ وہ بھی چھین لی گئی تھی۔وہ ننگے فرش پر پڑی ہوئی تھی۔بارش کے دن تھے۔زمین ٹھنڈی اور نم تھی۔ایسا لگ رہا تھا‘ فرش کے نیچے سے پانی رس رہا ہے۔وہ بے یارومددگار پڑی ہوئی تھی۔صرف مائی جینا اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔دوسری قیدی عورتوں کو سختی سے منع کیا گیا تھا کہ کوئی اس کے پاس نہ جائے۔سپاہی سلاخوں کے پاس کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔

کوئی پرسان حال نہیں تھا۔جو اس کے چاہنے والے تھے۔وہ ایک لمحے کے لئے بھی اندر آکر اس کے سر پر ہاتھ نہیں رکھ سکتے تھے۔اس کا مقدمہ لڑنے والے تقریباً ہار چکے تھے۔کیونکہ مقدمے کی فائل کو ہی کہیں کچرے میں پھینک دیا گیا تھا۔اس نے سلطان احمد سے کہا تھا۔”ویڈیو فلم کو جلا دو۔ہم شرمناک ہتھیاروں کے ذریعے دشمنوں کا مقابلہ نہیں کریں گے۔ایمان کے ہتھیار سے لڑیں گے اور صرف اللہ پر بھروسہ کریں گے۔“

اس بدنصیب لڑکی کو خدا پر بھروسہ کرنا بہت مہنگا پڑ رہا تھا۔وہ دعائیں مانگ رہی تھی کہ جیل سے نجات نہیں مل رہی ہے‘ زندگی کی قید سے ہی نجات مل جائے۔تکلیف برداشت نہیں ہورہی تھی۔وہ اپنے بچے کے ساتھ مرجانا چاہتی تھی۔

کہتے ہیں‘ خدا دیر کرتا ہے اندھیر نہیں کرتا۔مگر اس کے ساتھ اندھیر ہورہا تھا۔

ایک ٹی وی جیلر کے کمرے میں تھا۔وہاں الیکشن کے سلسلے میں پل پل کی خبریں نشر کی جارہی تھیں۔ملک کے ہر صوبے‘ ہر شہر اور ہر علاقے سے یہ بتایا جارہا تھا کہ کونسی پارٹی کتنے ووٹ لے کر آگے بڑھ رہی ہے؟

ٹی وی کی خبریں بتا رہی تھیں‘ اندھیر ہورہا ہے۔چوہدری دلاور حیات اپنے علاقے سے زیادہ ووٹ لے رہا تھا۔اس کی پارٹی کے دوسرے سیاستدان بھی اپنے اپنے علاقوں سے اچھے خاصے ووٹ حاصل کررہے تھے۔اپوزیشن پارٹی سے بہت زیادہ آگے

نہیں تھے۔ پھر بھی مات دیتے ہوئے اور آگے بڑھتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ شام تک یہ یقین ہونے لگا کہ چوہدری دلاور حیات کی پارٹی پھر ایک بار بھاری اکثریت سے جیت کر اپنی حکومت بنائے گی۔

بلوری کا دل ٹوٹ رہا تھا۔ سلطان احمد کے حوصلے ٹوٹ رہے تھے اور جیل کے ایک گوشے میں فیقے سر جھکائے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رو رہا تھا... یہ خدا کہاں ہے؟ کیا اسے بے گناہ مظلوموں پر ترس نہیں آتا؟ وہ کرتا کیا ہے...؟

وہ کرتا یہ ہے کہ مظلوموں کو آگ کی بھٹی میں جھونک دیتا ہے اور انہیں تب نکالتا ہے' جب وہ کندن بن جاتے ہیں۔ بلوری' سلطان احمد اور فیقے سب ہی کے کندن بننے کا وقت آ گیا۔ اچانک ہی حالات بدلنے لگے۔ جیسے جیسے ووٹوں کی گنتی ہو رہی تھی' ناظرین کو ٹی وی کے ذریعے بتایا جا رہا تھا کہ کس علاقے میں کس پارٹی کی کیا پوزیشن ہے؟

شام کے بعد اچانک ہی اپوزیشن پارٹی کے ووٹ بڑھنے لگے۔ رات گیارہ بجے تک وہ حکمران پارٹی کے ووٹوں کے برابر آ گئے۔ آدھی رات کے بعد ان سے آگے نکل گئے۔ صبح ہوتے ہوتے انہوں نے ایک لاکھ ووٹوں کی برتری حاصل کر لی۔ جیلر وغیرہ کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ چوہدری کی پارٹی ہار رہی تھی۔ ایک سپاہی نے قیدی عورتوں کے کمرے کے پاس آ کر دوسرے سپاہی سے کہا۔ "چوہدری صاحب کی پارٹی بری طرح مار کھا گئی ہے۔"

یہ سنتے ہی تمام قیدی عورتیں تیزی سے چلتی ہوئی بلوری کے پاس آ گئیں۔ ایک چٹائی بچھائی۔ دو چار نے بلوری کو اٹھا کر چٹائی پر ڈالا۔ سلاخوں کے باہر سے دو سپاہیوں نے چیخ کر کہا۔ "اے! کیا کر رہی ہو؟ دور ہٹو۔ بلوری کے پاس نہ جاؤ۔"

ایک قیدی عورت نے اٹھ کر کمر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ابے جا بڑا آیا چوہدری کا چمچہ! دیکھ لینا کل پرسوں سے یہاں سلامت علی کا سکہ چلے گا۔"

دوسری عورت نے کہا۔ "تم سب اپنی خیریت چاہتے ہو تو بلوری کی مدد کرو۔ اس کے کام آؤ۔ فوراً ڈاکٹر کو بلاؤ۔ وہ تکلیف کم ہونے کی کوئی تو دوا دے گا۔"

ان سپاہیوں نے آپس میں مشورے کئے۔ پھر وہاں سے دو سپاہی دوڑتے

ہوئے ڈاکٹر کے پاس گئے۔ مگر ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی بچے نے چیخ چیخ کر اپنی آمد کر اعلان کر دیا۔ دوسرے دن کا سورج نکل آیا تھا۔ ادھر ٹی وی پر اعلان ہو رہا تھا کہ سلامت علی کی پارٹی بھاری اکثریت سے الیکشن جیت چکی ہے۔ خدا دیر کرتا ہے اندھیر نہیں کرتا...

بلوری کو دیر سے نہ ملا تھا مگر خوب ملا تھا۔ ایک بیٹا اس کی گود میں آیا تھا۔ نئی امیدوں کی صبح روشن ہو گئی تھی۔ اب اسے رہائی پانے کا کچھ یقین ہو رہا تھا۔

سلامت علی کی کوٹھی کے سامنے فائرنگ ہو رہی تھی۔ پٹاخے چھوٹ رہے تھے۔ جیت کے سلسلے میں جشن منایا جا رہا تھا۔ کوٹھی کے اندر شہناز نے سلطان احمد کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔ "پاپا کی سیاسی جیت ہماری جیت ہے۔ اب ہم بلوری کو کسی رکاوٹ کے بغیر جیل سے باہر لا سکیں گے۔"

اس نے کہا۔ "اپنے پاپا سے کہو' کل ہی اس کی خیریت معلوم کریں۔ اس کے ماں بننے کا وقت ہو چکا ہے۔ وہ زچگی کے مرحلے سے گزر رہی ہو گی یا گزر چکی ہو گی۔ پتہ نہیں' وہاں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہو گا؟ وہ کیسے بدترین حالات سے گزر رہی ہو گی' خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

بیٹی نے باپ سے کہا۔ باپ نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی بلوری کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرے گا۔ لیکن وہ اچانک ہی اسلام آباد چلا گیا۔ حکومت بنانے اور وزارتیں حاصل کرنے کے سلسلے میں تمام جیتنے والے سیاستدان جوڑ توڑ میں لگے ہوئے تھے۔ سلطان احمد جھنجھلا گیا۔

شہناز نے کہا۔ "تم جائز بات پر کبھی نہیں جھنجھلاتے۔ کبھی میں کوئی ناجائز بات کہتی ہوں' ضد کرتی ہوں تو مجھے سمجھاتے ہو۔ میں بھی تمہیں سمجھا رہی ہوں' تم نادان بچے نہیں ہو۔ یہ جانتے ہو' پاپا کی جیت کتنی اہم ہے۔ اب وہ کسی مرکزی شعبے کے وزیر بنیں گے۔ اپنے طور پر سیاسی مفادات حاصل کرتے رہیں گے۔ لیکن ہمارا بھی بڑا فائدہ ہے۔ اب تک صبر کیا ہے۔ کچھ دن اور صبر کر لو۔ پاپا اسلام آباد سے آئیں گے تو سب سے پہلے بلوری کی خبر لی جائے گی۔"

سلطان احمد اس کے لئے اس قدر بے چین ہو گیا تھا کہ خود ہی سینٹرل جیل پہنچ

گیا۔ وہاں جیلر کے پاس پیغام بھیجا۔ ''میں جناب سلامت علی صاحب کا ہونے والا داماد ایڈووکیٹ سلطان احمد ہوں۔ آپ سے ملنے آیا ہوں۔''

جیلر نے اسے اپنے پاس بلایا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب! آپ کو کون نہیں جانتا؟ جب بلوری کا مقدمہ چل رہا تھا تو تب بھی عدالت میں موجود تھے۔ آپ مات کھائے ہوئے چوہدری دلاور حیات کے بھی وکیل رہ چکے ہیں۔ فرمایئے' میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

اس نے کہا۔ ''میں بلوری سے ملنا چاہتا ہوں۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر کورٹ سے اجازت لے کر آتے تو بہتر ہوتا۔ آپ ایڈووکیٹ ہیں' خود ہی قانون کو سمجھتے ہیں۔''

''میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں کے سامنے قانون ایک کھلونا ہے۔ جب چاہتے ہیں' اسے توڑ مروڑ کر پھینکتے ہیں اور نیا کھلونا تیار کر لیتے ہیں۔ اگر یہ چاہتے ہیں کہ آئندہ سلامت علی صاحب آپ پر مہربان رہیں تو بلوری سے میری ملاقات ابھی کرا دیں۔''

وہ بڑے ہی خوشامدانہ انداز میں بولا۔ ''جناب! آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔ میں یہی چاہتا تھا کہ آپ سلامت علی صاحب سے میری سفارش کریں۔ ہم تو حکم کے بندے ہیں۔ جو آقا بنتا ہے' ہم اسی کی تابعدار کرتے ہیں۔ چوہدری صاحب کا دور گزر چکا ہے۔ اب تو ہم سلامت علی صاحب کو سلام کرتے رہیں گے۔''

سلطان نے کہا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں' سلامت علی صاحب سے تمہاری سفارش کروں گا۔''

جیلر نے فوراً دو سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''جاؤ اور بلوری کو عزت کے ساتھ لے آؤ۔ اس سے کہو' اپنے بچے کو بھی ساتھ لائے۔ سلطان احمد صاحب ملنے آئے ہیں۔''

سلطان نے چونک کر خوش ہو کر پوچھا۔ ''کیا بلوری ماں بن چکی ہے؟''

''جی ہاں۔ بڑے ہی خوبصورت سے بیٹے کو جنم دیا ہے۔ ہم تو اس کا بہت خیال رکھنے لگے ہیں۔ چوہدری نے اس پر بڑے مظالم ڈھائے۔ لیکن جیسے ہی ہم نے الیکشن کا فیصلہ سنا' ویسے ہی اپنی وفاداری بدل دی۔ فوراً ہی بلوری کے لئے چٹائی بچھا دی۔ اس کی ضرورت کی

جتنی چیزیں تھیں' سب مہیا کر دیں۔ ابھی وہ آئے گی تو آپ خود اس سے پوچھ لیں' ہم اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔''

بلوری وہاں آئی تو سلطان احمد کو دیکھ کر خوش ہوگئی۔ فوراً ہی اپنے بچے کو جھلاتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو... یہ میرا بچہ ہے' میرا بیٹا ہے۔ مجھے یقین تھا' سلامت علی صاحب الیکشن جیت چکے ہیں۔ اس لئے تم ضرور آؤ گے۔ میرا مقدمہ پھر عدالت میں پہنچایا جائے گا۔ اب تو مجھے رہائی مل جائے گی نا...؟''

سلطان احمد نے بچے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے چوم لیا پھر کہا۔ ''واقعی یہ بہت خوبصورت ہے۔ تمہارے جیسا ہے۔ مگر یہ تمہاری کیا حالت ہوگئی ہے؟ پہلے سے بالکل آدھی ہو کر رہ گئی ہو۔''

''میں جیسی بھی ہوں۔ خوش ہوں۔ اب یہ امید ہو چلی ہے کہ اس چاردیواری سے باہر نکل سکوں گی۔ تم کوششیں کر رہے ہو نا؟''

جیلر اپنے کمرے سے چلا گیا تا کہ وہ تنہائی میں باتیں کرتے رہیں۔ بلوری نے کہا۔ ''میں تھک گئی تھی' ہار گئی تھی۔ مرنے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن جب سے یہ لاڈلا گود میں آیا ہے' تب سے جی چاہتا ہے۔ ایک لمبی عمر پاؤں۔ اپنے بیٹے کو جوان ہوتے دیکھوں۔ جیل سے باہر آسمان کے نیچے کھلی فضاؤں میں اس کی پرورش کروں۔ میں ایسا کرسکوں گی نا...؟''

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلا رہا تھا۔ اس کے شانے کو تھپک کر رہا تھا۔ اسے حوصلہ دے رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تمہیں یہاں سے رہائی ضرور ملے گی۔ لیکن کچھ دنوں تک صبر کرنا ہوگا۔ سلامت علی صاحب حکومتی معاملات میں بری طرح الجھے ہوئے ہیں۔ جب تک وہ اسلام آباد سے واپس نہیں آئیں گے' تب تک میں تمہارا کیس عدالت میں نہیں پہنچا سکوں گا۔ پھر بھی آج ہی یہاں سے جا کر تمہارے کیس کی فائل نکلواؤں گا اور جلد سے جلد مقدمے کی سماعت کے لئے اپیل دائر کروں گا۔''

وہ بڑی دیر تک اسے تسلیاں دیتا رہا۔ پھر جلد ہی آنے کا وعدہ کر کے شہناز کے پاس آ گیا۔ خوش ہو کر بولا۔ ''آج میں نے بلوری سے ملاقات کی ہے۔ وہ ماں بن چکی ہے۔ بہت ہی خوبصورت بیٹے کو جنم دیا ہے۔''

شہناز نے خوش ہو کر کہا۔ ''پھر تو ہمیں جشن منانا چاہئے۔ ہم ایک نہیں' دو خوشیوں کا جشن منائیں گے۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''دو خوشیاں..؟''

''ہاں۔ صبح سے تمہیں خوشخبری سنانے کا انتظار کر رہی ہوں۔''

وہ قریب آ کر اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ ''جناب! آپ باپ بننے والے ہیں اور میں ماں...''

اس نے چونک کر ذرا بے یقینی سے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''کیا سچ بول رہی ہو؟''

''جھوٹ کیوں بولوں گی؟ میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ کیا یہ تمہارے لئے خوش خبری نہیں ہے؟ کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟''

اس نے دونوں بازوؤں میں اسے بھینچ لیا۔ پھر چوم کر کہا۔ ''میں بہت خوش ہوں۔ مگر یہ خوشخبری وقت سے پہلے ہے۔ ہماری شادی ہو جانی چاہئے تھی۔''

''میں تو کب سے یہی کہہ رہی تھی۔ مگر بلوری کے حالات اور معاملات ایسے تھے کہ شادی کرنا مناسب نہ ہوتا۔ اب تو ہم کر سکتے ہیں۔''

وہ اس سے الگ ہو کر ایک طرف جاتے ہوئے سوچنے لگا۔ شہناز نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ پلٹ کر بولا۔ ''لڑکی حاملہ ہو تو اس سے نکاح جائز نہیں ہوتا۔ ہمیں اس بچے کی پیدائش کا انتظار کرنا پڑے گا۔''

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''اوہ نو... کیا تم چاہتے ہو اب بھی شادی نہ ہو۔ میں کنواری ماں بن کر پورے خاندان میں بدنام ہو جاؤں؟ اپنے پاپا کا سیاسی کیریئر برباد کر دوں؟''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے' کیا کرنا چاہئے؟''

''جو میں کہوں گی' تم وہی کرو گے۔ ہم دکھاوے کے طور پر خاندان والوں کی موجودگی میں نکاح پڑھوالیں گے۔ ایسا صرف دنیا والوں کی زبان بند کرنے کے لئے ہوگا۔ جب میں ماں بن جاؤں گی تو اس کے بعد جائز طور پر نکاح پڑھوالیا جائے گا۔''

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے شہناز کو دیکھا۔ پھر قریب آ کر اسے ایک بازو

کے حصار میں لے کر دوسرا ہاتھ اس کے پیٹ پر رکھ کر کہا۔ ''یہ میرا بچہ ہے۔ مجھے تم پر بہت محبت آ رہی ہے۔ اس کی خاطر ایک باپ کی حیثیت سے جائز یا ناجائز جو بھی کام ہے' وہ کروں گا۔''

سلامت علی اسلام آباد سے واپس آیا تو مارے خوشی کے اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اس نے آتے ہی بیٹی کو چوم لیا۔ ہونے والے داماد کو گلے لگا کر کہا۔ ''میں نے بہت بڑی بازی جیت لی ہے۔ مجھے وزیر داخلہ بنایا جائے گا۔ میں اس ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بن جاؤں گا۔''

سلطان احمد نے کہا۔ ''آپ کی کامیابی ہماری کامیابی ہے۔ اب تو آپ بلوری کو مکھن کے بال کی طرح جیل سے نکال لائیں گے۔''

بلوری کا نام سنتے ہی سلامت علی کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے بیٹی کو اور سلطان کو گہری سنجیدگی سے دیکھا۔ پھر ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میرے سامنے بیٹھو ....میری باتیں غور سے سنو اور سمجھو۔''

وہ دونوں ایک صوفے میں بیٹھ گئے۔ سلامت علی نے کہا۔ ''اب میں اس ملک کے حکمرانوں میں سے ایک حکمران ہوں۔ کسی بدنامی کو اپنی بیٹی اور داماد کے قریب پھٹکنے نہیں دوں گا۔ بلوری چوہدری کے ساتھ بری طرح بدنام ہو چکی ہے۔ حالانکہ ہم یہ ثابت کر دیں گے کہ اس نے بدکاری نہیں کی تھی۔ اس پر جبر کیا گیا تھا۔ پھر بھی میرے پارٹی کے تمام سیاستدان جانتے ہیں کہ وہ چوہدری کی داشتہ رہ چکی ہے اور اسی کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔''

شہناز نے کہا۔ ''پاپا وہ ماں بن چکی ہے۔ اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔''

سلامت علی نے کہا۔ ''یہ سن کر خوشی نہیں ہو رہی ہے۔ وہ پاپ کی اُس گٹھڑی کو اٹھائے تم دونوں کے قریب آئے گی تو میں سیاسی اور سماجی بلندیوں سے بہت نیچے گر پڑوں گا۔ کسی سے آنکھیں نہیں ملا سکوں گا۔''

وہ بیٹی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے بڑے ہی جذباتی انداز میں سلطان سے وعدہ کیا تھا کہ بلوری کو اپنی سوکن بناؤ گی۔ لیکن یہ سراسر میرے اسٹیٹس کے خلاف ہے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میری سیاسی موت واقع ہوگی۔''

پھر اس نے سلطان احمد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم سمجھدار ہو۔ میرے داماد بنتے ہی سیاست میں آنے والے ہو۔ میں تمہیں پہلے صوبائی اور پھر قومی اسمبلی میں پہنچاؤں گا۔ ایسی کامیابیاں حاصل کرنے کے لئے اپنے آس پاس کے داغ دھبوں کو دھونا پڑتا ہے۔“

سلطان احمد نے کہا۔ ”میں آپ کی باتیں سمجھ رہا ہوں۔ آپ اپنی جگہ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ لیکن میں بلوری کو بے یارومددگار نہیں چھوڑوں گا۔“

”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ وہ رہائی کے بعد بے یارومددگار نہیں رہے گی۔ ہم سب مالی طور پر اس کی مدد کریں گے۔ اس کی رہائش کا انتظام کریں گے۔ وہ جہاں کہے گی‘ اس کی شادی کرا دیں گے۔ لیکن تمہیں میری ہدایات پر سختی سے عمل کرنا ہوگا اور سب سے پہلی ہدایت یہ ہے کہ تم بلوری سے نہ آج ملو گے‘ نہ رہائی کے بعد اس سے ملاقات کرو گے۔ میں نہیں چاہتا‘ میرے خاندان کا کوئی فرد اس سے بات بھی کرے۔ میں ایک کامیاب انصاف پرور سیاستدان کی حیثیت سے ایک ہی پیشی میں اسے رہائی دلاؤں گا۔ تم تو اس کی رہائی چاہتے ہو نا؟“

سلطان نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ سلامت علی نے کہا۔ ”تم اور شہناز دور ہی دور رہ کر یہ دیکھو گے کہ میں کس طرح اس کے کام آتا ہوں؟ جب چاہو گے‘ دور ہی دور سے اس کی خیر خیریت معلوم کرتے رہو گے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بس یہ سمجھ لو کہ تمہیں آج ہی سے اپنا سیاسی کیریئر بنانا ہے اور میرے سیاسی کیریئر کو خطرے میں نہیں ڈالنا ہے۔“

شہناز التجا آمیز نظروں سے سلطان کو یوں دیکھنے لگی‘ جیسے کہنا چاہتی ہو۔ ”پاپا کی باتوں کو سمجھو۔ ہمیں اپنا کیریئر‘ اپنا خاندان بنانا ہے اور اپنی نئی نسل کو پروان چڑھانا ہے۔“

سلطان احمد نے کہا۔ ”جو کہنا ہے‘ زبان سے کہو۔ آنکھوں سے نہ کہو۔“

وہ بولی۔ ”تمہارا جو آخری فیصلہ ہوگا‘ وہی میرا فیصلہ ہوگا۔ مگر یہ کہنا چاہتی ہوں کہ پاپا درست کہہ رہے ہیں۔ تم بلوری کی بہتری چاہتے ہو۔ بہتری اس بات میں بھی تھی کہ میں اسے اپنی سوکن بنا دیتی۔ مگر اس بے چاری کو جن بدترین اور شرمناک حالات سے گزارا گیا‘ ان کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم اپنے کیریئر کو اور اپنے مستقبل کو بچاتے ہوئے اس کی اس طرح مدد

کریں کہ پھر اس پر کبھی کوئی آفت نہ آئے۔ تم دور رہ کر بھی اس کے لئے خوشحال زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کرتے رہو گے۔“

پھر اس نے سلطان کے ہاتھ کو تھام کر بڑے جذبوں سے کہا۔ ”تمہیں صرف اپنا ہی نہیں‘ اپنے بچے کا بھی کیریئر بنانا ہے۔ جو اب اس دنیا میں آنے والا ہے۔“

سلامت علی نے چونک کر بیٹی کی بات سنی۔ پھر حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”جو میں نے کہا‘ وہ آپ نے سنا۔ آپ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے سیاستدان ہیں۔ جب یہ جانتے ہیں کہ بیٹی دو مہینے سے ہونے والے داماد کے ساتھ دن رات رہتی ہے تو اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا۔ لہٰذا بحث نہ کریں‘ جتنی جلدی ممکن ہو۔ تمام خاندان والوں کو دعوت دیں اور ان کی موجودگی میں ہمارا نکاح پڑھوا دیں۔“

پھر اس نے پوچھا۔ ”سلطان! تمہارا فیصلہ کیا ہے؟“

اس نے جھکی جھکی نظروں سے شہناز کے پیٹ کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ”اپنی اولاد کی بہتری کے لئے‘ اس کا کیریئر بنانے کے لئے یہی مناسب ہے کہ بلوری کو تنہا نہ چھوڑا جائے اور نہ ہی اس سے دنیاوی تعلقات رکھے جائیں۔ ہم دور ہی دور سے اس کے لئے بہت کچھ کرتے رہیں گے۔“

سلامت علی نے خوش ہو کر صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”شاباش سلطان! تم میری بات مان رہے ہو۔ یہ ثابت کر رہے ہو کہ میرے رنگ میں رنگنے والے داماد بن کر رہو گے۔“

سلامت علی نے دوسرے ہی دن بلوری کا کیس اوپن کرایا۔ چوہدری دلاور حیات اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ سلامت علی کامیابی حاصل کر چکا ہے۔ اب وہ کیس اوپن کرائے گا اور اسے قانونی گرفت میں لے گا۔ فیقے کے بیان نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ پنڈ میں اور جیل کی چاردیواری میں بلوری پر بدکاری کا جھوٹا الزام لگایا گیا ہے۔ وہ خود زناکار ہے‘ زنا کے الزام میں اسے کوڑے لگائے جائیں گے۔ وہ اقتدار و اختیارات سے خالی ہو چکا تھا۔ کسی طرح اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا ملک سے فرار ہو گیا۔ سیاستدانوں کے دستور کے مطابق آئندہ اسی وقت واپس آ سکتا تھا‘ جب سلامت علی کی حکومت ختم ہو جاتی۔

سلامت علی نے بلوری سے تنہائی میں ملاقات کی۔ پھر اس سے کہا۔ ''آج سے دو دن بعد عدالت میں تمہاری پیشی ہے۔ انشاء اللہ تم بری کر دی جاؤ گی۔ میں ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''یہی کہ تم سلطان احمد کی بہتری چاہتی ہو؟ کیا یہ چاہتی ہو' وہ میرا داماد بننے کے بعد اپنا سیاسی کیریئر بنائے اور میری طرح اس ملک کا حکمران بنے؟''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''یہ تو میری دلی تمنا ہے۔ سلطان احمد نے مجھے بڑا حوصلہ دیا ہے۔ میری رہائی کے لئے بہت کوششیں کی ہیں۔ آپ کو مجھ تک پہنچایا ہے۔ میں اس کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ یہ چاہوں گی کہ وہ دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔''

وہ بولا۔ ''میں ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں۔ تم برا نہ ماننا۔''

وہ بولی۔ ''میں برا مان کر بھی آپ کا کیا بگاڑ لوں گی۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ جو کہنا ہے' صاف صاف کہہ دیں۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''وہ۔ دراصل بات یہ ہے کہ تم چوہدری کے ساتھ بہت زیادہ بدنام ہو چکی ہو۔ میری پارٹی کے تمام سیاستدان اور میرے تمام خاندان والے یہ جانتے ہیں کہ چوہدری کی داشتہ رہ چکی ہو۔ اس کے بچے کی ماں بن چکی ہو۔ تم سلطان احمد کی بہتری چاہتی ہو۔ کیا ایک سیاسی کیریئر بنانے والے کو تم سے کوئی تعلق رکھنا چاہئے؟''

یہ ایسی بات تھی کہ ایک دم سے اس کی آنکھوں بھیگ گئیں۔ وہ بولا۔ ''میں جانتا تھا' تمہیں بہت دکھ پہنچے گا۔ سلطان احمد اپنی زبان پر قائم ہے۔ وہ تمہیں تنہا اور بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ اب میں پاور میں ہوں۔ بہت وسیع اختیارات کا مالک ہوں۔ تم جو کہو گی' وہ تمہارے لئے کیا جائے گا۔ وہ تو تم سے ملنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اسے آنے سے روک دیا ہے۔ تم بتاؤ' میں نے اچھا کیا ہے یا برا کیا ہے؟''

وہ جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔ ''بہت اچھا کیا ہے۔ میں اپنی اوقات بھول گئی تھی۔ میری گود میں یہ بچہ ہے۔ میں دنیا والوں کو اس کا حساب نہیں دے پاؤں گی۔ بدنام ہوتی رہوں گی۔ ایسے میں یہ کبھی نہیں چاہوں گی کہ سلطان احمد میرے قریب

آئے اور میری بدنامی کا حصہ دار بنے۔ آپ نے بہت اچھا سوچا ہے' بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ بس سلطان جگ جگ جیئے۔ میں اس کا نام سنتی رہوں گی اور خوش ہوتی رہوں گی۔''

وہ بچے کو گود میں سنبھالتی ہوئی' آنسو پونچھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

اس کا مقدمہ دوسری بار عدالت میں پہنچا اور اسی دن فیصلہ ہو گیا۔ اسے باعزت طور پر بری کر دیا گیا۔ چونکہ میڈیکل رپورٹ نے فیقے کے متعلق بھی یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ بدکار نہیں ہے۔ اس لئے اسے بھی رہائی مل گئی۔ وہ دونوں دوسرے دن جیل سے باہر جانے والے تھے۔ اس سے پہلے ہی سلامت علی نے پھر آ کر ملاقات کی اور کہا۔ ''مجھے بتاؤ' میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟ جو بھی کروں گا' یہ سمجھ لینا کہ سلطان احمد تمہارے لئے کر رہا ہے۔''

وہ بولی۔ ''میں نے سوچا تھا' کبھی کسی کی مدد قبول نہیں کروں گی۔ یہاں سے نکلنے کے بعد خود محنت مزدوری کروں گی۔ پھر عقل نے سمجھایا' مجھے اپنے جائز حقوق حاصل کرنے چاہئیں۔ چوہدری نے مجھ سے جو کچھ چھینا ہے' کم از کم وہ سب کچھ تو مجھے ملنا چاہئے۔''

''بے شک۔ تم درست سوچ رہی ہو۔ مجھے بتاؤ' تمہارا کیا کچھ چھینا گیا ہے اور تم کیا چاہتی ہو؟''

''اوکاڑہ میرے مرحوم باپ کی کریانہ شاپ تھی۔ قریب ہی چک نمبر باون میں ہمارا ایک بڑا سا مکان تھا۔ چوہدری کے کارندوں نے وہ سب کچھ لوٹ لیا ہو گا۔ کیا لوٹا ہوا مال مجھے واپس مل سکتا ہے؟''

''ضرور مل سکتا ہے۔''

''میں نے یہاں کے ایک ریسٹ ہاؤس میں تمہاری عارضی رہائش کا انتظام کیا ہے۔ دو دنوں کے اندر پنڈ والا مکان اور اوکاڑہ والی دکان تمہیں واپس مل جائے گی۔ دکانداری کے لئے دس لاکھ روپے بھی ملیں گے۔ کیا تم دکانداری کر سکو گی؟''

اس نے فیقے کی طرف دیکھا پھر کہا۔ ''یہ ہمارا ملازم تھا۔ اسے دکانداری کا تجربہ ہے۔ یہ میری دکان چلائے گا۔ میں اس کے ساتھ رہوں گی۔ یہی میرا آئیڈیل ہے۔''

سلامت علی نے چونک کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''ایک جوان عورت تنہا زندگی نہیں گزار سکتی۔ چوہدری جیسے مرد اسے جینے نہیں دیتے اور فیقے جیسے بے ضرر

لوگ نئی زندگی دے دیتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا' یہ اندر سے کیا ہے؟ میں اس سے نکاح پڑھاؤں گی۔ یہ میرے لئے ڈھال بن کر رہے گا۔"

دو دنوں کے بعد بلوری اور فیقے کو ایک سرکاری گاڑی میں بیٹھا کر اوکاڑہ پہنچایا گیا۔ وہاں اسے دکھایا گیا کہ اس کی دکان سے ناجائز قبضہ ختم کردیا گیا ہے۔ وہاں کا تھانیدار اور تمام سپاہی اس کی اور دکان کی نگرانی کرتے رہیں گے۔

پھر اسے پنڈ والے مکان میں پہنچایا گیا۔ پنڈ کی عورتیں اور مرد اسے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ دعائیں دے رہے تھے اور دعاؤں کے ساتھ چوہدری کو گالیاں بھی دے رہے تھے۔

بڑی دیر تک پنڈ والے آتے رہے اور جاتے رہے۔ جب بھیڑ چھٹ گئی' سناٹا چھا گیا تو وہ اپنے مکان کو اندر سے اور باہر سے دیکھنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا' جیسے مدتوں بعد اپنی مٹی کو چھونے آئی ہے۔ اس نے فیقے سے کہا۔ "ہزاروں میل کا سفر طے کر کے مکے مدینے جاؤ۔ خانہ کعبہ کا طواف کرو تو ایک حج قبول ہوتا ہے۔ میں کتنے ہی پل صراط سے گزر کر واپس اپنے گھر پہنچی ہوں۔ کیا مجھے ایک حج کا ثواب ملے گا؟"

وہ کہتے کہتے چونک گئی۔ دور اس کی نظر ایک سات برس کی بچی پر پڑی۔ وہ لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں جا رہی تھی۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "اے! رک جا۔"

اس نے بچے کو فیقے کے حوالے کیا۔ پھر دوڑتی ہوئی ادھر جانے لگی۔ "رک جا رانو...! اکیلی کھیت میں نہ جا..."

وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس آ گئی۔ وہ رانو نہیں تھی۔ مگر اس کے لئے ہر بچی رانو جیسی تھی۔ اس نے بچی کا بازو پکڑ کر کہا۔ "خبردار! اکیلی کھیتوں میں نہ جانا۔ چل میں تیرے ساتھ چلتی ہوں۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھیتوں میں ذرا دور تک آئی پھر بولی۔ "جا... وہاں جا کر بیٹھ جا۔ میں یہاں پہرا دوں گی۔"

بچی وہاں سے ذرا دور چلی گئی۔ بلوری گھوم گھوم کر کھیتوں کو دیکھنے لگی۔ اس کے کانوں سہیلیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ "بکی اری او بکی...! تُو کہاں ہے...؟ کیا ہمارا بچپن

واپس نہیں آئے گا...؟"

اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ سہیلیوں کی آوازیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ ابھی بوڑھی نہیں ہوئی تھی۔ جوان بھی نہیں رہی تھی۔ جوانی کے کھنڈر سے بچپن پکار رہا تھا۔ "آ جا بکی...! آ جا..."

سہیلیوں کی ملی جلی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔

"کوکلا شپا کی جمعرات آئی جے
جیڑی دمی نے جنم لیا
اودی شامت آئی جے..."

ختم شد

قیامت کی پہلی رات

ہر شخص اپنی ذات میں تنہا ہوتا ہے۔وہ خاتون بھی تنہا تھی۔مگر ایک شجر سایہ دار کی طرح ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔وہ لاکھوں بوڑھوں کی بیٹی' جوانوں کی بہن اور بچوں کی ماں تھی۔جب کوئی دور تک پیار لٹانے لگے اور دلوں کو جیتنے لگے تو اسے صلیب پر چڑھا دیا جاتا ہے.....اسے بھی گولی ماردی گئی۔

مخالفین اور منافقین پیغمبروں کو نہیں چھوڑتے۔پھر اسے کیسے چھوڑ دیتے؟ مردوں نے بڑی سازشوں کے بعد ایک عورت کو گھیر کر اسے گولی مار کر مردانگی کی ایک نئی تاریخ رقم کی تھی۔

وہ ایسی عورت تھی کہ ادھر شہید ہوئی' اُدھر پوری دنیا پر سکتہ طاری کر دیا۔ازل سے بولتی ہوئی دنیا کو چند لمحوں کے لئے سہی.....چپ کر دیا۔آئندہ وقت بولے گا۔"لو.....وہ گئی.....مگر مری نہیں۔ہر کربلا کے بعد سچائی کو ایک نئی زندگی ملتی ہے۔"

ابھی تو بے گناہوں کی شامت آ رہی تھی۔انتقام کے جوش میں جدھر منہ پڑ رہا تھا' اُدھر گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔جلاؤ گھیراؤ شروع ہو چکا تھا۔دکانیں لوٹی جا رہی

تھیں۔بسوں' ویگنوں' ذاتی گاڑیوں' بینکوں اور پیٹرول پمپ وغیرہ کو آگ لگائی جا رہی تھی۔مرد' عورتیں اور بچے سب ہی پیدل ہو گئے تھے۔اپنے گھروں تک پہنچنے کے لئے کوئی گدھا گاڑی بھی نہیں مل رہی تھی۔

ایسے وقت اریمہ فیکٹری سے باہر آئی۔حالات نے سمجھا دیا تھا' دہشت گردوں کو موقع مل رہا ہے۔پتہ نہیں کب تک تخریبی کارروائیاں ہوتی رہیں گی؟ اس لئے تمام دفاتر بند ہو گئے تھے۔منیجر نے اریمہ اور دوسری عورتوں سے کہا۔"تم سب فیکٹری میں رات گزارو۔باہر گاڑیوں کو آگ لگائی جا رہی ہے۔ہماری گاڑی تمہیں چھوڑنے نہیں جائے گی۔"

ایک خاتون نے کہا۔"ہم نہ گئے تو بچے پریشان ہو جائیں گے۔"

ایک لڑکی نے کہا۔"میری امی دل کی مریضہ ہیں۔ان کا بائی پاس ہو چکا ہے۔ایسے حالات میں گھر نہیں جاؤں گی تو وہ روئیں گی۔ان پر جان لیوا دورہ پڑ سکتا ہے۔"

"انہیں فون کرو۔اپنی خیریت بتاؤ۔انہیں تسلیاں دو۔اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

اس لڑکی نے کہا۔"میرے گھر میں فون نہیں ہے اور پی سی او گھر سے دور ہے۔وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہیں۔مجھے کسی بھی طرح جانا ہی ہوگا۔"

وہ روتی ہوئی آنسو پونچھتی ہوئی چلی گئی۔کتنی ہی عورتیں دو دو' چار چار کی ٹولیوں میں یہ کہتی ہوئی فیکٹری سے نکلیں کہ گلی کوچوں سے ہوتی ہوئی کسی طرح گھر پہنچ ہی جائیں گی۔اریمہ نے منیجر شاہد بابر کے پاس آ کر کہا۔"آپ تو گاڑی میں جائیں گے۔مجھے کسی ایسی جگہ ڈراپ کر دیں۔جہاں سے کوئی بس یا ویگن مل سکے۔"

شاہد بابر نے ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔"تم تو بڑی اکڑتی تھیں۔بدن کو ایک ذرا سا ہاتھ لگایا تھا تو تم نے پارسا بن کر مجھے باتیں سنائی تھیں۔اب رات کے وقت میرے ساتھ جاؤ گی تو تمہاری پارسائی کہاں جائے گی؟"

وہ بولی۔"بڑے افسوس کی بات ہے۔ایسی افراتفری میں انسان کو انسان کے کام آنا چاہئے اور آپ....."

وہ بات کاٹ کر بولا۔"یہی تو میں تمہیں سمجھاتا آیا ہوں۔آج بھی تمہارے کام

آؤں گا۔تم بھی میرے کام آؤ۔"

وہ اس کی نیت کو خوب سمجھ رہی تھی۔طنزیہ انداز میں بولی۔"آپ میرے باپ جیسے ہیں۔بیٹی سے جو کام چاہیں' لے سکتے ہیں۔"

وہ ایکدم سے بپھر کر بولا۔"یوشٹ اپ....تمہارے کہنے سے میں باپ نہیں بن جاؤں گا۔تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔بجانا نہیں چاہو گی تو ساری رات یہاں نائٹ شفٹ والوں کے ساتھ گزارو گی۔"

وہ بولی۔"کچھ بھی ہو۔اب تم سے مدد نہیں مانگوں گی۔تمہارا بڑھاپا میرے لئے ترستا رہے گا۔"

پھر اس نے میز پر تھوک کر کہا۔"اطمینان قلب کے لئے ایک جوان لڑکی کا تھوک چاٹتے رہو۔"

وہ غصے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔دھاڑتے ہوئے بولا۔"دفع ہو جاؤ۔تم نے اپنی روزی کو خود لات ماری ہے۔کل سے یہاں آ کر اپنی منحوس صورت نہ دکھانا۔"

وہ انٹر کام کا بٹن دبا کر کیشئر سے بولا۔"اریمہ کا حساب چکتا کرو۔جو تنخواہ بنتی ہے' ابھی دو اور اس کی چھٹی کرو۔"

وہ اسے نفرت سے دیکھتی ہوئی اس آفس سے نکل کر کیشئر کے پاس آئی۔پھر اپنے واجبات وصول کر کے فیکٹری سے باہر آ گئی۔پارسائی کے جرم میں جیسے دھکے کھا کر باہر آئی تھی۔آس پاس حد نظر تک ویرانی اور سناٹا تھا۔اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں دو چار لوگ ادھر سے ادھر جاتے دکھائی دے رہے تھے۔سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' وہ تنہا کیسے جائے گی؟

اس کا گھر تیس کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔وہ دو بسیں بدل کر تقریباً دو گھنٹے میں وہاں پہنچتی تھی۔اس وقت پیدل ہو گئی تھی۔پتہ نہیں کہاں کہاں گولیاں چل رہی تھیں اور کن علاقوں میں وارداتیں ہو رہی تھیں؟ایسے حالات میں ایک جوان لڑکی صحیح سلامت اپنے دروازے تک پہنچ نہیں سکتی تھی۔

یہ مسئلہ ازل سے ہے۔امن و امان ہو یا ہنگامی حالات ہوں...لڑکیاں ہر حال میں چھینی جھپٹی جاتی ہیں۔

ایک کار کی ہیڈ لائٹس اس پر پڑنے لگیں۔وہ ایک طرف ہو گئی۔فیکٹری کے منیجر شاہد بابر کی کار تھی۔بڑا سا آہنی گیٹ کھل رہا تھا۔وہ گاڑی آگے بڑھتی ہوئی اس کے قریب سے گزرنے لگی تو اس نے اگلی سیٹ پر صائمہ کو منیجر کے ساتھ دیکھا۔وہ معنی خیز انداز میں اسے دیکھتا ہوا کار ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے گزر گیا۔اسے اپنی ہوس کا پیٹ بھرنے کے لئے وہاں کام کرنے والی ایک جوان بیوہ مل گئی تھی۔

پیچھے رہ جانے والوں پر جو گزرتی ہے۔وہ اریمہ کے دل پر گزر رہی تھی۔انسانوں کی دنیا میں برا وقت آنے پر کوئی ساتھ نہیں دیتا۔وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مین روڈ کی طرف جانے لگی۔آگے پیچھے دور تک تنہائی اور نیم تاریکی ڈرا رہی تھی کہ کسی بھی لمحے اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

اس نے سہمی ہوئی چال چلتے ہوئے تقریباً پچاس میٹر کا فاصلہ طے کر لیا۔دس پندرہ میٹر آگے ایک شاہراہ تھی۔دور ہی سے اکا دکا گاڑیاں امید کی کرن کی طرح گزرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔وہ دل کو سمجھا رہی تھی کہ گھر پہنچنے کے لئے کوئی بس یا ویگن مل سکتی ہے۔

سڑک کے کنارے پہنچتے ہی وہ چیخ مار کر لڑکھڑاتی ہوئی اوندھے منہ گر پڑی۔ایک دل دہلا دینے والا بم دھماکہ ہوا تھا۔یوں لگا' جیسے قریب ہی بم پھٹا ہو اور اس کے چیتھڑے اڑ گئے ہوں۔مگر وہ زندہ تھی۔حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اٹھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔سر سے پاؤں تک بری طرح لرز رہی تھی۔

اس نے سر گھما کر دیکھا' جس فیکٹری سے وہ نکل کر آئی تھی وہاں آگ اور دھوئیں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔سڑک کے کنارے دکانوں کے پاس جو لوگ تھے۔وہ جان بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔کوئی کسی گرنے پڑنے والے کو نہیں اٹھا رہا تھا۔سب ہی کو اپنی اپنی پڑی تھی۔

وہ کسی حد تک سنبھلنے کی کوششیں کر رہی تھی۔تھر تھر کانپتی ہوئی وہاں سے اٹھنا چاہتی تھی۔ایسے ہی وقت ایک گاڑی تیزی سے آ کر اس کے بالکل قریب رک گئی۔گاڑی کے اگلے پچھلے دروازے کھل گئے۔وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔وہاں سے اٹھ رہی تھی۔دو افراد نے اسے مال غنیمت کی طرح اٹھا کر اگلی سیٹ پر ڈال دیا اور خود پچھلی سیٹوں پر چلے

گئے۔ دروازے بند ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گاڑی اسٹارٹ ہو کر رفتار بڑھاتی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔

کہاں جانے لگی....؟

کوئی نہیں جانتا' خوش نصیبی یا بدنصیبی انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے؟ ناگہانی افتاد آپڑے اور کچھ سمجھ میں نہ آئے تو کبھی یاد نہ آنے والا خدا یاد آتا ہے۔ بندہ عاجز اور مجبور ہو کر اللہ تعالیٰ کی رضا میں راضی رہتا ہے کہ اس معبود کو جو منظور ہے' وہی ہوتا رہے گا۔ ایسے وقت بچاؤ کا ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ آیات پڑھی جائیں۔

اس نے زیر لب پڑھتے ہوئے کار چلانے والے کو دیکھا۔ وہ ایک نوجوان تھا۔ چہرے کی سختی بتا رہی تھی کہ بے رحم ہے اور غصے سے بھرا ہوا ہے۔ پھر اس نے سر گھما کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ وہاں تین افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کے پاس ریوالور اور دوسرے کے پاس کلاشنکوف تھی۔ کچھ سمجھائے بغیر سمجھ میں آ گیا کہ وہ دہشت گردوں کے چنگل میں پھنس گئی ہے۔

خوف اور دہشت سے جان نکلی جا رہی تھی۔ کچھ بولنے کے لئے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے بمشکل رونے کے انداز میں التجا کی۔ ''خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔''

ایک نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''منہ سے آواز نکالے گی تو مرے گی۔ کھڑکی کا شیشہ نہ اتارنا۔ باہر کسی کو اشارہ نہ کرنا۔''

گاڑی چلانے والے جوان نے گیئر بدلتے ہوئے کہا۔ ''زندہ رہنا چاہتی ہو تو وہی کرو' جو یہ کہتے ہیں۔ میں بھی یہی کر رہا ہوں۔''

اریبہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اگرچہ وہ غصے میں تھا۔ مگر جیسے صبر وضبط سے کام لے رہا تھا۔ سخت لہجے میں بول رہا تھا۔ ''میں بھی ان کے رحم و کرم پر ہوں۔ انہوں نے ہمیں آگے بٹھا کر گن پوائنٹ پر رکھا ہے۔''

اریبہ نے ایک گہری سانس لی۔ یہ عجیب سا سہارا ملا کہ ڈوبنے والی کشتی میں وہ تنہا نہیں ہے۔ ایک اجنبی ساتھ ڈوبنے یا ساتھ ابھرنے کے لئے موجود ہے۔ اس اجنبی

جوان کا غصہ بتا رہا تھا کہ وہ کچھ کر گزرنا چاہتا ہے مگر اپنی مجبوری کو سمجھ رہا ہے۔ خواہ مخواہ جان پر کھیلنے کی حماقت نہیں کر رہا ہے۔

پیچھے بیٹھا ہوا شخص فون پر رابطہ کرنے کے بعد کہہ رہا تھا۔ ''ہاں۔ ہم پہنچ رہے ہیں۔ ادھر کی پوزیشن بتاؤ؟''

وہ دوسری طرف کی باتیں سننے لگا۔ تھوڑی دیر تک ''ہوں۔ ہاں'' کرتا رہا۔ پھر اپنے ساتھیوں سے بولا۔ ''ہم اس لڑکی کو اُدھر نہیں لے جا سکیں گے۔''

دوسرے نے پوچھا۔ ''کیا وہاں گڑبڑ ہونے والی ہے؟''

''نہیں۔ وہ بولتا ہے' واردات کرو اور وہاں سے بھاگو۔ تھانے والے زیادہ ٹائم نہیں دیں گے۔''

ایک نے کہا۔ ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تھانیدار حصہ بھی لے گا اور ٹائم بھی نہیں دے گا۔''

''ہم اس سے بے بحث نہیں کر سکتے۔ ہمیں وہاں سے جتنا مال ملے آدھے گھنٹے کے اندر سمیٹ کر لانا ہے۔''

''پھر تو اس لڑکی کو اڈے میں لے جائیں گے۔ وہاں موج مستی کریں گے۔''

اریبہ سن رہی تھی۔ اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔ وہ رحم طلب نظروں سے پاس بیٹھے ہوئے جوان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتا ہوا ناگواری سے منہ بنا رہا تھا۔ حد نظر تک شاہراہیں ویران تھیں۔ یوں لگ رہا تھا' راتوں کو جاگنے والا کراچی شہر ہمیشہ کی نیند سو گیا ہے۔ انسانوں سے خالی ہو چکا ہے۔

پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے ڈرائیو کرنے والے جوان سے کہا۔ ''آگے الٹے ہاتھ گلی کو موڑو۔ گاڑی آہستہ آہستہ چلاؤ۔''

وہ اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ وہ کار ایک گلی میں مڑ کر دھیمی رفتار سے جانے لگی۔ پھر اس نے حکم دیا۔ ''سیدھے ہاتھ گلی میں چلو اور پانچویں کوٹھی سے آگے جا کر گاڑی روک دو۔''

وہ ان کے نرغے میں بیٹھی گھبرا رہی تھی۔ وہ لوگ موج مستی کی باتیں کرتے رہے

تھے۔ یہ سمجھ گئی تھی کہ خیر نہیں ہے۔ اس کے ساتھ بیٹھا جوان بھی اسے بچا نہیں پائے گا۔

ایسے وقت خیال آیا' اگر وہ بے شرم بن جاتی اور منیجر شاہد بابر کی بات مان لیتی تو پردے میں آبرو جاتی۔ اس کے ساتھ یوں اجتماعی درندگی نہ ہوتی۔ جیسی اب ہونے والی تھی۔

پیچھے ایک ساتھی دوسرے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ ''میں اکبر کے ساتھ جاؤں گا۔ تم ان دونوں کو نشانے پر رکھو گے۔ کوئی بھی چالاکی دکھائے تو فوراً گولی مار دینا۔ فائرنگ کی آواز سن کر بھی پولیس والے آدھے گھنٹے تک ادھر نہیں آئیں گے۔''

ڈرائیو کرنے والے نے مطلوبہ کوٹھی سے آگے جا کر گاڑی روک دی۔ وہ اتر کر جانے لگے۔ ایک نے حکم دیا۔ ''انجن بند نہ کرو۔ ہم بس ابھی آ رہے ہیں۔ پھر فوراً ادھر سے نکلنا ہے۔''

نوجوان نے کہا۔ ''ادھر روشنی ہے۔ آگے اندھیرے میں گاڑی رہے گی تو کسی کو شبہ نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ آگے لے جا کر اسے روکو۔''

پھر وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے کوٹھی کے آہنی گیٹ کے ضمنی دروازے کو کھول کر اندر چلے گئے۔ ادھر پیچھے بیٹھے ہوئے افراد نے نوجوان کی گردن سے پستول کی نال لگا رکھی تھی۔ اس نے حکم دیا۔ ''گاڑی کو اندھیرے میں لے چلو۔''

آگے صرف بیس یا بائیس میٹر تک جانا تھا۔ اس نے گیئر بدل کر گاڑی آگے بڑھائی۔ پیچھے سے دھمکی سنائی دی۔ ''خبردار! ذرا بھی ہوشیاری دکھاؤ گے تو گولی چل جائے گی۔''

وہ گیئر بدلتے ہوئے بولا۔ ''ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ یہ دیکھو.....''

اچانک ہی ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھی۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ پیچھے کی طرف گرتے گرتے ٹریگر پر دباؤ پڑا۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ہی ایک گولی کار کی چھت میں سوراخ کرتی چلی گئی۔ وہ اگلی پچھلی سیٹوں کے درمیان گر پڑا تھا۔ ریوالور اس کی گرفت میں تھا۔ لیکن وہ اپنا توازن برقرار رکھے بغیر گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی کوٹھی کے احاطے میں تھے۔ فائر کی آواز سن کر دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ گاڑی

آندھی طوفان کی رفتار سے دور ہوتی جارہی تھی۔ فائرنگ کی رینج سے بھی آگے نکل گئی تھی۔ وہ دوڑتے دوڑتے رک گئے۔ ان کا کھیل اچانک ہی بگڑ گیا تھا۔

گاڑی تیز رفتاری سے جارہی تھی۔ ادھر وہ سنبھل کر اٹھ رہا تھا۔ ڈرائیو کرنے والے جوان نے اریبہ سے کہا۔ ''نیچے بیٹھ جاؤ۔''

وہ فوراً ہی سیٹ سے پھسل کر نیچے آگئی۔ وہ دشمن موت کا ہرکارہ سنبھل گیا تھا۔ اس نے سیٹوں کے درمیان سے اٹھتے ہوئے گولی چلانے کے لئے نشانہ لینا چاہا۔ اس سے پہلے ہی گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ وہ اچھل کر چھت سے ٹکراتا ہوا اگلی سیٹوں کے درمیان گیئر پر آکر گرا۔ ریوالور ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ گیئر کا سرا اس کے سینے میں نیزے کی طرح لگا تھا۔ وہ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔

ڈیش بورڈ کے اندر ایئر فریشنر کا کین رکھا ہوا تھا۔ نوجوان نے فوراً ہی اسے نکال کر اس کی آنکھوں میں اسپرے کیا۔ وہ ایکدم سے چیخیں مار کر تڑپنے لگا۔ اس کے دونوں ساتھی تعاقب کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ پھر بھی اس جوان نے گاڑی آگے بڑھا کر رفتار بھی بڑھا دی۔

وہ دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھے تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ آنکھیں کھولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ یقیناً عارضی طور پر اندھا ہو چکا تھا۔ جوان نے آگے جا کر گاڑی روک دی۔ ایک طرف پڑے ہوئے پستول کو اٹھا کر اسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ''باہر نکل.....''

وہ نہ آنکھیں کھول رہا تھا' نہ کچھ دیکھ پا رہا تھا۔ جوان نے باہر نکل کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ پھر اسے بالوں سے پکڑ کر گاڑی سے باہر کھینچ لیا۔ اریبہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دیکھ رہی تھی۔ باہر کا منظر پوری طرح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے فائرنگ کی آواز سنتے ہی دونوں ہتھیلیاں آنکھوں پر رکھ لیں۔ وہ کسی کی ہلاکت دیکھ نہیں سکتی تھی۔ خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بولا۔ ''سیدھی طرح آرام سے بیٹھو۔''

وہ ونڈ اسکرین کی طرف منہ کر کے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''آ.....آپ نے اسے مار ڈالا ہے؟''

وہ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”پتہ نہیں کیوں ہمیں اخلاق اور تہذیب کا درس دیا گیا ہے؟ کسی درندے کو مارنا ہو تو یہی خیال آتا ہے کہ وہ بھی اللہ کی مخلوق ہے۔ اسے بھی کسی ماں نے جنم دیا ہے۔ میں چاہتے ہوئے بھی اسے ہلاک نہ کر سکا۔ بس زخمی کیا ہے۔“

وہ انکار کے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”تہذیب اور شرافت نے ہمیں کمزور بنا دیا ہے اور ہماری کمزوری دہشت گردوں کو شہ زور بنا رہی ہے۔ اگر ابھی میں چالاکی نہ دکھاتا تو وہ لوگ واردات کرنے کے بعد مجھے مخبری کے لئے زندہ نہ چھوڑتے اور تمہیں کہیں لے جا کر.....“

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اریمہ کا سر جھک گیا تھا۔ وہ بولا۔ ”ہم بڑی بے حیائی کے دور میں سانسیں لے رہے ہیں۔“

کار ایک مخصوص رفتار سے جا رہی تھی۔ وہ سر جھکائے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگی کہ ایک شریف نوجوان کی پناہ میں ہے اور جلد ہی گھر پہنچنے والی ہے۔ اس نے پوچھا۔ ”تم اتنی رات کو تنہا کہاں جا رہی تھیں؟“

وہ بولی۔ ”تھوڑی دیر پہلے جس گارمنٹ فیکٹری میں دھماکہ ہوا تھا۔ وہاں کام کرتی تھی۔ ابھی باہر آنے میں ذرا دیر ہو جاتی تو..... یا خدا! تیرا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔“

وہ اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اللہ تعالیٰ نے جان بچائی ہے اور آپ نے میری آبرو بچائی ہے۔ آپ بہت اچھے ہیں۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“

وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا۔ ”فی الحال تو اپنا ایڈریس بتاؤ۔ کہاں رہتی ہو؟ میں کس راستے سے تمہیں لے چلوں؟“

”میں سرجانی ٹاؤن میں رہتی ہوں۔“

”اوہ گاڈ! شہر کے آخری سرے سے نوکری کرنے یہاں آتی ہو؟“

”حالات سے لڑنے کے لئے تو دنیا کے آخری سرے تک بھی جانا پڑتا ہے۔“

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”درست کہتی ہو۔“

پھر اس نے ویران سڑک پر دور تک نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”آگے ڈرگ روڈ

اسٹیشن ہے۔ وہاں سے راشد منہاس روڈ کی طرف مڑنا چاہئے۔ یہ شارٹ کٹ صحیح رہے گا؟“

وہ پہلی بار مسکرا کر بولی۔ ”سواری کی لگام آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ناخدا بہتر جانتا ہے کشتی کو لہروں کی مرضی پر چھوڑنا ہے یا مخالف ہوا کے رخ پر لے جانا ہے۔“

وہ بھی جواباً مسکرا کر بولا۔ ”تم بہت اچھا بولتی ہو۔ نام پوچھ سکتا ہوں؟“

”اریمہ..... اریمہ امان اللہ..... امان اللہ میرے والد ہیں۔“

”میرا نام سجاد انور ہے۔ ہم الیکٹرونک آلات امپورٹ کرتے ہیں۔ شام ہوتے ہی دکانیں بند ہو رہی تھیں۔ میں بھی دکان بند کر کے گاڑی میں بیٹھنے آیا تو ان تینوں نے مجھے گن پوائنٹ پر اپنا محکوم اور تابعدار بنا لیا۔“

”آپ ماشاءاللہ دلیر بھی ہیں اور بے باک بھی..... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ نجات حاصل کرنے کے لئے ان بدمعاشوں سے اس طرح ٹکرا جائیں گے۔“

ڈرگ روڈ کے چوراہے پر گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔ مختلف سمتوں سے آنے والی گاڑیوں نے ایک دوسرے کا راستہ روک رکھا تھا۔ پتہ چلا ملینیم مال سے آگے راشد منہاس روڈ بند ہے۔ نیپا چورنگی پر جلاؤ گھیراؤ کیا جا رہا ہے۔ سجاد نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”اس کشتی کو حالات کے مطابق ہی لے جانا ہوگا۔ شارٹ کٹ والا راستہ بند ہے۔“

وہ بولی۔ ”جدھر سلامتی ہے۔ ادھر چلیں۔“

گاڑیوں کو ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھنے کا راستہ مل رہا تھا۔ وہ بولی۔ ”مجھے آپ کے ساتھ اطمینان ہے۔ میں محفوظ رہوں گی۔ گھر دیر سے پہنچوں کوئی بات نہیں۔ مگر امی ابو پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

”تمہیں فون کرنا چاہئے۔ اپنی خیریت بتاؤ گی تو انہیں اطمینان ہوگا۔“

”میں نے تین گھنٹے پہلے فون کیا تھا۔ لیکن اب فیکٹری میں بم دھماکہ ہوا ہے۔ یہ خبر وہاں تک پہنچی ہوگی۔ ابو میرے لئے بہت پریشان ہوں گے۔“

سجاد نے فوراً ہی اپنا موبائل فون نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ لو۔ ابھی ان سے بات کرو۔“

اس نے فون لے کر نمبر پنچ کئے۔ پھر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے

باپ کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو...! کون...؟''

وہ جلدی سے بولی۔ ''ابو! میں اریمہ بول رہی ہوں۔ گھر آ رہی ہوں۔ بس ذرا دیر ہوگی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔''

''بیٹی! تم کہاں ہو؟ کیسی ہو؟ ہم ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔ خبریں سن رہے ہیں۔ تمہاری فیکٹری کو جلتے دیکھا ہے۔ بتایا گیا ہے' وہاں سات مرد اور پانچ عورتیں جل کر ہلاک ہوگئی ہیں۔ زخمیوں کو ہسپتال پہنچایا جا رہا ہے۔''

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اسی لمحے ماں کی آواز سنائی دی۔ ''ہم پریشان نہیں ہوں گے۔ مگر سچ بولو۔ خدانخواستہ زخمی ہو کر کسی ہسپتال میں پہنچی ہو تو بتاؤ... ہم کسی بھی طرح تم تک پہنچنے کی کوششیں کریں گے۔''

''پریشان نہ ہوں امی! میں دھماکے سے پہلے ہی فیکٹری سے باہر نکل آئی تھی۔ بالکل ٹھیک ہوں۔ راستے میں ہوں۔ جگہ جگہ ٹریفک جام ہے۔ ذرا دیر سے پہنچوں گی۔''

دوسری طرف سے باپ کی آواز سنائی دی۔ وہ اس کی ماں سے بول رہا تھا۔ ''مجھے بات کرنے دو۔''

ماں کی آواز سنائی دی۔ ''ذرا رک جاؤ۔ تم سے زیادہ مجھے اس کی فکر ہے۔ کہہ رہی ہے' دیر سے پہنچے گی۔ کیوں دیر سے پہنچے گی؟ وہ ضرور کچھ چھپا رہی ہے۔ تم سے نہیں بولے گی۔ مجھے پوچھنے دو۔''

اریمہ نے مسکرا کر کہا۔ ''امی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ نیپا اور سہراب گوٹھ کا راستہ بند ہے۔ ادھر ہنگامے ہو رہے ہیں۔ دوسرے راستوں سے آنے میں دیر ہوگی۔''

''تم عورتوں کے ساتھ ہونا...؟''

اس نے چور نظروں سے سجاد کو دیکھا۔ پھر فون پر کہا۔ ''نہیں۔ فیکٹری کی گاڑی نہیں چل رہی ہے۔ ایک صاحب کے ساتھ ہوں۔ وہی مجھے پہنچانے آ رہے ہیں۔''

''وہ کون صاحب ہیں؟ بوڑھے ہیں یا جوان ہیں...؟''

اس نے پھر کن اکھیوں سے سجاد کو دیکھا اور کہا۔ ''میں فون بند کر رہی ہوں۔''

''رک جاؤ!... خبردار!... فون بند نہ کرنا۔ سچ سچ بتاؤ کس کے ساتھ ہو؟''

وہ ماں کے اس رویے کو سجاد سے چھپانا چاہتی تھی۔ جلدی سے بولی۔ ''فون میں بیلنس نہیں ہے۔ کہا نا... آ رہی ہوں۔''

ماں نے دھمکی دی۔ ''دیکھ لڑکی! فون بند کرے گی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

اریمہ نے رابطہ ختم کر کے فون سجاد کی طرف بڑھا دیا۔ وہ بولا۔ ''بیلنس بہت ہے۔ تمہیں بات پوری کرنی چاہئے۔''

''کوئی ضروری بات نہیں ہے۔ ابھی تو وہاں پہنچ جاؤں گی۔''

''پھر بھی... تم یہاں مطمئن ہو۔ مگر انہیں اطمینان نہیں ہے۔ ان کی محبت کو سمجھو۔ وہ تمہارے لئے تڑپ رہے ہوں گے۔''

وہ اچانک ہی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس نے تعجب سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟''

وہ آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''کوئی بات نہیں ہے۔ بس یونہی رونا آ گیا۔''

وہ گاڑیوں کے ہجوم میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ''ماں باپ کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ ان کی عارضی جدائی تمہیں رلا رہی ہے۔ کیا ان کی ایک ہی اولاد ہو؟ یقیناً یہی بات ہے۔ ادھر وہ بھی تڑپ رہے ہیں۔''

اسی وقت فون کی بیل سنائی دی۔ سجاد نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا پھر پوچھا۔ ''ہیلو کون...؟''

دوسری طرف سے اریمہ کی ماں نے پٹاخے کی طرح پھٹتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟ کیا میری بیٹی کے ساتھ ہو؟ اگر ہو تو فون اسے نہ دینا۔ تم مجھ سے بات کرو۔''

اریمہ بے خبر تھی کہ ادھر سے ماں بول رہی ہے۔ سجاد نے بڑی شائستگی سے کہا۔ ''جی فرمایئے۔ میں سمجھ رہا ہوں' آپ پریشان ہوں گی۔ میں جلد ہی انہیں آپ کے پاس پہنچا دوں گا۔''

اریمہ نے چونک کر فون کی طرف جھپٹتے ہوئے کہا۔ ''امی بول رہی ہوں گی؟ مجھے بات کرنے دیں۔''

دوسری طرف سے ماں نے تڑخ کر کہا۔ ''اے خبردار! فون اسے نہ دینا۔ پہلے تم مجھ سے بات کرو۔''

وہ اریبہ سے بولا۔ ''پلیز۔ یہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔''

''نہیں۔ فار گاڈ سیک۔ آپ ان سے نہ بولیں۔ فون مجھے دے دیں۔''

دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ ''اے میاں! وہ بولنے سے منع کر رہی ہے۔ اپنے کالے کرتوت چھپا رہی ہے۔ میں ننھی بچی نہیں ہوں۔ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہوں۔ پہلے مجھ سے دوٹوک بات کرو۔ یہ یاری دوستی کب سے چل رہی ہے؟''

سجاد نے کان سے فون ہٹاتے ہوئے اریبہ کو دیکھتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا یہ تمہاری امی ہیں؟''

وہ سمجھ گئی' ماں نے ضرور جاہلانہ انداز میں کوئی شرمناک بات کہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ آنچل میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ سجاد نے فون کو کان سے لگایا۔ وہ آوازیں دے رہی تھی۔ ''ارے تم کہاں ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟ میں زبان کی کڑوی ہوں۔ مگر دل کی بہت اچھی ہوں۔ مجھ سے معاملہ کرو۔ پھر میں نہیں روکوں گی۔ جب چاہو گے' اسے یہاں سے لے جاؤ گے۔''

اس نے کن اکھیوں سے اریبہ کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''کیا پہلے بھی کسی سے معاملہ طے ہوا ہے؟''

''ارے نہیں میاں! وہ بالکل کورا کاغذ ہے۔ اب تک تو یہی کہہ کر مجھے الو بناتی رہی کہ گارمنٹ فیکٹری میں کام کر رہی ہے۔ عزت آبرو سے دس ہزار روپے کما کر لا رہی ہے۔ آج شہر میں ہنگامے نہ ہوتے تو بھید نہ کھلتا۔ سچ بتاؤ' کیا وہ ماہانہ دس ہزار روپے تم اسے دیتے ہو؟''

وہ اس کی باتیں سن رہا تھا اور غصے سے ہونٹ بھینچ رہا تھا پھر بولا۔ ''اگر اس لڑکی نے تمہیں ماں نہ کہا ہوتا تو میں ابھی تم پر تھوک دیتا۔''

وہ چنگھاڑنے کے انداز میں بولی۔ ''اے تھوکنے والے! سمجھ لے' اب تُو کام سے گیا۔ ابھی تھانے میں تیرا فون نمبر لکھواؤں گی۔ بیان دوں گی کہ تُو نے ہنگاموں سے فائدہ

اٹھا کر میری بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ تجھ سے تو پولیس والے ہی....''

اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو بہت ہی خطرناک عورت ہے۔ تم اسے ماں کہتی ہو؟''

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ ''میری امی اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ابو نے ان کے بعد دوسری شادی کی تھی۔ آپ گاڑی روکیں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے پلٹ کر دروازہ کھولنا چاہا۔ سجاد نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا حرکت ہے؟ کہاں جا رہی ہو؟''

وہ بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے چھوڑ دیں۔ میں زندہ نہیں رہوں گی۔''

کار رک گئی تھی۔ پیچھے والی گاڑیوں کے ہارن چیخ رہے تھے۔ اس نے ایک ہاتھ سے اریبہ کو روک رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے کار کو آہستہ آہستہ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''پلیز میرے لئے پرابلم نہ بنو۔ آرام سے بیٹھو۔''

''آپ میرا بازو چھوڑ دیں۔''

''تم جانتی ہو' میں نے اسے نیک نیتی سے پکڑا ہے۔ تم موت چاہتی ہو۔ میں تمہاری زندگی چاہتا ہوں۔''

وہ رہائی پانے کے لئے مچلتے ہوئے بولی۔ ''میں ذلت سے جینا نہیں چاہتی۔''

''کون تمہیں ذلیل کر رہا ہے؟''

''میری ماں۔ میرے اپنے مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہنے دیتے۔ میں عزت کے بغیر جینا نہیں چاہتی۔''

''تمہیں جینا چاہئے۔ تم عزت سے ماہانہ دس ہزار کماتی رہی ہو۔ خدا تم سے خوش ہے۔ آج اس نے تین غنڈوں سے تمہاری عزت بچائی ہے۔ کیا اس حقیقت سے انکار کرو گی کہ خدا تم پر مہربان ہے؟''

وہ تھم گئی۔ بازو چھڑانا بھول گئی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا تم انکار کرو گی کہ میں نے ایک وسیلہ بن کر تمہاری عزت بچائی ہے؟''

وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتی تھی۔ سر جھکا کر بولی۔ ''میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔''

''تم میرے احسان کا بدلہ ابھی چکا سکتی ہو۔''

وہ ذرا ہچکچا کر بولی۔ ''میں.... ابھی کیسے چکا سکتی ہوں؟''

''خودکشی سے توبہ کرکے۔ میرے احسان کو یاد کرنے کے لئے زندہ رہو۔''

اس کا سر جھک گیا۔ سجاد نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ تمام گاڑیاں چیونٹی کی چال چل رہی تھیں۔ ٹریفک ایسا درہم برہم تھا کہ کسی کو تیزی سے آگے نکلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

اس نے اریبہ پر ایک نظر ڈالی پھر ڈرائیونگ پر توجہ دیتے ہوئے کہا۔ ''آج تم صحیح سلامت گھر نہیں پہنچو گی تو پولیس والے مجھے حوالات میں پہنچا دیں گے۔''

وہ بولی۔ ''پولیس والے نہیں جانتے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

''تمہاری سوتیلی ماں نے دھمکی دی ہے۔ شاید وہ اپنی دھمکی پر عمل بھی کر رہی ہوگی۔ کہہ رہی تھی' میرا فون نمبر اس کے پاس پہنچا ہوا ہے۔ وہ تھانے میں نمبر لکھوا کر بیان دے گی کہ میں تمہیں اغوا کرکے لے جا رہا ہوں۔''

''اور میں یہ بیان دوں گی کہ آپ میرے محسن ہیں۔''

''خودکشی کے بعد کیسے بیان دو گی؟''

اس کا سر جھک گیا۔ وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ ''میں خودکشی نہیں کروں گی۔ زندہ رہوں گی۔''

سجاد نے بڑی سنجیدگی سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''مگر وہاں نہیں جاؤں گی۔ وہ گھر جہنم سے بدتر ہو چکا ہے۔''

''بات تو وہی ہوئی۔ گھر نہیں جاؤ گی تو تمہارے اغوا کی رپورٹ درست مان لی جائے گی۔ میں پکڑا جاؤں گا۔''

وہ کچھ نہ بول سکی۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر سوچنے لگی۔ بعض اوقات حالات کی مار ایسی پڑتی ہے کہ دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ بدنصیبی پیچھے پڑ جائے تو اچھا

کرنے پر بھی برائی سامنے آتی ہے۔

سجاد اس کے ساتھ اچھا سلوک کر رہا تھا۔ وہ اسے کسی مصیبت میں پھنسانا نہیں چاہتی تھی اور سوتیلی ماں کے سائے میں بھی جانا نہیں چاہتی تھی۔

وہ بولا۔ ''میں اس حد تک تو سمجھ گیا ہوں کہ اس گھر کا ماحول تمہارے مزاج کے خلاف ہے۔ اسی لئے وہاں جانا نہیں چاہتیں۔''

وہ بولی۔ ''میں نے اس گھر میں بچپن گزارا ہے۔ امی جیسے بھی مظالم ڈھاتی رہیں' انہیں برداشت کرتی رہی۔ مگر جوان ہونے کے بعد وہ پیچھے پڑ گئیں کہ ہزاروں لاکھوں روپے کمانے والے کسی بڑے آدمی کو پھانس کر گھر لے آؤں۔''

اس نے ناگواری سے کہا۔ ''پلیز۔ میرے سامنے اس عورت کو امی نہ کہو۔ اس کا نام کیا ہے؟''

''نام تو زینت بیگم ہے۔ مگر وہ انڈین فلمی ہیروئن زینت امان کو بہت پسند کرتی ہیں۔ ان کی یہ زینت امان بننے کی خواہش اس طرح پوری ہو گئی کہ میرے ابو کا نام امان اللہ ہے۔''

''میرا خیال ہے' تمہارے ابو اس زینت امان کے دباؤ میں رہتے ہیں۔''

''ہاں۔ انہوں نے بڑھاپے میں شادی کرنے کی غلطی کی۔ اس کی سزا خود بھی پا رہے ہیں اور مجھے بھی عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ ستر برس کے ہیں اور زینت بیگم چالیس برس کی۔ خود کو کم عمر ثابت کرنے کے لئے کہتی ہیں' انہیں امی نہیں.... باجی کہا کروں۔''

''جب وہ تم سے کہتی ہیں کہ لاکھوں روپے کمانے والے کو پھانس کر لاؤ تو خود کیسے گل کھلاتی ہوں گی؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''ہاں۔ ان کی شرمناک حرکتوں سے ہمارے خاندان کی نیک نامی خاک میں مل چکی ہے۔ ابو بیمار ہیں۔ چار پائی پر پڑے رہتے ہیں۔ نہ کماتے ہیں' نہ گھر کے رکھوالے بن سکتے ہیں۔ ایک بار انہوں نے تنہائی روتے ہوئے مجھ سے کہا تھا' بیٹی! کوئی باپ اپنی اولاد کو ایسا مشورہ نہیں دیتا۔ لیکن میں دے رہا ہوں' یہاں سے بھاگ جاؤ۔ میری فکر نہ کرو۔ اگر نہیں جاؤ گی اور کسی دن تمہاری عزت پر آنچ آئے گی تو

میرا دم نکل جائے گا۔اس سے پہلے ہی چلی جاؤ۔"

سجاد نے دیکھا۔اس کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔وہ انہیں روکنے کی کوششیں کر رہی تھی۔کبھی دوپٹے سے آنکھیں پونچھ رہی تھی۔اس نے کہا۔"میں ابو کو زینت بیگم کے رحم وکرم پر چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔اسی لئے اپنے مزاج کے خلاف وہاں رہتی رہی۔اب یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ ابو میری اخلاقی پستی نہیں دیکھنا چاہتے۔آخری سانسوں میں اطمینان چاہتے ہیں کہ میں اس جہنم سے نکل گئی ہوں۔"

وہ بول رہی تھی۔وقت گزر رہا تھا۔انہوں نے دس منٹ کا راستہ ایک گھنٹے میں بڑے صبر وتحمل سے طے کیا۔وہ بلوچ کالونی پہنچ گئے۔وہاں سے راستہ بدل کر آگے جاسکتے تھے۔ایسے ہی وقت تڑاتڑ فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔سجاد نے اسے کھینچ کر اپنی طرف جھکایا۔پھر خود بھی جھکتے ہوئے بولا۔"ادھر سیٹ کے نیچے بیٹھو۔میں گاڑی نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

وہ سر اٹھانا چاہتا تھا۔وہ ایکدم سے گردن میں بانہیں ڈال کر لپٹ گئی۔اسے اٹھنے سے روکتے ہوئے بولی۔"نہیں۔سر نہ اٹھائیں۔گولی لگ سکتی ہے۔"

باہر موت تھی۔اندر محبت' مروت اور انسانیت تھی۔وہ ایک دوسرے کی سلامتی چاہتے تھے۔ایک دوسرے کے چہرے سے یوں لگ گئے تھے کہ سانسیں ٹکرا رہی تھیں۔

وہ کون لوگ تھے؟ کیوں گولیاں چلا رہے تھے؟ بم دھماکے کر رہے تھے۔دکانوں اور فیکٹریوں کو آگ لگا رہے تھے.....کیوں؟

ایک عظیم خاتون رہنما کی شہادت کے بعد پورے شہر میں آگ اور خون کی ہولی کیوں کھیلی جارہی تھی؟ یہ سوال سب ہی کے ذہنوں میں تھا۔مگر جواب نہیں مل رہا تھا۔وہ خونی ڈرامہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

بلوچ کالونی کے پل کے نیچے دور تک گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔پتہ نہیں کتنی سمتوں سے فائرنگ کی گئی تھی؟ سب ہی اپنی اپنی جگہ دبک گئے تھے۔یوں دبک کر رہنے سے ان دونوں کو احساس ہوا کہ قیامت کی اس گھڑی میں چور جذبے دبے پاؤں حادی ہو رہے ہیں۔

فائرنگ تھم گئی تھی۔سجاد نے بڑی اپنائیت سے اریمہ کو دیکھا۔اس کی آنکھیں حیا

سے جھک گئیں۔سجاد نے محتاط انداز میں سر اٹھا کر دیکھا۔اکادکا گاڑیاں کسی طرح راستہ بنا کر وہاں سے نکل رہی تھیں۔اس نے بھی کار اسٹارٹ کی۔

اریمہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔دوپٹے کو سر سے اوڑھ کر خود کو چھپانے لگی۔کچھ دیر تک لگے رہنے کے بعد جانے کیسی لگن پیدا ہو گئی تھی۔اب وہ اجنبی نہیں لگ رہا تھا۔دوپٹے میں چھپنے کے باوجود صاف چھپنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔اسے چور نظروں سے دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔

وہ دوسری گاڑیوں کے ساتھ سروس روڈ سے ہو کر دوسرے راستے پر آگئے۔ادھر نہ زیادہ ٹریفک تھا۔نہ کسی طرح کی رکاوٹ تھی۔انہوں نے کھڑکی کے شیشے نیچے کر دیئے۔ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ایسا لگ رہا تھا' جیسے حبس بے جا سے نکل کر کھلی فضا میں آگئے ہوں۔

موبائل فون کی بیل سنائی دی۔سجاد نے ننھی سی اسکرین پر نمبر پڑھ کر کہا۔"وہ چڑیل پھر کال کر رہی ہے۔"

اریمہ بہت اچھے موڈ میں تھی۔جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔پریشان ہو کر فون کی طرف دیکھنے لگی۔سجاد نے کہا۔"تم خاموش رہنا۔میں بات کرتا ہوں۔"

اس نے فون آن کر کے کان سے لگایا پھر کہا"ہیلو محترمہ! آپ کون ہیں؟ کیوں مجھے بار بار پریشان کر رہی ہیں؟"

ایک مرد کی آواز سنائی دی۔"اوئے میں علاقے کا تھانیدار بول رہا ہوں۔لڑکی کہاں ہے؟"

سجاد نے کہا۔"اوہ گاڈ! میں کہاں پھنس گیا ہوں؟ ایک گھنٹہ پہلے اسی نمبر سے فون کر کے ایک خاتون نے پوچھا تھا کہ اس کی بیٹی کہاں ہے؟ آخر میرا فون نمبر آپ لوگوں کو کہاں سے مل گیا ہے؟"

"اوئے! زیادہ بک بک نہ کر۔پہلے اس لڑکی نے اس نمبر پر فون کیا تھا۔"

"اگر آپ واقعی تھانیدار ہیں تو توجہ سے سنیں۔کسی نے مجھے ایس ایم ایس کے ذریعے کہا تھا' میں اس نمبر پر رابطہ کروں۔بہت اہم باتیں کرنی ہیں۔تب میں نے فون کیا تو

ایک محترمہ نے کہا کہ وہ انڈین فلم کی ہیروئن زینت امان ہے۔ آپ ابھی اس سے پوچھیں' وہ خودکو زینت امان کہتی ہے یا نہیں؟"

"ہاں۔ اس نے تھانے میں یہی نام بتایا ہے۔"

ادھر سے آواز سنائی دی۔ وہ زینت بیگم سے پوچھ رہا تھا۔ "اوئے! تو زینت امان کہاں سے آگئی؟ وہ تو انڈیا میں رہتی ہے۔"

سجاد نے مسکرا کر اریبہ کو دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ "وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ معاملہ تھانے تک پہنچ گیا ہے اور آپ مسکرا رہے ہیں؟"

تھانیدار نے فون پر کہا۔ "لو جی! بات کلیئر ہوگئی۔ یہ پاکستانی کچی آبادی والی زینت امان ہے۔"

"آپ اس سے پوچھیں' وہ اپنی بیٹی کے اغوا کا الزام مجھ پر کیوں لگا رہی ہے؟ میں سپرنٹنڈنٹ کمال احمد کا چھوٹا بھائی جمال احمد ہوں۔ اب اگر الزام لگایا تو......"

وہ جلدی سے بولا۔ "سر جی! آپ ایس پی صاحب کے بھائی ہیں۔ سوری جناب! میں آپ کو سلوٹ کر رہا ہوں۔"

سجاد نے کہا۔ "وعلیکم سلوٹ... اس عورت کو ٹھڈے مار کر تھانے سے باہر کرو۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ اریبہ نے کہا۔ "آپ نے ایک پولیس افسر کا حوالہ دیا ہے۔ جب یہ جھوٹ معلوم ہوگا تو......"

وہ بولا۔ "جھوٹ صرف اتنا ہی ہے کہ میں جمال احمد نہیں ہوں۔ مگر ایس پی کمال احمد کا چھوٹا بھائی جمال احمد میرا دوست ہے۔ بات بگڑے گی تو وہ بنالے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ وہاں تھانے میں زینت امان کی شامت آگئی ہوگی۔"

وہ پریشان ہوکر سوچنے لگی۔ سجاد نے پوچھا۔ "اب کیا ہوا؟"

وہ بولی۔ "تھانے میں اس کی بے عزتی ہوگی تو وہ گھر آکر سارا غصہ ابو پر اتارے گی۔"

"کھسیانی بلی کو کھمبا نوچنے دو۔ تمہارے ابو نے اس سے شادی کی ہے۔ اسے ایک عرصے سے بھگت رہے ہیں۔ کچھ اور بھگت لینے دو۔ اپنا فیصلہ سناؤ' کیا ارادہ ہے؟ کہاں

جاؤ گی؟ کہیں ٹھکانہ بنا سکتی ہو؟"

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یوں اچانک بے گھر ہو جاؤں گی۔ سر سے چھت کھسک جائے گی۔ کھلے آسمان تلے آجاؤں گی۔"

"یعنی کسی کا آسرا نہیں ہے؟"

"میری ایک بہت اچھی سہیلی ہے۔ مجھے بہت چاہتی ہے۔ کئی بار کہہ چکی ہے' میں سوتیلی ماں کو چھوڑ کر اس کے ساتھ رہوں۔"

"کیا ابھی وہاں جا سکتی ہو؟"

"ہاں.... مگر نہیں جاؤں گی۔ کئی برس پہلے اس کی ماں وفات پا چکی ہے۔ اس کے باپ نے مجھے شادی کے لئے پرپوز کیا تھا۔ جبکہ میں اس کی بیٹی کے برابر ہوں۔ میں نے وہاں جانا چھوڑ دیا ہے۔"

"ہماری زندگی میں ایسا ہوتا ہے۔ سہارے ملتے ہیں۔ مگر سہارا دینے والے یا تو کمزور ہوتے ہیں یا خود غرض....."

وہ باتیں کرتے کرتے کلفٹن کے علاقے میں آگئے۔ اریبہ نے چونک کر پوچھا۔ "یہ ہم کہاں پہنچ گئے ہیں؟"

"یہ امیر کبیر لوگوں کا علاقہ ہے۔ یہاں کبھی ہنگامے نہیں ہوتے۔ آج بھی کہیں توڑ پھوڑ نہیں ہو رہی ہے۔ یہاں کچھ سکون حاصل ہوگا۔ ہم کچھ کھائیں گے' پئیں گے اور تمہارے معاملات پر غور کریں گے۔"

وہ تین تلوار سے آگے ایک چوک میں آگئے۔ وہ بارونق رہنے والا چوک اس وقت کچھ اجڑا اجڑا سا دکھائی دے رہا تھا۔ معمول کی چہل پہل نہیں تھی۔ پھر بھی دو چار ہوٹل کھلے ہوئے تھے۔ انہوں نے سڑک کے کنارے کار روکی پھر ایک ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے۔ سجاد نے اریبہ کی پسند کے مطابق کھانے کا آڈر دینے کے بعد کہا۔ "آج تم آزاد ہو۔"

اس نے کہا۔ "ہاں۔ اس حوالے سے آزاد ہوں کہ مجھے قید کرنے والی چار دیواری نہیں رہی ہے۔ نہ میں کسی کے لئے پریشان ہوں۔ نہ کوئی پریشانی سے میرا انتظار کر رہا ہے۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ ''ایک ابو ہیں۔ انہیں میرا انتظار بھی ہوگا اور وہ دعائیں بھی مانگ رہے ہوں گے کہ میں واپس نہ آؤں۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''بعض حالات میں لہو کے رشتے بہت کمزور ہو جاتے ہیں۔ ابو میری عزت آبرو کی سلامتی چاہتے ہیں۔ ایسی افراتفری اور ہنگاموں کے وقت اپنی بیٹی کو گھر سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ باہر میری جان جا سکتی ہے۔ مگر گھر میں تو عزت سے بھی جاؤں گی۔''

''گلستان جوہر میں میرا ایک اپارٹمنٹ ہے۔ وہ خالی پڑا ہے۔ تم وہاں رہ سکتی ہو۔''

''تنہا لڑکی مسجد میں بھی رہے تو بدنام ہو جاتی ہے۔ دس طرح کے سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ اس کا باپ بھائی یا شوہر کیوں نہیں ہے؟ کیا کام کرتی ہے؟''

''ہاں۔ ایسا محاسبہ نہ کیا جائے تو عورتیں بے لگام ہو جاتی ہیں۔''

''عورتیں تو ہمیشہ پابندیوں میں رہتی آئی ہیں۔ مرد انہیں پابندیوں میں رکھ کر خود کو بے لگام ہونے سے روکتا ہے۔''

وہ بولا۔ ''ہم بنیادی طور پر شریف اور مہذب نہیں ہیں۔ ہزاروں سال سے عورت مرد کے اور مرد عورت کے چال چلن پر شبہ کرتا آ رہا ہے۔''

''سیدھی سی بات ہے۔ مرد خونخواری سے باز آجائے تو عورت کبھی کسی خطرے سے دوچار نہ ہو۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک مرد شب خون مارتا ہے اور دوسرا باڈی گارڈ بنتا ہے۔''

سجاد نے کہا۔ ''تم بہت زیادہ بولتی ہو۔''

''کیا یہ غلط ہے کہ دنیا آپ لوگوں کی مٹھی میں ہے؟ عورتیں آپ کی محکوم ہیں۔ آپ چاہیں تو سارے فتنے فسادات ختم کر سکتے ہیں۔ مگر نہیں کریں گے اور اگر کریں گے تو آپ کی دنیا رنگینیوں اور مستیوں سے خالی ہو جائے گی۔''

وہ چپ ہو گئی۔ میز پر کھانے کی ڈشیں لا کر رکھی جا رہی تھیں۔ سجاد نے ویٹر کے جانے کے بعد کہا۔ ''کھانا شروع کرو اور غم دوراں کی نہیں، غم جاناں کی بات کرو۔ ساری رات سڑکوں پر بھٹکنا ہے یا کسی چھت کے نیچے پناہ لینی ہے؟''

وہ بولی۔ ''حیدرآباد میں میرے ماموں اور سکھر میں میری پھوپھی رہتی ہیں۔''

''ادھر ٹی وی کی طرف دیکھو! پورے ملک میں ماموں اور پھوپھیاں ایک دوسرے سے کٹ گئے ہیں۔''

ٹی وی پر خبریں پیش کی جا رہی تھیں۔ ٹرینوں کی آمدورفت رک گئی تھی۔ ریلوے لائنیں اکھاڑ دی گئی تھیں۔ ٹرینوں کی کتنی ہی بوگیاں جلا دی گئی تھیں۔

اریمہ نے کہا۔ ''ایسی وارداتیں روز کمانے' روز کھانے والے امن پسند غریب عوام تو نہیں کر سکتے۔''

سجاد نے کہا۔ ''کسی سیاسی پارٹی کے کارکن بھی ایسا کرنے کے بعد کوئی سیاسی مفاد حاصل نہیں کر سکیں گے۔ سیدھی سی بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ سوچے سمجھے منصوبوں کے مطابق دہشت گردی اور تخریب کاری کرائی جا رہی ہے۔''

''کون کرا رہا ہے؟''

''ایسے وقت یہی کہا جاتا ہے کہ وہ خفیہ ہاتھ ایسی تخریب کاری کراتے ہیں' جنہیں پاکستان کا وجود گراں گزرتا ہے۔''

''ہم ایسا کیوں ہونے دیتے ہیں؟''

''ہم نہیں ہونے دیتے۔ حکومت کی کمزوریاں خفیہ ہاتھوں کو مضبوط کرتی ہیں۔ بائی دا وے ہم پھر زمانے کا غم کھا رہے ہیں۔ اپنی بات کرو۔ ہائی وے کے راستے بھی نہیں جا سکو گی۔''

''آپ میرے لئے پریشان ہیں۔ میرے ساتھ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ واپس گھر چلی جاؤں۔''

وہ چپ رہا۔ سر جھکائے کھاتا رہا۔ اریمہ نے کہا۔ ''مجھے میری ملازمت سے بھی نکال دیا گیا ہے۔ فیکٹری بھی تباہ ہو گئی ہے۔ آمدنی کا ذریعہ ختم ہو چکا ہے۔ سوتیلی ماں کے سائے میں جانا ہی ہوگا۔''

''تمہاری تعلیم کیا ہے؟''

''بارہویں جماعت پاس کرنے کے بعد آگے نہ پڑھ سکی۔''

”میں مما اور پاپا سے کہوں گا‘ تمہیں ملازمت مل جائے گی۔ جسٹ آمنٹ.....“

وہ نیپکن سے منہ صاف کر کے موبائل فون پر نمبر پنچ کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ وہ بولا۔ ”ہائے مما...!“

ماں نے کہا۔ ”بیٹے! تم کہاں ہو؟ تمہارا نمبر بند کیوں جا رہا تھا؟“

”سوری مما! میں نے سم بدل دی ہے۔ آپ کو بتانا بھول گیا تھا۔“

”فون تو کرنا چاہئے تھا۔ تمہارے ڈیڈ پریشان ہو رہے ہیں۔ لو...ان سے بات کرو۔“

”ابھی نہیں مام! پہلے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”کیا بات ہے بولو...؟“

وہ کن انکھیوں سے اریبہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو ایک لڑکی سے ملانا چاہتا ہوں۔ ابھی ملنا چاہیں گی؟“

اریبہ منہ تک لقمہ لے جاتے جاتے رک گئی۔ سر جھکائے اس کی باتیں سننے لگی۔ اس کی مما پوچھ رہی تھیں۔ ”کیا تم کسی لڑکی کے ساتھ ہو؟“

”جی...تین تلوار کے قریب ایک ہوٹل میں ہوں۔“

”تعجب ہے۔ پورے شہر میں افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ گولیاں چل رہی ہیں۔ دھماکے ہو رہے ہیں۔ آگ لگ رہی ہے اور تم کسی کے ساتھ رومانس کر رہے ہو؟ فوراً اسے یہاں لاؤ۔“

”فوراً نہیں آسکوں گا۔ ابھی تک کتنے ہی راستوں میں رکاوٹیں ہیں۔ کہیں کہیں گاڑیاں جلائی جا رہی ہیں۔“

”پھر تو ابھی نہ آؤ۔ ہوٹل میں ہی رہو۔ ویسے وہ کون ہے؟ کیا اس کے گھر والے اس کے لئے پریشان نہیں ہو رہے ہیں؟“

”اس کے گھر کی طرف جانے والے راستے بھی بند ہیں اور میں اس کے ساتھ کسی ہوٹل میں نہیں رہ سکتا۔ خواہ کتنی ہی دیر ہو جائے۔ میں گھر آؤں گا۔“

”اچھی بات ہے۔ دیکھ بھال کر آؤ۔ میں تمہارا انتظار کرتی رہوں گی۔“

اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ اریبہ نے پوچھا۔ ”آپ مجھے اپنے گھر لے جائیں گے؟“

”ہاں۔ میں نہیں چاہتا‘ تم اپنے اس آفت زدہ مکان میں جاؤ اور پھر کسی آفت سے دوچار ہوتی رہو۔“

”مگر آپ کے بزرگ میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟“

”وہ میرے والدین ہیں۔ میری طرح دوسروں کی مجبوریوں کو سمجھتے ہیں۔ موجودہ حالات میں پتہ نہیں کتنی عورتیں‘ بوڑھے اور بچے سواری نہ ملنے کے باعث گھروں سے دور بھٹک رہے ہوں گے۔ ان میں سے تم بھی ایک ہو۔ ابھی تک بھٹک رہی ہو۔“

وہ اس کی باتیں سن رہی تھی اور گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سجاد نے کہا۔ ”تم نے کھانے سے ہاتھ روک لیا ہے۔“

”میں کھا چکی ہوں۔ خوراک اتنی ہی ہے۔“

”جھوٹ بول رہی ہو۔ تمہارے چہرے سے پریشانی جھلک رہی ہے۔ کیا میرے گھر جانا نہیں چاہتیں؟“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”آپ کی تو عالیشان کوٹھی ہوگی۔ میں نے خوبصورت اور مہنگی کوٹھیاں دور سے دیکھی ہیں۔ کبھی اندر نہیں گئی۔ پلیز۔ مجھے وہاں نہ لے جائیں۔“

وہ شرارت سے بولا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں‘ میری کوٹھی تمہارے شایانِ شان نہیں ہے۔ تم وہاں قدم رکھنا نہیں چاہتیں۔“

وہ جلدی سے بولی۔ ”آپ الٹی بات سمجھ رہے ہیں۔ میں اس کوٹھی کے قابل نہیں ہوں۔“

”نہیں۔ وہ کوٹھی تمہارے قابل نہیں ہے۔ تم میرا دل رکھنے کو اُسے برتر اور خود کو کمتر کہہ رہی ہو۔ میں مما سے جا کر کہہ دوں گا۔“

اس نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا کہہ دیں گے؟“

”یہی کہ تم مجھے اپنے قابل نہیں سمجھتی ہو۔“

"میں نے یہ کب کہا...؟"

"یعنی اپنے قابل سمجھتی ہو؟"

یہ ذومعنی سوال تھا۔وہ الجھ گئی۔جواب ہاں یا ناں میں دینا تھا۔وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔"جی۔وہ۔وہ......"

اس نے کہا۔"مجھے اپنے قابل سمجھتی ہو یا نہیں؟ہاں۔ناں میں جواب دو۔"

وہ گھما پھرا کر اسے اقرارِ محبت کے مقام پر لے آیا تھا۔اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔وہ ہنسنے لگا۔ہنستے ہنستے کہنے لگا۔"ہماری دنیا میں صرف آگ اور خون نہیں ہے۔پھول اور خوشبو بھی ہے۔زندگی صرف ماتم کرنا نہیں مسکرانا بھی جانتی ہے۔"

زندگی ہر سو ماتم کرتی وطن عزیز کے مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک تمام انسانی آبادیوں میں انسانیت کا دم توڑ رہی تھی۔اگرچہ ان دونوں کے احساسات اور جذبات کو نیا رنگ، نئی ترنگ مل رہی تھی۔تاہم آگے جا کر حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا، یہ کوئی نہیں جان سکتا تھا؟

☆☆☆

زینت اماں خوب بج سنور کر تھانے گئی تھی۔امید تھی کہ پولیس کی مدد سے سوتیلی بیٹی کے یار تک پہنچ سکے گی۔اسے گرفتار کرائے گی اور ماہانہ دس ہزار روپے کمانے والی بیٹی کو گھر واپس لے آئے گی۔مگر وہاں پہنچ کر الٹی مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔

تھانیدار نے اسے دو چار ہاتھ جما کر کہا۔"کتے کی بچی!ایس پی صاحب کے بھائی کے خلاف رپورٹ لکھوانے آئی ہے۔ہماری نوکری کھانا چاہتی ہے۔چل بھاگ یہاں سے....."

وہ مار کھا کر جھنجھلا گئی تھی۔تھانیدار کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی۔شوہر ہوتا تو اس کا کلیجہ نوچ لیتی۔اس نے قسم کھائی کہ گھر جا کر اریبہ کے باپ پر غصہ اتارے گی۔اس سوتیلی کی وجہ سے وہ ذلیل ہو رہی تھی۔

تھانے کے باہر اس کا نیا یار یار محمد کھڑا ہوا تھا۔اس نے پوچھا۔"کیا ہوا؟"

اس نے یار محمد کو نہیں بتایا کہ بڑی بے آبرو ہو کر تھانے سے نکلی ہے۔ناگواری سے

منہ بناتے ہوئے بولی۔"یہ تھانے والے اپنے باپ کے بھی نہیں ہوتے۔تھانیدار ایک ہزار مانگ رہا ہے۔کیا رقم لائے ہو؟"

اس نے فوراً ہی جیب سے ایک ہزار کا نوٹ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔"میری جان!تیرے لئے تو جان بھی حاضر ہے۔"

جان نے نوٹ کو اچھی طرح تہہ کر کے اپنے گریبان کی گہرائی میں غروب کرتے ہوئے کہا۔"تھانیدار کسی وقت گھر آ کر رقم لے گا۔پھر ہمارا کام کرے گا۔"

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔"اب تو میرے کام آ جا...کب تک ٹرخاتی رہے گی؟"

وہ ہاتھ چھڑا کر بولی۔"باؤلا ہوا ہے۔آنے جانے والے کیا سوچیں گے؟وہ بڈھا آدھی رات کو سو جائے گا۔میں دروازہ کھول دوں گی۔تُو آ جانا۔"

نچلے طبقے میں ایسے گناہ اور جرائم روز کا معمول بن چکے ہیں۔بیوی جوان اور میاں بوڑھا ہو یا جوان ہونے کے باوجود ہڈحرام ہو تو دو چار آشناؤں کے ذریعے گھر کا چولہا بھی گرم رکھا جاتا ہے اور اپنے ذاتی اخراجات بھی پورے کئے جاتے ہیں۔پھر بڑھاپا حاوی ہونے تک بیٹیاں جوان ہو کر سہارا بن جاتی ہیں۔

یہ شرمناک روزگار اس لئے عام ہو چکا ہے کہ کوئی محاسبہ کرنے والا نہیں ہے۔کسی کو فرصت نہیں ہے۔بے حسی اور بے غیرتی کہتی ہے، جسے جس طرح زندگی گزارنی ہے۔گزارتا رہے۔ہمارے باپ کا کیا جاتا ہے؟ہم تو اپنے دھندے سے لگے ہیں۔ہمیں کوئی پکڑنے والا نہیں ہے۔اندھیر نگری میں رہنے کا یہی فائدہ ہے۔کوئی کسی کے منہ کی کالک دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتا۔کوئی نہیں مانتا کہ ہم غلط ہو چکے ہیں۔

ان پر ایک کار کی ہیڈ لائٹس پڑنے لگیں۔دہشت گردی اور تخریب کاری کے باعث لوگ گھروں سے نہیں نکل رہے تھے۔سڑکیں اور گلیاں ویران تھیں۔ایک ٹیکسی ان کے قریب آ کر رک گئی۔ایک شخص اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔زینت نے اسے دیکھتے ہی پریشان ہو کر کہا۔"دلشاد!تُو.....؟"

دلشاد نے غصے سے کہا۔"سالی!میں تیرے گھر کے چکر لگا رہا ہوں۔اُدھر میرے کو دوڑا رہی ہے اور اِدھر اس یار کے ساتھ مستا رہی ہے۔"

وہ بولی۔ ''اس کا نام یار محمد ہے۔ مگر یہ میرا یار نہیں ہے۔ میں رپورٹ لکھوانے اس کے ساتھ تھانے آئی تھی۔''

دلشاد نے زور کا طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''اب میں الو نہیں بنوں گا۔ پچھلے تین مہینوں میں میرے سے دس ہزار روپے لے چکی ہے۔ میرے کو پہلے ہی شبہ تھا تُو صرف میری رکھیل نہیں ہے۔ اس نے تیرے گریبان میں ضرور کچھ ڈالا ہوگا؟''

وہ تھانے سے مار کھا کر آئی تھی۔ اس کا طمانچہ کھا کر جھنجلا گئی۔ پاؤں پٹختے ہوئے بولی۔ ''تُو میرا یار ہے۔ گھر والا نہیں ہے۔ اب مجھ پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ میں کہہ چکی ہوں یہ میرا یار نہیں ہے۔ منہ بولا بھائی ہے۔''

''تیرے کتنے بھیا ہیں؟ کتنے ہیں سیاں ہیں؟ ابھی معلوم ہو جائے گا۔''

اس نے لباس کے اندر سے چاقو نکال کر کھولتے ہوئے یار محمد سے پوچھا۔ ''اے! تُو نے اسے کتنی رقم دی ہے؟''

چاقو کھلتے ہی یار محمد ایکدم سے اچھل کر پلٹا اور وہاں سے بھاگتا چلا گیا۔ دلشاد نے ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ ''سالی! میرے جیسے مرد کو چھوڑ کر ایسے زنخے سے دل لگاتی ہے۔ چل میرے کو دکھا' اس نے کتنی رقم دی ہے؟''

اس نے آگے بڑھ کر اس کے گریبان میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے اور آگے بڑھ کر اسے دبوچتے ہوئے کہا۔ ''رقم نکال۔ تُو نے مجھے خوب لوٹا ہے۔ آج میں کڑکی میں ہوں۔''

وہ اس کے گریبان کے اندر ہاتھ لے جانا چاہتا تھا۔ وہ تڑپ رہی تھی۔ مچل رہی تھی۔ دلشاد نے طیش میں آ کر چاقو کا ایک وار کیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ اس نے دوسرا وار سینے پر کیا۔ گریبان کٹتا ہوا ذرا نیچے تک گیا۔ ہزار کا ایک نوٹ زمین پر گر پڑا۔ وہ اسے اٹھا کر بھاگنا چاہتا تھا۔ اسی وقت ٹیکسی اسٹارٹ ہو کر تیز رفتاری سے دور جانے لگی۔ وہ زمین پر سے نوٹ اٹھا کر دوڑتے ہوئے چیخنے لگا۔ ''ابے او..! رک جا... ابے!... کہاں چھوڑ کر جا رہا ہے؟ رک جا... ڈبل کرایہ دوں گا۔''

وہ دوڑتا اور چیختا ہوا آ رہا تھا۔ مگر ٹیکسی کی رفتار نے اسے بہت پیچھے چھوڑ

دیا تھا۔ ٹیکسی کا ڈرائیور ایک بوڑھا شخص تھا۔ وہ لاحول پڑھ کر زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔ ''یا خدا! یہ کیا ہو رہا ہے؟ اگر میں وہاں رُکتا تو وہ مجھے بھی ہلاک کر دیتا۔ مجھے کیوں ہلاک کرتا؟ اس عورت کو کیوں مار ڈالا؟ قتل و غارت گری کی وجوہات ہوتی بھی ہیں اور نہیں ہوتیں۔ بس یونہی شغل کے طور پر جگہ جگہ بندوں کو مارا جا رہا ہے۔ یہ کیسی نسل جوان ہوئی ہے؟ کسی کو چیونٹی کی طرح مسل دیتی ہے اور مزے لیتی ہے۔ ایسے لوگوں کی وحشت دیکھو تو لگتا ہے' وہ روحانی مسرتیں حاصل کر رہے ہیں۔''

اس نے بہت دور نکل آنے کے بعد ٹیکسی کی رفتار دھیمی کر دی۔ پورے شہر کی سڑکیں ویران ہو گئی تھیں۔ جگہ جگہ موت رقص کر رہی تھی۔ ان حالات میں اس جیسے کتنے ہی ضرورت مند ٹیکسی' رکشے چلا رہے تھے۔ سواری کے لئے بھٹکنے والوں کو ان کے گھر پہنچا رہے تھے اور روز کے حساب سے زوری بھی حاصل کر رہے تھے۔

ٹیکسی کی ڈکی میں ایک بھرا ہوا گیس کا سلنڈر رکھا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو گاڑی نہ چلتی۔ کئی گیس اسٹیشنوں اور پیٹرول پمپوں کو آگ لگا دی گئی تھی۔ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ حالات کب معمول پر آئیں گے؟ کب گاڑیاں چلیں گی اور لوگ کب اپنے دفتروں اور کارخانوں میں جانے کے لئے گھروں سے نکل سکیں گے؟ شہر کے لاکھوں افراد کو بے دست و پا اور بے گھر بنا دیا گیا تھا۔ حکومت سے اور انتظامیہ سے نہ کوئی سوال کر سکتا تھا' نہ ہی ان کا کچھ بگاڑ سکتا تھا۔

ایک جلے ہوئے پیٹرول پمپ کے سامنے چار افراد ایک گاڑی کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنی داڑھیوں اور صاف ستھرے لباس سے مولوی لگ رہے تھے۔ انہوں نے ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے قریب آ کر گاڑی روک دی۔ ایک نے کھڑکی کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ''اسلام علیکم....!''

بوڑھے ڈرائیور نے کہا۔ ''وعلیکم اسلام۔ کیا آپ کی گاڑی کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟''

اس نے کہا۔ ''پیٹرول کی ٹنکی لیک کر رہی تھی۔ ہمیں پتہ ہی نہ چلا۔ شاید آگے بھی پیٹرول نہ ملے۔ آپ ہمارے ایک بندے کو لے جائیں۔ ہم بعد میں اپنی گاڑی لے

آئیں گے۔"

اس نے ایک جوان کی طرف اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے کہا۔ "آ جائیں۔ میں لے چلتا ہوں۔"

اس نوجوان نے پچھلی سیٹ پر آ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ....."

بوڑھے نے بھی بڑے جذبے سے سلام کا جواب دیا۔ پھر ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ اچانک اس ٹیکسی کا ماحول ایمان افروز ہو گیا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا جوان بڑی ہی کیف آور خوش نوائی سے کلام پاک کی ایک آیت پڑھنے لگا۔ بوڑھے کو یوں لگا' جیسے یکا یک آگ و خون کے جہنم سے نکل کر ٹھنڈی آرام دہ جنت میں پہنچ گیا ہے۔

اس نے پانچ منٹ تک تلاوت کی۔ پھر بوڑھے کی طرف جھک کر اس کی طرف پھونک مار کر کہا۔ "اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہے۔"

وہ بولا۔ "سبحان اللہ... تم نے تلاوت کی میرے اندر نور پھیل گیا ہے۔ حالات نے مجھے بہت پریشان کر دیا تھا۔ تم نے ایمان کی قوت سے سکون پہنچایا ہے۔"

اس نے کہا۔ "ہم صرف ایمان کی قوت سے کفر کی شیطانی قوتوں کو مٹا کر اسلام کا بول بالا کر سکتے ہیں۔"

"شاباش بیٹے! اتنی سی عمر میں ایسا ایمان ایسا دینی جذبہ رکھتے ہو۔ کاش میرا بیٹا بھی تمہارے جیسا ہوتا۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام حماد اصغر ہے۔ ویسے تو میں نے صرف دس جماعتیں پڑھی ہیں۔ مگر پچھلے ایک برس میں اس قدر دینی تعلیم حاصل کی ہے کہ میرا ذہن روشن ہو گیا ہے۔ میں سمجھ گیا ہوں' دنیا میں امن وامان کس طرح قائم ہو گا اور تمام مسلمانوں کی پریشانیاں کس طرح دور ہوں گی؟"

"ماشا اللہ۔ تم سے خوب باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ ویسے تمہیں جانا کہاں ہے؟"

"سائیٹ کے علاقے میں ایک بہت بڑی کیمیکل فیکٹری ہے۔ وہاں

پہنچا دیں۔"

"میں تھوڑی دیر پہلے ہی ادھر سے آیا ہوں۔ بڑی توڑ پھوڑ اور فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں تمہیں دوسرے راستے سے لے چلوں گا۔ ذرا دیر لگے گی مگر خیریت سے وہاں پہنچا دوں گا۔"

اس نے ٹیکسی کو دوسرے راستے پر موڑتے ہوئے کہا۔ "میں بہت پریشان ہوں۔ میری ایک جوان بیٹی اور بیٹا ہے۔ وہ نشے کا عادی ہے۔ پتہ نہیں کہاں نشہ کرتا پھرتا ہے؟ گھر نہیں آتا۔ مجھے بیٹی کی فکر ہے۔ اسے سہاگن بنانے کے لئے راتوں کو بھی ٹیکسی چلاتا ہوں۔"

وہ بولا۔ "پریشانیاں تب تک رہتی ہیں' جب تک ہم زندہ رہتے ہیں۔ موت آئے گی تو آپ ایک کے بعد دوسری سانس نہیں لے سکیں گے۔ نہ بیٹی کی فکر کر سکیں گے۔ اسے اللہ کے حوالے کرنا ہی ہوگا۔ آپ' میں... ہم سب ہی بے بس ہیں۔"

"تم درست کہتے ہو۔ مگر جب تک زندہ ہوں' بیٹی کی فکر کھاتی رہے گی۔"

"فکر تھوڑی دیر کی ہے۔ اس کے بعد آپ تمام فکر و پریشانیوں سے نجات حاصل کر لیں گے۔"

"آمین...! خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔"

"آج کا دن ہمارے لئے مبارک ہے۔ ہمارے معلم اعلیٰ ہدایت اللہ خان نے مجھے جنت کی بشارت دی ہے۔ میں آپ کو جنت کی بشارت دے رہا ہوں۔ ایمان محکم رکھیں۔ جنت کی حوریں ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔"

یہ بات سنتے ہی وہ بوڑھا ذرا کھٹک گیا۔ اس نے پوچھا۔ "بیٹے! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں کچھ سمجھا نہیں...؟"

حماد کے گلے میں ایک ڈور بندھی ہوئی تھی۔ اس ڈور سے ایک شناختی کارڈ منسلک تھا۔ اس نے کہا۔ "ادھر دیکھیں.....!"

اس نے رفتار ذرا دھیمی کر کے سر گھما کر اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ "یہ میرا شناختی کارڈ نہیں ہے۔ یہ عاقبت میں میری شناخت کے لئے ہے۔ یہ جنت کا سرٹیفکیٹ ہے۔ ہم کیمیکل

فیکٹری میں پہنچتے ہی اوپر جنت میں پہنچ جائیں گے۔''

بوڑھے نے ایک زوردار بریک لگاتے ہوئے ٹیکسی روک دی۔ پلٹ کر کہا۔''بیٹے! ابھی تو تم بڑی ذہانت سے دین اسلام کی باتیں کر رہے تھے۔ اب یہ بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہے ہو؟''

وہ بولا۔''میں قیامت تک دین اسلام کی بقاء کی صرف باتیں ہی کرنا چاہتا۔ اس پر عمل بھی کرنے والا ہوں۔ یہ دیکھیں.....!''

اس نے سفید اجلی قمیض کا دامن پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ بوڑھے کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ حماد نے لباس کے اندر خودکش جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اوپر گلے میں جنت کا سرٹیفکیٹ لٹک رہا تھا۔ چشم زدن میں یقین ہو گیا کہ اگلے کسی بھی لمحے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

وہ بولا۔''خدا آپ کو حوصلہ دے۔ آپ شور نہیں مچائیں گے۔ کسی کو یہ نہیں بتائیں گے کہ ہم جنت کے راہی ہیں۔''

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔''میرے بچے! تمہیں کس نے یہ الٹی بات سمجھائی ہے کہ حرام موت مرو گے تو جنت میں جاؤ گے؟ ہمارے دین میں خودکشی حرام ہے۔''

وہ بڑے اعتماد سے بولا۔''دین کی خاطر جان پر کھیل جانا جہاد ہے۔ آپ اسے حرام موت نہ کہیں۔''

''تم ایک کیمیکل فیکٹری کو تباہ کرنے جا رہے ہو۔ یہ جہاد نہیں... تخریب کاری ہے۔''

وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا ''یہ جہاد ہے۔ ہم کافروں کی غلامی کرنے والے حکمرانوں کو، پولیس والوں اور فوجیوں کو فنا کر رہے ہیں۔ جب یہ سارے شیطان مر جائیں گے تو صرف ایمان والے رہ جائیں گے۔''

''مگر تم تو ایک فیکٹری کو تباہ کرنے جا رہے ہو؟''

''فیکٹریوں اور ملوں کے دولتمند مالکان عیاش اور گناہ گار ہیں۔ ہم بے غیرتی، بے حیائی اور گناہ کے تمام راستوں کو روکیں گے۔ ہماری شہادت کے بعد اسلامی نظام قائم ہوگا تو ہماری قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ اللہ ہم سے راضی رہے گا۔''

وہ بے بسی سے بولا۔''اسلامی نظام اس طرح قائم نہیں ہوگا... بیٹے! ذرا عقل

سے سوچو۔''

وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔''آپ جو کہنا چاہتے ہیں، کہتے رہیں مگر گاڑی چلاتے رہیں۔ ہمیں ہر حال میں کیمیکل فیکٹری کے اندر پہنچنا ہے۔''

وہ بڑی پریشانی سے اور بے بسی سے اس قیامت برپا کرنے والی جیکٹ کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اسے کس طرح حرام موت سے باز رکھا جا سکتا ہے؟

حماد کا ایک ہاتھ جیکٹ کے نچلے حصے پر تھا۔ اس نے کہا۔''میرا یہ ہاتھ لباس کے اندر اس پن سے لگا رہے گا۔ آپ مجھے جنت کے دروازے تک نہیں پہنچائیں گے تو چشم زدن میں یہ پن اپنی جگہ سے ہٹ جائے گی۔ اس کے بعد ہم پوری طرح دھماکہ بھی نہیں سن پائیں گے اور خدا کی خوشنودی پالیں گے۔''

اس نے دامن گرا دیا۔ وہ جیکٹ چھپ گئی۔ اس کا ایک ہاتھ قمیص کے اندر تھا۔ وہ سر پھرا کسی بھی لمحے موت کا مزہ چکھ سکتا تھا اور چکھا سکتا تھا۔ بوڑھا گھوم کر سیدھا بیٹھ گیا۔ بڑے ہی مردہ دل سے ٹیکسی کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھانے لگا۔

دنیا کی ہر چیز پر بندے کا اختیار ہے۔ وہ کسی بھی چیز کو آگے پیچھے لے جا سکتا ہے۔ لیکن اس زندگی کو نہ پیچھے لے جا سکتا ہے، نہ موت کے سائے میں اسے آگے بڑھا سکتا ہے۔ اس بوڑھے نے اچھی خاصی زندگی گزار لی تھی۔ اب رخصتی کا وقت آ گیا تھا اور یہ وقت ایک نوجوان لے آیا تھا۔

وہ بولا۔''بزرگوار! مجھے دیکھیں... میں اکیس برس کا ہوں۔ میری عمر کے جوان ایک طویل عمر تک اس دنیا کے مزے لوٹنا چاہتے ہیں۔ لیکن میرا دلی جذبہ دیکھیں میں جہاد کرتے ہوئے شہادت کا درجہ پانا چاہتا ہوں۔ آپ تو اپنی عمر پوری کر چکے ہیں۔ آپ کو مرنے کا غم نہیں ہونا چاہیے۔''

''بیٹے! مجھے غم نہیں ہے۔ جوان بیٹی کی فکر ہے۔ اس کا گھر بسائے بغیر اس دنیا سے جانا نہیں چاہتا۔ بیٹا بے غیرت ہے۔ میرے بعد اس معصوم کو بازاری بنا دے گا۔ یا خدا! میری بچی کا کیا بنے گا؟''

''اسے خدا پر چھوڑ دیں۔ وہی پیدا کرتا ہے۔ وہی مقدر بناتا ہے۔ آپ نہیں

جانتے' اس نے بیٹی کی کیسی تقدیر لکھی ہے؟ اگر نیک مقصد کے لئے میرے ساتھ فنا ہو جائیں گے تو خدا آپ سے راضی رہے گا۔ آپ کی بیٹی کو ایک اچھی زندگی انعام میں ملے گی۔''

''شاید تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو ان کی محبتیں تمہیں اپنی طرف کھینچ لیتیں۔''

وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔ ''میں ماں باپ کے بغیر پیدا نہیں ہوا۔ وہ موجود ہیں۔ بہن اور بھائی بھی ہیں۔ سب اپنے اپنے نظریات اور خیالات کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں۔ میں ان کے درمیان ناکارہ تھا۔ دس جماعتوں سے آگے نہ پڑھ سکا۔ ان کی طرح بہتر زندگی گزارنے کے لئے کوئی ڈھنگ کا کام نہ کر سکا۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''میں نے اچھی ملازمت کرنے اور اچھا کمانے کے لئے مختلف کوششیں کیں۔ مگر دس جماعت پڑھنے والے کو افسری نہیں مل سکتی تھی۔ چپڑاسی اور سیلز مین جیسی ملازمتیں ملتی رہیں۔ میں اپنے باپ اور بھائیوں کی طرح اعلیٰ سماجی مقام حاصل نہ کر سکا۔''

بوڑھے ڈرائیور نے کہا۔ ''کچھ بھی ہو' خون کے رشتے بالکل ہی کمزور نہیں ہوتے۔ کوئی ایک نہ پوچھے تو دوسرا پوچھتا ہے۔''

وہ خلا میں تکنے لگا۔ پھر جیسے دور کہیں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اریبہ...! تم میرے سامنے ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ جہاد کے اس مرحلے پر بھی میں تمہیں بھلا نہیں پا رہا ہوں۔''

بوڑھے نے ایک ذرا گھوم کر اسے دیکھا۔ پھر ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ... اریبہ کون ہے؟''

وہ خلا میں تک رہا تھا۔ اس کی من موہنی سی صورت کا ایک ایک نقش واضح ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ ''بولو... میں کون ہوں؟''

وہ بوڑھے ڈرائیور کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ میری جان ہے۔ میری زندگی ہے۔ رشتے میں چچا کی بیٹی ہے۔ ہم ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔''

وہ بتانے لگا کہ آشیانہ کے نام سے ایک تین منزلہ مکان تھا۔ جس کے مالکان تین بھائی تھے۔ بڑا بھائی امان اللہ اوپری منزل میں رہتا تھا۔ اس کی بیٹی اریبہ تھی۔ دوسرے

بھائی عنایت اللہ کا بیٹا وہ حماد تھا۔ جو خودکش جیکٹ پہنے پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

تیسرے بھائی بشارت نے شادی نہیں کی تھی۔ وہ گراؤنڈ فلور پر رہتا تھا۔ اس نے لب سڑک ایک دکان کھولی تھی اور آتش بازی کا سامان فروخت کرتا تھا۔ ایک بڑے سے کمرے میں پٹاخے' پھلجھڑیاں' انار ہوائی اور دیسی ساخت کے زبردست دھماکا کرنے والے بم بنا کر رکھے جاتے تھے۔

رہائشی علاقوں میں ایسی آتش گیر چیزیں نہیں رکھی جاتیں۔ جبکہ بشارت نے گندھک' پٹاس' شورئہ اور کوئلے کے سفوف کو ذخیرہ کر رکھا تھا۔ وہاں کسی دن بھی اتفاقاً آگ لگ سکتی تھی۔ قیامت خیز دھماکوں کے باعث محلے کے کئی مکانات متاثر ہو سکتے تھے اور رہائشیوں کو شدید جانی و مالی نقصان پہنچ سکتا تھا۔

اکثر ایسی دکانوں اور کارخانوں میں آگ لگتی رہتی ہے۔ دھماکے ہوتے رہتے ہیں۔ پٹاخے بیچنے والوں کو گرفتار بھی کیا جاتا ہے۔ مگر ان کے خلاف بھرپور کارروائی نہیں کی جاتی۔ اگر ایسا ہونے لگے تو خوشی کی تقریبات میں اور غیر ملکی مہمانوں کی آمد پر آتش بازی کا رنگا رنگ تماشہ نہیں ہو سکے گا۔ اس ملک کے لوگ تماشہ کرنے کے لئے موت کے سامان کو کبھی سجا کر کبھی چھپا کر رکھتے ہیں۔

حماد اپنے پیار کی روداد سنا رہا تھا۔ ''اریبہ مجھ سے تین برس بڑی ہے۔ ہم بچپن سے ساتھ ہنستے کھیلتے رہے۔ میں اس سے متاثر ہوتا رہا۔ وہ اپنا بڑا پن جتاتی تھی۔ میری کسی غلطی پر ڈانٹنے لگتی تھی۔ پھر جب مناتی تھی تو میں اس سے لپٹ جاتا تھا۔''

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ''پتہ ہی نہ چلا' بچپن کیسے گزر گیا اور جوانی اچانک کیسے آگئی؟ ایک دن میں کسی بات پر اس سے لپٹ گیا تو وہ ایکدم سے تڑپ کر الگ ہوتے ہوئے بولی کہ اب تم بچے نہیں رہے۔ مجھ سے فاصلہ رکھا کرو۔''

میں نے کہا۔ ''کیوں فاصلہ رکھوں؟ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ میں تم سے شادی کروں گا۔''

وہ گھور کر بولی۔ ''کیا دماغ چل گیا ہے؟ میں تم سے بڑی ہوں۔''

''میں نے اس کی بات نہیں مانی۔ اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ مگر وہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر چلی گئی۔''

بوڑھے ڈرائیور نے کہا۔ ”تم ہمیشہ الٹے کام کرتے ہو۔ تمہیں جینا چاہئے مگر تم وقت سے پہلے جنت میں جانے کے لئے مرنا چاہتے ہو۔ تمہیں کسی کم عمر لڑکی سے محبت کرنا چاہئے۔ مگر تم بڑی عمر والی کے پیچھے پڑ گئے۔“

”میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ پتہ نہیں اس میں کیسی کشش تھی؟ وہ سامنے نہ ہوتی تب بھی دل اس کی جانب کھنچا چلا جاتا تھا۔ میں نے اسے اریمہ کہہ کر مخاطب کیا تو اس نے اعتراض کیا کہ تم مجھے باجی کہا کرتے ہو۔ میرا نام نہ لو۔

میں اسے باجی نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ میرے دل و دماغ میں ایک معشوقہ بن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے منہ پر تو کچھ نہ کہا۔ مگر بعد میں کئی صفحات کا ایک خط اسے لکھا۔

میری جان...! اریمہ! میں تمہارے بغیر جی نہیں سکوں گا۔ پلیز۔ میری عمر کا حساب نہ کرو۔ میرے دلی جذبات کو اور اس دیوانگی کو سمجھو جو صرف تمہارے لئے ہے۔ جب تم میرے ساتھ کھڑی ہوتی ہو تو میرے کاندھے تک آتی ہو۔ میری صحت مندی کے آگے دھان پان سی بچی لگتی ہو۔ میں کلائی پکڑ لوں تو چھڑا نہیں سکو گی۔

اور مجھے یہ بات چھپانا نہیں چاہئے کہ میں نے کئی بار تمہیں تصور میں پکڑ لیا ہے، جکڑ لیا ہے اور تم کسمسا کر ہار مان گئی ہو۔ مرد کی عمر نہیں دیکھی جاتی۔ اس کی مردانگی دیکھی جاتی ہے۔ ایک بار میری آغوش میں آجاؤ پھر ساری دنیا کو بھول جاؤ گی۔

میں نے خط میں اور بھی بہت کچھ لکھا تھا۔ اسے پڑھنے کے بعد وہ مجھ سے کترانے لگی۔ پھر پتہ چلا کہ میرے والدین اریمہ کو مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ میرے بڑے بھائی جواد سے اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اریمہ نے اس رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ جواد الٹے سیدھے دھندوں میں ملوث رہتا تھا۔ وہ اسے پسند نہیں کرتی تھی۔

میں نے اسے سمجھایا منایا کہ مجھ سے شادی کر لو۔ مگر وہ راضی نہیں ہوئی۔ اس نے کہا، میں تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ تم مجھے بچپن سے ہی اچھے لگتے ہو۔ میرے چھوٹے بھائی جیسے ہو۔ میں تمہیں بڑی بہن کی طرح چاہتی ہوں۔ میری چاہت میں تمہارے لئے ایک طرح کی ممتا ہے۔

تب... میں نے اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کیا...

آہ...! میں نے اس کی باچھوں سے لہو کے چند قطرے رستے دیکھے۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ میں ایکدم سے پلٹ کر بھاگتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے، کتنی دیر تک دوڑتا رہا؟ کبھی تیز چلتا رہا اور کہاں کہاں بھٹکتا رہا؟ میں نے اپنی محبت کو زخمی کیا تھا۔ اس سے نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔ اس لئے واپس نہیں گیا۔

اس رات اپنے ایک دوست مجیب الرحمٰن کے پاس چلا گیا۔ وہ ایک مکان میں تنہا رہتا تھا۔ پانچوں وقت کا نمازی تھا۔ جوانی میں پکا مولوی بن گیا تھا۔ اس نے بچپن سے دینی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ مگر نہ جانے کیسے صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو گیا تھا۔ اس نے میری روداد سننے کے بعد پوچھا۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟“

میں نے کہا۔ ”کم از کم گھر نہیں جاؤں گا۔ اگر جاؤں گا تو اریمہ کی محبت نہ پا کر اسے مار ڈالوں گا پھر اپنی جان دے دوں گا۔“

وہ بولا۔ ”ہمارے معلم کہتے ہیں، جو چیز ہمیں نہیں ملتی، ہم اسے توڑ پھوڑ دیتے ہیں اور خود بھی ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں۔ دنیا کی محبتیں کچھ نہیں دیتیں۔ اپنے معبود کو راضی کرو۔ تمہیں دنیا اور آخرت میں سکون ہی سکون، راحت ہی راحت ملے گی۔“

”میں سکون اور اطمینان قلب چاہتا ہوں۔ وہ مجھے نہیں چاہتی۔ میں اسے اپنے دل و دماغ سے نوچ کر پھینک دینا چاہتا ہوں۔ اگر وہ میرے اندر سے نہیں نکلے گی تو میں مر جاؤں گا۔“

وہ دوسرے دن مجھے ایک معلم اعلیٰ کے پاس لے گیا۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو میری نظریں جھک گئیں۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سا سحر تھا۔ عجیب سی طلسمی آواز تھی۔ وہ بولنے لگے تو میں متاثر ہوتا چلا گیا۔

انہوں نے سمجھایا۔ ”انسانوں کی محبت میں خدا کو نہ بھولو۔ دنیا والوں سے رشتہ صرف سانسیں لینے تک ہے۔ موت کے بعد کوئی رشتہ نہیں رہتا۔ صرف خدا سے تعلق رہ جاتا ہے۔“

انہوں نے کہا۔ ”تم کافروں کو مٹاتے ہوئے شہید ہو جاؤ گے تو خدا تم سے راضی ہوگا۔ تمہارے لئے جنت کے دروازے کھل جائیں گے۔ تم دنیا میں جو نہ پا سکے، اسے جنت میں حاصل کر لو گے۔“

میں نے بے اختیار پوچھا۔ ''کیا وہاں مجھے اریمہ ملے گی؟''

''جو چاہو گے' پاؤ گے۔ جنت وہ جگہ ہے' جہاں محرومیاں ختم ہو جاتی ہیں اور تمام مرادیں پوری ہوتی رہتی ہیں۔''

''پھر تو میں آج ہی جنت میں جانا چاہوں گا۔''

''کفر کو نابود کرنے کے لئے جہاد کرو گے' بے غیرت اور بے حیا سرمایہ داروں کو جہنم میں پہنچاؤ گے۔ تب تمہیں جنت ملے گی۔ اس ملک کے فوجی اور حکمران کافروں کے غلام بن گئے ہیں۔ اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے انہیں مٹاؤ گے تو تمہیں جان پر کھیل جانے سے پہلے ہی جنت میں جانے کی رسید مل جائے گی۔''

بوڑھے ڈرائیور نے کہا۔ ''ہمارے دین میں برائی کے خلاف جہاد کا حکم ہے۔ لیکن کسی کی جان سے کھیلنے اور املاک کو تباہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ نیم مُلا ایمان کے لئے اور تمہارے جیسے نادان کے لئے خطرہ بن گئے ہیں۔ ایسے ہی کسی بہروپئے عالم نے تمہیں حرام موت مرنے کے راستے پر لگا دیا ہے۔''

''کچھ بھی کہہ لیں۔ مگر آپ خوش نصیب ہیں۔ میرے ساتھ سیدھے جنت میں جانے والے ہیں۔''

بوڑھے نے اسے عقب نما آئینے میں بڑی بے بسی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''خدا تم پر اور نیم مُلاؤں پر رحم کرے۔ تمہیں عقلِ سلیم عطا کرے۔ ان آخری لمحات میں سہی دینی تعلیمات کو سمجھو بیٹا! تم اب بھی زندگی کی طرف لوٹ سکتے ہو۔''

حماد نے کھڑکی کے باہر چونک کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے باتوں میں لگا کر کلفٹن کی طرف لے جا رہے ہو۔ مجھے دھوکا دے کر میرے ٹارگٹ سے دور کر رہے ہو۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کیا تم نے راستے میں نہیں دیکھا' ایک جگہ دو گاڑیاں جل رہی تھیں۔ میں وہاں سے مڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ ایک اور موڑ پر دکانوں کے تالے توڑے جا رہے تھے اور فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں نے گارڈن کی طرف سے جانا چاہا تو ادھر پیٹرول پمپ کو آگ لگائی جا رہی تھی۔''

وہ غصے سے بولا۔ ''زیادہ نہ بولو۔ یہاں سے واپس چلو۔ اب میں دھیان رکھوں

گا۔ تمہیں بتاتا رہوں گا کہ کن راستوں سے گزرنا ہے۔''

اس نے واپسی کے لئے ٹیکسی کو یوٹرن دیا۔ پھر ذرا دور جانے کے بعد اسے سڑک کے کنارے روک دیا۔ حماد نے پوچھا۔ ''اب کیا ہوا؟''

اس نے کہا۔ ''گیس ختم ہو گئی ہے۔ دوسرا اسلنڈر لگانا ہو گا۔ کیا میں گاڑی سے باہر جا سکتا ہوں؟''

وہ اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ چالاک بننے کی حماقت نہ کرنا۔ یہ دیکھو...! میرا ایک ہاتھ قمیص کے اندر بلاسٹنگ پن پر ہے۔ میں تمہیں یہیں لے مروں گا۔''

وہ دونوں باہر آ گئے۔ بوڑھا ڈرائیور جان بوجھ کر دیر کر رہا تھا' دعائیں مانگ رہا تھا کہ کسی طرح موت ٹل جائے۔ ویسے جب وقت پورا ہو جاتا ہے تو زندگی کی آس لگائے رکھنے والوں کو مایوس ہونا پڑتا ہے۔ ایسے وقت انسانی ذہانت ہار جاتی ہے۔ موت کو ٹالنے والی کوئی تدبیر کام نہیں آتی۔

☆☆☆

وہ تین منزلہ مکان آشیانہ رات کی تاریکی میں کہیں کہیں سے جھلک رہا تھا۔ لوڈ شیڈنگ کے باعث محلے کے دوسرے مکانات بھی تاریکی میں چھپے ہوئے تھے۔ ایسے وقت پولیس موبائل وہاں آ کر رکی۔ ایک سپاہی نے گاڑی سے اتر کر دروازے کو پیٹنا شروع کیا۔ اندر سے پوچھا گیا۔ ''کون ہے؟''

بڑے رعب سے گرجتے ہوئے کہا گیا۔ ''پولیس ہے۔ دروازہ کھولو....''

اس تین منزلہ مکان کے مالکان تین بھائی تھے۔ تیسرا بھائی بشارت نچلے حصے میں رہتا تھا۔ وہاں ایک بڑے سے کمرے میں آتش بازی کا سامان ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ پولیس والے کبھی کبھی اس بارود کے ذخیرے پر اعتراض کرنے آتے تھے۔ پھر سو دو سو جیب میں ڈال کر چلے جاتے تھے۔

بشارت نے دروازہ کھول کر باہر آتے ہوئے حوالدار کو سلام کیا۔ پھر کہا۔ ''جناب عالی! میں نے تو کل ہی ادائیگی کی ہے۔''

حوالدار نے کہا۔"ہم کچھ لینے نہیں ایک بری خبر سنانے آئے ہیں۔تمہارے گھر میں جو زینت امان رہتی تھی۔اسے قتل کر دیا گیا ہے۔"

بشارت نے پریشان ہو کر پوچھا۔"کس نے قتل کیا ہے؟"

"یہی تو معلوم کرنا ہے۔ہم گشت کرنے نکلے تھے۔تھانے سے ذرا دور سڑک کے کنارے اس کی لاش دکھائی دی۔وہ کچھ دیر پہلے وہاں اغوا کی رپورٹ لکھوانے آئی تھی۔اس کے خاوند کو بلاؤ اور تم سب تھانے میں آؤ۔لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال لے جانا ہے۔"

وہ لوگ واپس چلے گئے۔بشارت نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پہلی اور دوسری منزل پر آکر بھائیوں کو زینت کے متعلق بتایا۔اس کے شوہر یعنی اریمہ کے باپ امان اللہ نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔دل ہی دل میں کہا۔"خس کم جہاں پاک...میری بیٹی کے سر سے بلاٹل گئی ہے۔"

اس کے برعکس دوسرے بھائی عنایت اللہ کو یعنی حماد کے باپ کو دکھ پہنچا تھا۔مقتولہ زینت سے اس کے خفیہ شرمناک تعلقات تھے۔انہوں نے سوچا تھا' اریمہ کا باپ بوڑھا ہے۔دائمی مریض ہے۔اس کی موت کے بعد عنایت اللہ زینت سے شادی کرے گا تو اس مکان کے اوپری حصے کا بھی مالک بن جائے گا۔

یہ بات بھی ذہن میں تھی کہ بڑے بھائی امان اللہ نے مرنے میں دیر کی تو اسے کسی بھی ہتھکنڈے سے اوپر پہنچا دیا جائے گا۔ادھر عنایت کی بیوی یعنی حماد کی ماں نے دل ہی دل میں کہا۔"خدا کا شکر ہے زینت مر گئی۔نہیں تو میاں صاحب اس مکان پر قبضہ جمانے کے لئے اسے میری سوکن بنا دیتے۔"

امان اللہ اپنے مکان کا وہ اوپری حصہ اریمہ کے نام کرنا چاہتا تھا اور زینت اسے ایسا کرنے سے روکتی رہی تھی۔مگر اب وہ روکنے ٹوکنے والی حرام موت مر چکی تھی۔

عنایت اللہ کی بیوی نے کہا۔"اب تو زینت مٹی میں مل جائے گی۔اس کے ذریعے اوپری حصے پر قبضہ جمانے کا خواب بھی مٹی میں مل گیا ہے۔سیدھا سا راستہ یہی ہے کہ اریمہ کو کسی طرح اپنی بہو بنا لیا جائے۔"

جو چیز سیدھی طرح حاصل نہیں ہوتی' اسے ٹیڑھے راستے سے یا مجرمانہ ہتھکنڈوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔پہلے یہ منصوبہ تھا کہ امان اللہ کسی طرح مر جائے اور زینت کو بیوی بنا کر اس کے شوہر کا حصہ حاصل کیا جائے۔آئندہ مجرمانہ سوچ یہ تھی کہ اریمہ بہو بننے پر راضی نہ ہوئی تو اسے ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔یوں اس کی موت کے بعد بڑے بھائی کا حصہ باقی دونوں بھائیوں میں تقسیم ہو جائے گا۔

ایک مکان ہو یا ملک ہو۔اس پر قبضہ جمانے اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی کمینگی سے گزرنا پڑتا ہے۔اُدھر تیسرے بھائی بشارت نے اپنے بھائی عنایت اللہ کی بیوی کو یعنی اپنی بھابھی کو شیشے میں اتارا تھا۔یہ پلاننگ کی تھی کہ عنایت اللہ کو اوپر پہنچایا جائے پھر بھابھی بیوہ ہو گی تو وہ دیور اس سے شادی کرے گا۔اس طرح اوپر سے نیچے تک وہ پورا مکان بشارت کی ملکیت بن جائے گا۔

اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے کہ لوگ بے حس' بے غیرت اور خود غرض کیوں ہو گئے ہیں؟

دہشت گردی' خودکش حملے' اندھا دھند فائرنگ اور بم دھماکے اس لئے ہوتے ہیں کہ لوگ دوسروں کی فنا سے اپنی بقا کا سامان کرتے ہیں۔ایسے لوگوں کو یقین ہوتا ہے کہ وہ نہیں مریں گے۔وہ تو دوسروں کی زندگی سے کھیلنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

آشیانہ کی نچلی منزل میں بارود کا ذخیرہ تھا۔وہاں تینوں بھائی جانے انجانے میں اپنی اپنی موت کا سامان کر چکے تھے۔کسی بھی دن' کسی بھی وقت اس ذخیرے میں آگ لگ سکتی تھی۔ابھی وہ ایک دوسرے کے قدموں تلے بارود بچھانے کی سازشوں میں مصروف تھے۔

کھلی آنکھوں سے دیکھنے اور کھلے ذہن سے سمجھنے کی بات ہے کہ پوری قوم بارود کے ذخیرے پر دن گزار رہی ہے۔جہاں یہ پھٹ پڑتا ہے۔وہاں زندگی کے چیتھڑے اڑا دیتا ہے۔جہاں آئندہ پھٹنے والا ہے۔وہاں یہ جھوٹی تسلیاں اور بہلاوے ہیں کہ ہماری طرف کچھ نہیں ہو گا۔

امان اللہ نے اپنی بیٹی سے رابطہ کرنے کے لئے نمبر پنچ کئے۔دوسری طرف سجاد نے اپنے فون پر نمبر پڑھتے ہوئے اریمہ سے کہا۔"تمہاری سوتیلی ماں پھر کال کر رہی ہے۔"

وہ بولی۔ ''پلیز۔ آپ بات نہ کریں۔ فون مجھے دیں۔''

اس نے فون لے کر کان سے لگایا پھر کہا۔ ''ہیلو... امی....!''

باپ کی آواز سنائی دی۔ ''وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ کسی نے اسے قتل کر دیا ہے۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''یہ کیسے ہو گیا ابو....؟''

''پتہ نہیں کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ کس نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا؟ میں اپنے بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں ہوں۔ تمہارے دونوں چچا پولیس کی کارروائیوں سے نمٹ کر اس کی آخری رسومات ادا کریں گے۔''

وہ جیسے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''مرنے والی کے اعمال اس کے ساتھ گئے۔ میں مطمئن ہوں کہ تمہارے سر سے ایک بدترین بلا ٹل گئی ہے۔''

''ہاں۔ اس کے اعمال اس کے ساتھ گئے۔ مگر اب آپ اس سے نفرت نہ کریں۔ اس کے خلاف کچھ نہ بولیں۔''

''اچھی بات ہے۔ کچھ نہیں بولوں گا۔ تم بتاؤ کہاں ہو؟ میں چاہتا ہوں' جس مہربان کے ساتھ ہو۔ اس کی فیملی میں جا کر رات گزار لو۔ صبح حالات موافق ہوں گے تو چلی آنا۔''

''میں بھی یہی چاہتی تھی۔ ابھی سجاد صاحب کے ساتھ ان کی فیملی میں جانے والی تھی۔ مگر اب نہیں جاؤں گی۔ ہمارے گھر میں اتنا بڑا سانحہ ہو چکا ہے۔ میں جلدی گھر پہنچنے کی کوشش کروں گی۔ آپ اپنا خیال رکھیں۔ میں آ رہی ہوں۔''

اس نے فون بند کر کے سجاد سے کہا۔ ''زینت بیگم کا مرڈر ہو گیا ہے۔''

وہ ذرا چپ رہا۔ پھر بولا۔ ''ابھی چند گھنٹے پہلے وہ فون پر چیخ رہی تھی۔ مجھے باتیں سنا رہی تھی۔ نہ وہ جانتی تھی' نہ ہم یہ سوچ سکتے تھے کہ اسے ہمیشہ کے لئے چپ لگ جائے گی۔ یہ زندگی کیا ہے؟ کچھ بتائے بغیر اچانک ہی ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ بڑی بے وفا ہے۔''

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ''بعض لوگوں کی موت پر سمجھ میں نہیں آتا' ان کے لئے دعائے مغفرت کی جائے تو کیسے؟ وہ دعاؤں کے قابل نہیں ہوتے اور ہمارا ظرف کہتا ہے انہیں بددعا نہ دی جائے۔''

اریبہ نے کہا۔ ''پلیز۔ مجھے کسی طرح گھر پہنچا دیں۔''

وہ دونوں تقریباً دو گھنٹے سے اس ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد کولڈ ڈرنک پی تھی۔ اس کے بعد چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے تھے۔ انہیں ایک دوسرے کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے گہری شناسائی اور اپنائیت محسوس کر رہے تھے۔

سجاد نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں' تمہیں اپنی مام اور ڈیڈ سے ملاؤں۔ اس بہانے کل تک تمہارا ساتھ رہے گا۔''

وہ بولی۔ ''ہم آج کے بعد بھی ملتے رہیں گے۔ ابو وہاں تنہا ہیں۔ مجھے جانا چاہئے۔''

''بے شک۔ راستے میں رکاوٹ نہ رہی تو میں تمہیں گھر کے دروازے تک پہنچاؤں گا۔''

''ہمیں یہاں سے چلنا چاہئے۔''

سجاد نے ویٹر کو بلا کر کھانے کا بل ادا کیا۔ پھر وہ دونوں باہر آ گئے۔ وہاں ایک نئی پریشانی ان کی منتظر تھی۔ انہوں نے اپنی کار سروس روڈ پر کھڑی کی تھی۔ مگر اب وہ وہاں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ہوٹل کے باہر چاندنی سی بچھی ہوئی تھی۔ وہاں کچھ لوگ کھانے پینے میں مصروف تھے۔ سجاد نے ان کے پاس آ کر پوچھا۔ ''یہاں ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ آپ نے دیکھی ہو گی؟''

ایک شخص نے کہا۔ ''ہاں۔ ابھی تقریباً ایک گھنٹے پہلے تین افراد اس میں بیٹھ کر گئے ہیں۔''

دوسرے شخص نے پوچھا۔ ''کیا وہ آپ کے ساتھی تھے؟''

''نہیں... وہ کار میری ہے۔ پتہ نہیں' وہ کون لوگ تھے؟''

ایک شخص نے کہا۔ ''مگر وہ تو بڑی آسانی سے کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئے تھے۔ کیا آپ نے اسے لاک نہیں کیا تھا؟''

''میں نے اسے اچھی طرح لاک کیا تھا۔''

"پھر تو آپ کی کار گئی۔"

ہوٹل کا ایک ملازم کھانے کی پلیٹیں اٹھا رہا تھا۔ ایک شخص نے پوچھا۔ "کیا تم کار لے جانے والوں کو پہچانتے ہو؟"

ملازم نے کہا۔ "ہاں... انہوں نے مجھے پچاس روپے دیئے تھے اور کہا تھا' کوئی اس کار کے بارے میں پوچھے تو کہنا' ہم اسے واپس لے آئیں گے۔ مگر واپسی میں ذرا دیر ہوگی۔"

باہر ان مردوں کے درمیان تین خواتین بھی تھیں۔ ان میں سے ایک بوڑھی خاتون نے سجاد سے کہا۔ "کہنے کی باتیں ہیں۔ کوئی چوری کا مال واپس کرنے نہیں آتا۔"

ہوٹل کے ملازم نے کہا۔ "مگر وہ چور نہیں ہیں۔ وہ بڑے پیسے والے لوگ ہیں۔ اس ہوٹل میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہ ضرور آئیں گے۔"

پھر ملازم نے کہا۔ "آپ اندر بیٹھیں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ چوری ڈکیتی کرنے والے بدمعاش نہیں ہیں۔ مجھے سو پچاس روپے دیتے رہتے ہیں۔"

اس نے سروس روڈ پر کھڑی ہوئی دوسری گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ان کی کار ہے۔ وہ اسے لے جانے اور آپ کی گاڑی واپس کرنے ضرور آئیں گے۔"

اریبہ اور سجاد نے ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھا۔ پھر ہوٹل کے اندر آ کر اسی میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ سجاد نے کہا۔ "اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہم پیدل کہیں جا نہیں سکتے۔ انتظار کرنا ہوگا۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ شریف گھرانے کے دولتمند چور ہم پر مہربانی کرنے واپس آئیں گے یا نہیں؟"

اریبہ نے کہا۔ "یہ ہمارے ملک میں کیا ہو رہا ہے؟ کتنی حیرانی کی بات ہے' شریف گھرانے کے افراد بھی چوری کی وارداتیں کرنے لگے ہیں۔"

"بیشک۔ انہوں نے عارضی طور پر ہماری کار چرائی ہے۔ لیکن ضمانت کے طور پر پنی گاڑی یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ ان کی کوئی مجبوری ہوگی۔"

"مجبوری ہی چوری پر مجبور کرتی ہے۔ مایوسیاں اور محرومیاں ہی لوگوں کو جرائم کی رف لے جاتی ہیں۔"

وہاں بڑے سے ٹی وی اسکرین پر ملکی حالات کے متعلق خبریں نشر کی جا رہی تھیں۔ چاروں صوبوں کے مختلف شہروں اور چھوٹے بڑے علاقوں میں آگ لگ رہی تھی۔ لہو اچھالا جا رہا تھا۔ انہیں روکنے کے لئے قانون کے محافظ نہیں تھے۔ نہ پولیس تھی' نہ فوجی نظر آ رہے تھے۔ ججوں کو' وکلاء اور عدلیہ کو پہلے ہی مفلوج کر دیا گیا تھا۔ صاف سمجھ میں آ رہا تھا کہ سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق ملک کو تباہی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔

پاکستان کی تاریخ میں ایسا پہلی بار ہو رہا تھا۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام مجرموں کو کھلی چھٹی دے دی گئی تھی۔ حتیٰ کہ قیدیوں کو جیل سے فرار ہو کر وارداتیں کرنے کے مواقع فراہم کئے جا رہے تھے۔ یہ ملک خداداد پہلی بار تمام قوانین سے بالاتر ہو کر اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی مارنے کا تماشہ ساری دنیا کو دکھا رہا تھا۔

شیری' وکی اور کامی تین بے لگام رئیس زادے سجاد کی کار لے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے' غربت جرائم کو جنم دیتی ہے۔ جبکہ وہ تینوں کروڑ پتی اور ارب پتی باپ کے بیٹے تھے۔ صرف غربت اور بے روزگاری ہی نہیں' بے انتہا دولت کی فراوانی بھی انسان کو مجرم بنا دیتی ہے۔

غریب اپنے بدترین حالات سے مجبور ہو کر گھروں میں چوریاں کرتے ہیں۔ جبکہ بڑے لوگ بینکوں اور قومی خزانوں کو لوٹتے رہتے ہیں۔ غریب افراد نچلے طبقے میں نچلی کمینگی سے قتل و غارت گری اور اغوا کی وارداتیں کرتے ہیں۔ اور معزز کہلانے والے امیر ترین لوگ کرائے کے قاتلوں سے ایسی وارداتیں کراتے ہیں۔

لیاقت علی خان' ذوالفقار علی بھٹو' ضیاء الحق اور بے نظیر بھٹو کو کسی غریب مجرم نے نہیں' بلکہ اعلیٰ پائے کی کمینی ذہانت رکھنے والے امیر ترین سیاست دانوں نے ہلاک کیا ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔ چھوٹے اپنے بڑوں کی تقلید کرتے ہیں۔ اگر بڑے لوگ مزید بڑا بننے کی ہوس میں جرم نہ کریں تو غریب دن بہ دن اور زیادہ غریب نہیں بنیں گے اور نہ ہی ان سے کوئی جرم سرزد ہوگا۔

شیری' وکی اور کامی جیسے رئیس زادے ملک سے باہر سیر و تفریح کی غرض سے جاتے آتے رہتے ہیں۔ بچپن سے ایکشن اور مار دھاڑ سے بھرپور شرمناک بلیو فلمیں دیکھتے

ہیں۔ پھر جوان ہونے کے بعد یورپ اور امریکہ کے شراب خانوں‘ قحبہ خانوں اور قمار خانوں میں دولت لٹاتے ہیں۔ ان کا جی چاہتا ہے‘ مستی میں آ کر خوب شور مچائیں۔ وہ کان پھاڑ دینے والی آوازوں کے ساتھ آرکسٹرا سنتے اور رقص کرتے ہیں۔ سائلینسر ہٹا کر شور مچاتی ہوئی اسپورٹس بائیک پر دندناتے پھرتے ہیں۔ خوشی کی تقریبات میں دھماکے کرنے والی آتش بازی سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اندھا دھند فائرنگ کرتے ہیں۔

ان سے پوچھا جائے تو کہتے ہیں‘ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا رہے ہیں۔ اپنے طور پر لائف انجوائے کر رہے ہیں۔

وہ تینوں رئیس زادے اپنے طور پر لائف انجوائے کرنے کے لئے سجاد کی کار چرا کر لے گئے تھے۔ انہوں نے چوری کی بھی تھی اور نہیں بھی کی تھی۔ وہاں یہ پیغام چھوڑ دیا تھا کہ کار واپس کر دی جائے گی۔ ویسے تو وہ اپنی گاڑی لے جا سکتے تھے۔ لیکن اس کا پیٹرول ختم ہو گیا تھا۔ انہوں نے طے کیا تھا‘ واپسی میں اس کے لئے پیٹرول لائیں گے اور سجاد کی گاڑی کی ٹنکی بھی فل کرا دیں گے۔

شیری کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ وکی اور کامی اپنی اپنی گن چیک کر رہے تھے۔ شہر کا کوئی بھی پیٹرول پمپ کھلا ہوا نہیں تھا۔ وہ پہلے اپنی کوٹھی میں آئے۔ وہاں سجاد کی کار کی ٹنکی فل کی۔ پھر اپنی گاڑی کے لئے پیٹرول سے بھرا ہوا ایک کین اس کی ڈکی میں رکھ لیا۔

وکی نے کہا۔ ”آدھی رات ہو رہی ہے۔ کیا سلمان اتنی رات کو ہم سے ملنے کے لئے کوٹھی کا دروازہ کھولے گا؟“

شیری نے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے‘ کیا وہ ہمیں اپنی کوٹھی کے اندر نہیں بلائے گا؟“

کامی نے کہا۔ ”پہلے وہ ہمارا بہترین دوست تھا۔ جب سے جھگڑا ہوا ہے‘ تب سے برائے نام دوستی رہ گئی ہے۔ وہ اتنی رات کو ملنے سے انکار کر سکتا ہے۔“

”ہم اس کے انکار کو اقرار میں بدل دیں گے۔ یہاں سے چلو تو سہی۔“

وہ تینوں کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ سلمان کی کوٹھی کی طرف جانے لگے۔ وہ پہلے چار یار تھے۔ اب تین رہ گئے تھے۔ ازل سے زر‘ زن اور زمین کے سلسلے میں فسادات ہوتے

آئے ہیں۔ ان کے درمیان بھی ایک معشوقہ کے سلسلے میں اَن بن ہو گئی تھی۔

سلمان ان کی چنڈال چوکڑی سے نکل گیا تھا۔ اپنی حسین بیوی کے ساتھ ازدواجی زندگی گزار رہا تھا۔ ان کی محفلوں اور رنگ رلیوں سے دور رہنے لگا تھا۔ وہ سب اخلاقی قدروں کو نہ سمجھتے تھے اور نہ سمجھنا چاہتے تھے۔ ایک دوسرے کی گرل فرینڈ کا آپس میں تبادلہ کیا کرتے تھے۔ اگر ایک یار کا دل اپنی گرل فرینڈ سے بھر جاتا تو وہ دوسرے یار کی گرل فرینڈ کو اپنا لیتا اور اپنی والی کو راضی خوشی دوسرے یار کے پاس بھیج دیتا۔

سلمان بھی ان کی طرح من موجی تھا۔ ان کے ساتھ لڑکیوں کے معاملے میں شیئر کیا کرتا تھا۔ پھر اچانک ہی اس کی زندگی میں شبینہ آئی۔ وہ پہلی بار دوستی کے معاملے میں سنجیدہ ہو گیا۔ پہلی بار دل نے کہا۔ ”کوئی ایسی لڑکی ہو‘ جو صرف اسے چاہتی ہو‘ صرف اس کی ملکیت ہو۔ کوئی اور اسے ہاتھ نہ لگائے۔“

شیری نے کہا۔ ”کل شام میں نے تمہیں سی ویو میں ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا۔“

وکی نے کہا۔ ”اور شائد پرسوں شاپنگ مال میں بھی اسی کے ساتھ تھے۔ لگتا ہے‘ اسے ہم سے چھپاتے پھر رہے ہو؟“

”نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

کامی نے کہا۔ ”اگر ایسی کوئی بات نہیں ہے تو اسے ہم سے کیوں نہیں ملاتے؟“

”وہ بہت ہی شرمیلی ہے۔ ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔“

”کیا ہم شریف گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے؟“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ شیری نے کہا۔ ”ہم سب ہی لائف انجوائے کرتے ہیں۔ تم شرافت کو بیچ میں کیوں لا رہے ہو؟“

”وہ ہمارے ماحول میں ایڈجسٹ نہیں ہو گی۔ میرے سوا کسی سے دوستی نہیں کرے گی۔“

”صاف کیوں نہیں کہتے‘ تم اپنا پھل ہمیں چکھانا نہیں چاہتے۔“

”یہی سمجھ لو۔ دراصل... میں اس سے شادی کرنے والا ہوں۔ ڈیڈی بھی اسے

بہو بنانا چاہتے ہیں۔ ممی کی وفات کے بعد وہ تنہا رہ گئے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ بہو آئے۔ بچے ہوں تو ان کا بھی دل بہلتا رہے۔ انہوں نے تو اس ماہ کے آخر میں شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی ہے۔''

شیری نے کہا۔ ''بات اتنی دور تک پہنچ گئی اور تم ہم سے چھپاتے رہے؟ بہر حال ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ جب ہو گی' تب دیکھا جائے گا۔ ابھی تو ہم شیئر کر سکتے ہیں۔''

وہ سخت لہجے میں بولا۔ 'فضول باتیں نہ کرو۔ وہ میری ہونے والی وائف ہے۔ میرے بچوں کی ہونے والی ماں ہے۔''

کامی نے کہا۔ ''اب تک ہمارے پاس جتنی لڑکیاں آتی جاتی رہی ہیں۔ انہوں نے بھی شادیاں کر لی ہیں' گھر بسا لئے ہیں اور اب اپنے شوہروں کے لئے بچے پیدا کر رہی ہیں۔''

وکی نے کہا۔ ''ہماری زندگی میں بھی جو لڑکیاں بیویاں بن کر آئیں گی' وہ کون سی پارسا ہوں گی؟ ہمارے پاس کیا ثبوت ہو گا کہ انہوں نے شادی سے پہلے کسی دوسرے کے ساتھ لائف انجوائے نہیں کی ہے؟''

شیری نے کہا۔ ''یار! شادی اور بچے کے معاملے میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ لڑکی جیسی بھی ہو اگر بیوی بن کر آ گئی ہے تو اس کے بعد دوسرے کے پاس نہ جائے۔ صرف ہمارے لئے ہمارے بچے پیدا کرتی رہے۔ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ اس سے پہلے تو ہمیں اپنے دستور کے مطابق ایک دوسرے سے شیئر کرنا چاہئے۔''

سلمان نے کہا۔ ''ہرگز نہیں... شبینہ کا تعلق نہ ہماری بے حیا سوسائٹی سے ہے' نہ میں ہونے دوں گا۔ وہ صرف میری ہے... صرف میرے بچوں کی ماں بنے گی۔''

اس کے انکار پر بات بڑھ گئی۔ ان کے درمیان کشیدگی بھی بڑھ گئی۔ انہوں نے سلمان سے فون پر بھی رابطہ ختم کر دیا۔ شادی کے موقع پر اسے مبارکباد دینے بھی نہیں گئے۔ اب تقریباً سات ماہ کے بعد آدھی رات کو اس کی کوٹھی کی طرف جا رہے تھے۔

کامی نے اپنے دوستوں سے کہا۔ ''تم دونوں نے اس کی بیوی کو دیکھا ہے۔ بڑی تعریفیں کرتے ہو۔ کیا واقعی وہ بہت زیادہ حسین ہے؟''

''وہ صرف حسین ہی نہیں مائی فرینڈ! بھرپور بھی ہے۔ آج تو مزہ آ جائے گا۔''

شیری نے ایک سسکاری لیتے ہوئے کہا۔ ''جبراً ریپ کرنے اور چھینا جھپٹی کرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔''

وکی نے کہا۔ ''وہ سالا بڑی شرافت دکھا رہا ہے۔ اسے شجر ممنوعہ بنا کر رکھتا ہے۔ اسے فون کرو۔ معلوم تو ہو' سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے؟''

ایک نے فون نکال کر نمبر پنچ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم سونے والوں کو جگانا جانتے ہیں۔''

رابطہ ہونے پر وہ سلمان کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے۔ وکی نے کہا۔ ''ہیلو سلمان! میں وکی بول رہا ہوں۔ کیا تم سو رہے تھے؟''

''نہیں جاگ رہا ہوں۔ بائی داوے... اتنے عرصے بعد میری یاد کیسے آ گئی؟''

''صرف مجھے ہی نہیں' تمام فرینڈز کو تمہاری یاد آتی رہتی ہے۔ ہم خود پر جبر کرتے ہیں کہ تم سے نہ ملیں۔ مگر دیرینہ یار ہیں۔ ہمیشہ کے لئے چھوٹ نہیں سکتے۔ اس لئے تم سے ملنے آئے ہیں۔''

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ''ملنے آئے ہو؟ اس وقت کہاں ہو؟''

''تمہاری کوٹھی کے سامنے شیری اور کامی بھی میرے ساتھ ہیں۔ لو بات کرو۔''

شیری نے اس سے فون لے کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں سوری نہیں کہوں گا۔ کیونکہ دوستوں میں خواہ کتنی ہی رنجش پیدا ہو جائے۔ وہ کسی طرح کا ایکسکیوز نہیں کرتے۔ بس فوراً گلے لگ جاتے ہیں۔ ہمارا خلوص اور محبت دیکھو... ہم تمہارے دروازے پر آئے ہیں۔''

سلمان نے کہا۔ ''میرے دل میں بھی کوئی میل نہیں ہے۔ میں بھی تم لوگوں کو بہت مس کرتا ہوں۔ جسٹ آ منٹ.... ابھی چوکیدار سے کہتا ہوں' وہ دروازہ کھولے گا۔''

ان تینوں نے کھڑکیوں سے جھانک کر آس پاس دیکھا۔ دور تک کوٹھیوں کے باہر روشنی تھی مگر ویرانی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ان کوٹھیوں کے چوکیدار بھی اندر کہیں کیبنوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ واردات کرنے والوں سے چھپ کر ہی نمٹ سکتے تھے۔

چوکیدار نے آ کر انہیں سلام کیا۔ شیری نے کہا۔ ''بڑا دروازہ نہ کھولو۔ ہماری کار

باہر ہی رہے گی۔ہم تمہارے صاحب سے ملنے کے بعد ابھی واپس چلے جائیں گے۔"

چوکیدار نے دوسرا سائیڈ والا دروازہ کھول دیا۔وہ تینوں اندر آگئے۔وکی نے چوکیدار سے پوچھا۔"تم اکیلے ہو یا اور بھی ملازم ہیں؟"

وہ بولا۔"وہ سب تو شام کو چلے جاتے ہیں۔صرف ایک ملازم کوٹھی کے اندر رہتا ہے۔لیکن آج حالات ایسے ہیں کہ وہ بھی چھٹی لے کر چلا گیا ہے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے پورچ کے سائے میں آگئے۔وہاں روشنی کم تھی۔وکی کے ریوالور میں سائلنسر لگا ہوا تھا۔اس نے کہا۔"تم یہاں تنہا ہو۔ایک گن لئے پھر رہے ہو۔کیا واردات کرنے والوں کا مقابلہ کرسکو گے؟"

"صاحب!میں دیکھ بھال کسی کو اندر آنے دیتا ہوں۔کوئی اجنبی ہو تو گیٹ نہیں کھولتا۔دیوار پھلانگ کر آنے والوں سے چھپ کر نمٹ سکتا ہوں۔"

وکی نے کہا۔"لوگ بڑی تیاریاں کرتے ہیں۔پھر بھی موت آجاتی ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے چوکیدار کو گولی ماردی۔وہ پورچ میں ایک گاڑی کے پاس گر کر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہوگیا۔انہوں نے اس کی لاش کو گھسیٹ کر ایک کونے میں ڈال دیا۔پھر بیرونی دروازے پر آئے اور بیل کے بٹن کو دبایا۔سلمان نے دروازے پر آکر فش آئی سے آنکھ لگا کر انہیں دیکھا پھر مطمئن ہو کر دروازہ کھول دیا۔

سب سے آگے شیری تھا۔سلمان اس سے گلے لگتے ہوئے بولا۔"یہ تم لوگ گن اٹھائے کیوں پھر رہے ہو؟"

کامی نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔"یار!تم تو جانتے ہو جب تک لائف میں ایڈونچر نہ ہو مزہ نہیں آتا۔آج تو پورے شہر میں نہ فوج ہے' نہ پولیس ہے۔لوگ اندھا دھند گولیاں چلا رہے ہیں۔کوئی پوچھنے والا نہیں ہے کہ یہ پٹاخے کیوں چھوڑے جارہے ہیں؟ کیوں آتے جاتے لوگوں کو کتے بلیوں کی طرح مارا جارہا ہے؟"

شیری نے کہا۔"ہاں۔پٹاخوں کی بات پر یاد آیا' تمہاری وہ پٹاخہ کہاں ہے؟"

سلمان نے چونک کر اسے دیکھا پھر کہا۔"دیکھو یار!ہماری دوستی اپنی جگہ ہے۔مگر میں وائف کے معاملے میں بے تکلفی پسند نہیں کروں گا....آؤ بیٹھو...!"

ایک نے کہا۔"ہم بیٹھنے نہیں تمہاری پھلجھڑی سے کھیلنے آئے ہیں۔"

وہ غصے سے بولا۔"بکواس مت کرو۔کیا تم لوگوں نے بہت زیادہ پی لی ہے؟"

شیری نے ٹی ٹی کی نال اس کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔"آج تک ہم نے کسی گرل فرینڈ کو پارسا نہیں بنایا۔اسے تمہارے سامنے بھی پیش کرتے رہے۔آج اپنی گرل فرینڈ کو پیش کرو۔"

کامی نے اس کی کنپٹی سے ریوالور لگاتے ہوئے کہا۔"یہ نہ کہنا کہ وہ تمہاری بیوی ہے۔اگر ہے تو ہوتی رہے۔ہمارے لئے تو وہ گرل فرینڈ ہے۔ہم نے اسے چکھا نہیں ہے۔وہ ہمارے لئے نئی نویلی ہے۔"

وکی دوسرے کمرے کی طرف جارہا تھا۔سلمان نے کہا۔"خبردار!ادھر نہ جانا۔مجھ سے بات کرو۔"

وہ وکی کا راستہ روکنے کے لئے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ادھر سے سائلنسر لگے ہوئے ریوالور کی گولی چلی۔گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔شبینہ اسے مخاطب کرتی ہوئی ایک کمرے سے باہر آرہی تھی۔"سلمان!کیا ہوا...تمہارے دوست آگئے؟"

وہ بولتے بولتے رک گئی۔اپنے شوہر کو فرش پر تڑپتا دیکھ کر چیخیں مارتی ہوئی اس کی طرف دوڑی۔وکی اور کامی نے اسے پکڑ لیا۔شیری نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔"ارے!یہ تو پیٹ والی ہے۔"

وہ ماں بننے والی تھی۔چار ماہ کا حمل تھا۔سلمان نے تکلیف سے کراہتے ہوئے شیری سے کہا۔"اسے چھوڑ دو۔فار گاڈ سیک۔میری دوستی کا خیال کرو۔"

"تم نے ہماری دوستی کا لحاظ نہیں کیا۔ہمیں کھلانے سے پہلے اتنا کھایا کہ پیٹ نکال دیا۔"

کامی نے کہا۔"ہمیں پیٹ سے کیا لینا ہے؟ واقعی مال تو زبردست ہے۔"

وکی نے کہا۔"اسے شجر ممنوعہ بنایا گیا تھا۔جو دکان ہمارے لئے بند کی گئی تھی۔اس کی کھلی دکانداری کریں گے۔"

سلمان نے فرش پر سے اٹھنے کی کوشش کی مگر گر پڑا۔ شیری سے بولا۔ ''پلیز میری شبینہ پر رحم کرو۔ یہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ مجھ سے جو وصول کرنا چاہو میں وہ سب کچھ تمہارے آگے رکھ دوں گا۔ میری جان لینا چاہو میں ابھی دینے کو تیار ہوں۔ مگر اس پر ظلم نہ کرو۔ اسے ہاتھ نہ لگاؤ۔''

رونے اور گڑگڑانے سے رحم کی بھیک نہیں ملتی۔ کیونکہ رحم کرنے والے بے رحم نہیں ہوتے اور جو بے رحم ہوتے ہیں' وہ رحم کی بھیک دینا نہیں جانتے۔ شیری نے کہا۔ ''ہم یہاں اپنی موجودگی کا ثبوت اور اپنے خلاف کسی چشم دید گواہ کو زندہ چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ لہٰذا سب سے پہلے تمہیں مرنا چاہئے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی گن سیدھی کی۔ لیکن گولی چلانے سے پہلے ہی ایک ٹھائیں کی آواز گونجی۔ شیری کے حلق سے چیخ نکلی وہ جھک کر گر پڑا۔ وکی اور کامی نے گھبرا کر ایک کمرے کی طرف دیکھا۔ اس کے ادھ کھلے دروازے کے پیچھے سے فائرنگ ہوئی تھی۔ اس کمرے میں اندھیرا تھا۔ کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں تھے۔ وہاں چھپنے کی جگہ نہیں تھی۔ جوابی فائرنگ کرنے سے پہلے کہیں چھپنا ضروری تھا۔ وکی وہاں سے دوسرے کمرے کی طرف بھاگنے لگا۔ کامی شبینہ کے پیچھے آ کر اسے ڈھال بنانا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت ایک گولی اس کے شانے پر آ کر لگی۔ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر دور جا گری۔

ادھر وکی دوڑتے دوڑتے لڑکھڑا کر گر پڑا۔ وہ تینوں پیشہ ور مجرم نہیں تھے۔ یونہی خرمستی کرنے چلے آئے تھے۔ اپنی زندگیوں کو فل آف ایڈونچر بنانا چاہتے تھے۔ وہ وہاں سے اٹھ کر بھاگنا چاہتا تھا۔ دوسری گولی آ کر لگی۔ وہ اٹھتے اٹھتے وہیں گر پڑا۔

اس تاریک کمرے سے آواز سنائی دی۔ ''اپنی اپنی گنیں پھینک دو۔ ورنہ حرام موت مرو گے۔''

شیری بے جان پڑا ہوا تھا۔ وکی اور کامی زخمی ہوئے تھے۔ ایک کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر دور چلی گئی تھی۔ دوسرے نے بھی اپنی گن ایک طرف پھینک دی۔ تب اس تاریک کمرے سے ایک بوڑھا شخص باہر آیا۔ سلمان نے کہا۔ ''تھینک یو ڈیڈ! آپ نے بڑی

ہوشیاری سے اپنی بہو کی عزت بچائی ہے۔''

شبینہ دوڑتی ہوئی آ کر سلمان سے لپٹ گئی۔ اس کے ڈیڈی ان ہتھیاروں کو ٹھوکریں مارتے ہوئے دور پھینک رہے تھے۔ شیری کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''ابھی اس میں جان ہے۔''

پھر انہوں نے بیٹے سے پوچھا۔ ''کیا گولی آر پار ہوئی ہے؟'' زخم گہرا تو نہیں ہے۔''

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ ''گولی گھٹنے کی ہڈی توڑتی ہوئی گزر گئی ہے۔ آپ پولیس کو کال کریں۔''

سلمان ایک صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ باپ نے اسے اپنی گن دیتے ہوئے کہا۔ ''ان تینوں پر نظر رکھو۔ اگر ذرا بھی حرکت کریں تو گولی مار دینا۔''

یہ کہہ کر وہ موبائل فون کے ذریعے رابطہ کرنے لگا۔ موت سے بچنا محال ہوتا ہے۔ اگر بچ گئے' زندگی مل گئی تو اس زندگی کو سنبھالنا اور سلامت رکھنا اس سے بھی زیادہ محال ہو جاتا ہے۔ حالات ایسے تھے کہ کوئی ڈاکٹر اپنے گھر سے نہیں نکل رہا تھا۔ زندگی دینے والے ڈاکٹروں کے پیچھے بھی موت لگی ہوئی تھی۔ اگر وہ ہزاروں لاکھوں روپے کے لالچ میں آ بھی جاتے تو عارضی طور پر مرہم پٹی کر سکتے تھے۔ لیکن گھٹنے کی ہڈی جوڑ نہیں سکتے تھے۔ اس کے لئے سلمان کو کسی بھی ہوسپٹل کے آپریشن تھیٹر میں پہنچانا ضروری تھا۔

اور وہ تین زخمی مجرموں کو اپنے گھر میں چھوڑ کر ہوسپٹل نہیں جا سکتے تھے۔ پہلے پولیس کی کارروائی لازمی تھی۔ ان مجرموں کو قانون کے محافظوں کے حوالے کرنے کے بعد ہی سلمان کو کسی ہوسپٹل میں لے جایا جا سکتا تھا۔

پہلے قریبی تھانے سے فون کے ذریعے رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہاں گھنٹی بج رہی تھی مگر کوئی فون اٹینڈ کرنے والا نہیں تھا۔ سلمان کے باپ فرمان علی نے اپنے ایک شناسا پولیس افسر کے موبائل فون پر رابطہ کیا۔ اس اعلیٰ افسر نے پوچھا۔ ''ہیلو فرمان صاحب! خیریت تو ہے۔ اس وقت کیسے یاد کیا؟''

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔ قریبی تھانے میں فون کر رہا ہوں مگر وہاں کوئی کال اٹینڈ نہیں کر رہا ہے۔ میری کوٹھی میں تین افراد گھس آئے تھے۔ وہ مسلح تھے۔ لیکن میں نے

بڑی جی داری سے مقابلہ کرتے ہوئے انہیں زخمی کر دیا ہے۔ان میں سے شاید ایک مر چکا ہے۔سلمان کو گولی لگی ہے۔گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔اسے ہوسپٹل پہنچانا بہت ضروری ہے۔سمجھ میں نہیں آتا' ان مجرموں کو گھر میں چھوڑ کر کیسے جاؤں؟ آپ میری کچھ مدد کریں۔کسی تھانیدار کو حکم دیں' وہ سپاہیوں کے ساتھ آ کر ان مجرموں کو لے جائے۔''

''فرمان صاحب! موجودہ حالات کے پیش نظر تمام سپاہیوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تھانے سے باہر نہ نکلیں۔شہر میں آپ کو رینجرز کی گاڑیاں بھی نظر نہیں آئیں گی۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔''یہ ہمارے ملک میں کیا ہو رہا ہے؟ ہمیں تحفظ دینے کے لئے نہ فوج ہے' نہ پولیس ہے۔ہم ایک زخمی کو ہوسپٹل بھی نہیں لے جا سکتے اور مجرموں کو قانون کے حوالے بھی نہیں کر سکتے۔میں ان زخمی مجرموں کا کیا کروں؟ کیا انہیں باہر بھگا دوں؟''

''بیٹے کو ہوسپٹل پہنچانے کے لئے آپ جو کر سکتے ہیں' کریں...میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔''

یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ پولیس کی مدد حاصل نہیں ہو سکے گی۔اس نے پھر اپنے رشتے داروں سے رابطہ کیا۔انہیں اپنے حالات بتائے۔سب نے یہی مشورہ دیا کہ مجرموں کو دفع کرو۔انہیں گھر سے باہر نکالو اور بیٹے کو جلد سے جلد ہوسپٹل پہنچاؤ۔

فرمان علی نے فون کے ذریعے نائٹ چوکیدار سے رابطہ کرنا چاہا۔دوسری طرف بیل جا رہی تھی مگر کوئی اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔بعد میں پتہ چلا کہ ان تینوں نے کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے اس چوکیدار کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

سلمان نے اپنے دوست نما دشمنوں کو دیکھتے ہوئے حقارت سے کہا۔''تم لوگ بہت بڑی واردات کرنے آئے تھے۔یہاں سب کو قتل کرنے کے بعد واپس جانے والے تھے۔''

پھر اس نے شیری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''اب اٹھو! اسے دیکھو شائد یہ مر چکا ہے۔اسے اٹھا کر باہر لے جاؤ۔چوکیدار کی لاش بھی اٹھا کر اپنی کار میں ڈالو اور یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ۔''

بڑی مجبوری تھی۔جان لینے والے دشمنوں کو آزاد چھوڑا جا رہا تھا۔انہیں قانون کے حوالے نہیں کیا جا سکتا تھا۔پورے شہر میں بلکہ پورے ملک میں دہشت گرد لاشیں گراتے

پھر رہے تھے۔انہیں بھی پکڑنے والا کوئی نہیں تھا۔ستائیس دسمبر دو ہزار سات کی شب سب ہی اندھیر نگری میں تھے۔

وکی اور کامی دونوں زخمی تھے۔انہوں نے شیری کے پاس آ کر اسے ٹٹولا۔وکی نے کہا۔''یہ تو مر چکا ہے۔''

سلمان نے کہا۔''تم بھی مرنے سے پہلے اسے یہاں سے لے جاؤ۔''

وہ دونوں گن پوائنٹ پر تھے اور نہتے بھی تھے۔ایسے حالات میں حکم کی تعمیل ضروری تھی۔وہ اسے اٹھا کر باہر لے جانے لگے۔فرمان علی نے کہا۔''چوکیدار کی لاش کو بھی اپنی گاڑی میں لے جاؤ۔تم دونوں ان لاشوں کے ذمہ دار ہو۔''

وہ شیری کو اٹھا کر ہانپتے کانپتے باہر آ گئے۔ان کے زخموں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔وہ تکلیف سے کراہ رہے تھے۔کامی نے کوٹھی کے احاطے سے باہر آ کر کہا۔''ہم اسے اٹھا کر کہاں لے جائیں گے؟ پھر ان کا حکم ہے کہ چوکیدار کی لاش بھی لے جائیں۔''

وکی نے کہا۔''غنیمت سمجھو انہوں نے ہمیں صرف زخمی کیا ہے۔اب ان لاشوں کو گاڑی میں لے جا کر کسی نئی مصیبت میں نہیں پھنسنا چاہئے۔''

انہوں نے سر گھما کر کوٹھی کی طرف دیکھا پھر ایک نے کہا۔''وہ لوگ اندر ہیں۔نظر نہیں آ رہے ہیں۔ہمیں بھی نہیں دیکھ رہے ہیں۔لاش کو یہاں پھینکو اور بھاگو....''

شیری ان کا بہت پرانا ساتھی تھا۔مگر اب بوجھ بن گیا تھا۔وہ اسے ایک طرف پھینک کر کار کی اگلی سیٹوں پر آ گئے۔پھر اسے اسٹارٹ کر کے گاڑی کو آگے بڑھاتے چلے گئے۔وکی نے کہا۔''ہماری جان بچ گئی ہے۔مگر ہم مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔سلمان اور اس کے ڈیڈ ہمارے خلاف بھرپور قانونی کارروائی کریں گے۔''

کامی نے کہا۔''ہم نے ان کے چوکیدار کا مرڈر کیا ہے۔کوٹھی میں گھس کر سلمان کو زخمی کیا ہے۔ہم اپنی پلاننگ کے مطابق کامیاب ہو رہے تھے۔مگر وہ بڈھا اچانک ہی ہماری شامت بن کر آ گیا۔''

وکی نے کہا۔''ہم اناڑی ہیں۔سلمان کی بیوی کو ریپ کرنے کے لئے نکلے تھے۔مگر پہلے سے یہ معلوم نہیں کیا کہ اس کوٹھی میں سلمان اور اس کی بیوی کے علاوہ وہ بڈھا

بھی ہوگا۔"

"اس بوڑھے نے تو بیٹے بہو کو وہ کوٹھی تنہا رہنے کے لئے دی تھی۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ وہاں موجود ہوگا۔"

"جان بچانے کی بس ایک ہی امید ہے کہ ہمارے والدین سلمان اور اس کے ڈیڈ کو کسی سمجھوتے پر راضی کرلیں۔"

"ہمیں فوراً اپنے اپنے ڈیڈی کو اپنی کریٹیکل پوزیشن کے بارے میں بتانا چاہئے۔"

"میری تو تکلیف سے جان نکل رہی ہے۔ میں بڑی مشکل سے ڈرائیو کر رہا ہوں۔ فون پر ڈیڈ سے بات نہیں کرسکوں گا۔"

"میرے زخم سے بھی ایسی ٹیسیں اٹھ رہی ہیں کہ میں ہی جانتا ہوں۔ مرد بچہ ہوں، رو نہیں سکتا۔ بس چپ چاپ برداشت کر رہا ہوں۔"

"ہم ہوسپٹل پہنچ کر مرہم پٹی کرانے کے بعد گھر والوں سے رابطہ کریں گے۔"

حالات ایسے تھے کہ باہر بھٹکنے والے آسانی سے اپنے گھروں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ بخیریت ہسپتال تک پہنچنا بھی نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ بے رحمی اور سنگدلی کی انتہا یہ تھی کہ ہسپتال پہنچانے والی ایمبولینس وغیرہ کو بھی آگ لگائی جارہی تھی۔

وہ دونوں سلمان کی کوٹھی سے جان بچانے کے بعد واپس جاتے ہوئے اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ بخیریت ہوسپٹل پہنچ سکیں گے.....ارمان سو برس کے ہیں پل کی خبر نہیں.....

کامی نے کار کو ایک گلی میں موڑ دیا۔ وکی نے پوچھا۔ "یہ کدھر جا رہے ہو؟"

"یہ شارٹ کٹ ہے۔ ہم جلد ہی ہوسپٹل پہنچ سکیں گے۔"

"ہمیں جناح ہوسپٹل نہیں جانا چاہئے۔ وہ سلمان کے لئے بھی قریب ہے۔ وہ بوڑھا اپنے بیٹے کو علاج کے لئے وہیں لائے گا۔ ہمیں دیکھتے ہی پھر ہمارے پیچھے پڑ جائے گا۔"

وہ قائل ہو کر بولا۔ "ہوں۔ ٹھیک کہتے ہو۔ ہم اس گلی سے نکل کر سول ہوسپٹل کی طرف جائیں گے۔"

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ ایک مکان کے سامنے اچانک ہی گاڑی روک

دی۔ وہاں دروازے پر ڈاکٹر حسنات بیگ کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ وکی نے پوچھا۔ "گاڑی کیوں روک دی؟"

وہ بولا۔ "ادھر دیکھو.. وہ ایک ڈاکٹر کا مکان ہے۔ یہاں ہماری مرہم پٹی ہوسکتی ہے۔"

وہ دونوں کار سے اتر کر دروازے پر آگئے۔ کال بیل کا بٹن دبایا۔ رات کے تین بجنے والے تھے۔ سب ہی گہری نیند میں تھے۔ دوسری بار پھر تیسری بار بیل بجانے پر اندر سے آواز سنائی دی۔ "کون ہے بھائی....؟"

وکی نے کراہتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! ہم بری طرح زخمی ہیں۔ خدا کے لئے دروازہ کھولیں۔ اگر آپ نے مرہم پٹی نہ کی تو مر جائیں گے۔"

ایک خاتون کی آواز سنائی دی۔ "آپ دروازہ نہ کھولیں۔ پتہ نہیں یہ کون لوگ ہیں؟"

جواباً ڈاکٹر کی آواز سنائی دی۔ "تم جانتی ہو۔ میں آدھی رات کے بعد بھی بیماروں کے لئے دروازہ کھولتا ہوں۔"

خاتون کی آواز سنائی دی۔ "روز کی بات اور ہے، لیکن آج تو پورے شہر میں قیامت آئی ہوئی ہے۔ کیا آپ ٹی وی کی خبریں نہیں سن رہے تھے؟ جس چینل پر دیکھو پیٹرول پمپ اور گاڑیاں جل رہی ہیں۔ بے گناہ مارے جارہے ہیں۔ کوئی کسی کو روکنے ٹوکنے اور پکڑنے والا نہیں ہے۔ پتہ نہیں اتنے سارے درندے کہاں سے آگئے ہیں؟ اس پر آپ ہیں کہ دروازہ کھولنے جارہے ہیں۔"

قریب ہی ایک کھڑکی کھلی۔ وہاں سے ڈاکٹر نے پوچھا۔ "کون ہو بھائی...! کوئی بھی مصیبت کا مارا میرے دروازے پر آئے تو میں اس کا علاج کرتا ہوں۔ اگر تم سچ مچ زخمی ہو تو مجھے یقین دلاؤ کہ ہمارے لئے مصیبت نہیں بنو گے۔"

وہ دونوں کھڑکی کے پاس آکر بولے۔ "آپ دیکھ لیں... ہم دونوں نہتے ہیں۔ زخمی ہیں۔ ہمارا لباس لہو سے بھیگ رہا ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "بس اور کچھ نہ بولو۔ میں اللہ کا نام لے کر دروازہ کھول رہا ہوں۔"

پھر اس نے بیوی سے کہا۔ "تم اندر جاؤ۔ بچوں کے ساتھ رہو۔ دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند کرلو۔ میں ان لوگوں کی مرہم پٹی نہیں کروں گا تو میرا ضمیر مجھے ملامت

کرتا رہے گا۔"

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ دونوں اندر آ گئے۔ ان کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے مطمئن ہو کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ پھر کہا۔ "آرام سے بیٹھو۔ ہمیں ٹی وی کے ذریعے اور رشتے داروں کے ذریعے معلوم ہو رہا ہے کہ شہر میں اندھا دھند فائرنگ ہو رہی ہے۔ بے گناہ مارے جا رہے ہیں۔"

وہ دونوں ایک ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر بولنے کے دوران ان کے زخموں کا معائنہ کرنے لگا۔ پھر بولا۔ "خدا کا شکر ادا کرو۔ زخم گہرے نہیں ہیں۔ تم مرہم پٹی کے بعد آرام سے گھر جا سکو گے۔"

اس نے آدھے گھنٹے کے اندر دونوں کی مرہم پٹی کر دی۔ انہیں انجکشن لگائے۔ کھانے کے لئے دوائیں دیں۔ پھر کہا۔ "اب جا سکتے ہو۔"

وکی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ہزار ہزار کے دو نوٹ نکالے۔ پھر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "انہیں رکھ لیں۔"

وہ پیچھے ہٹ کر بولا۔ "نہیں... میں اتنا مہنگا ڈاکٹر نہیں ہوں۔ غریبوں کا مفت علاج کرتا ہوں۔ جو صاحب حیثیت ہوتے ہیں' ان سے مناسب پیسے لے لیا کرتا ہوں۔ تم مجھے سو روپے دے سکتے ہو۔"

وکی نے ایک ہزار کا نوٹ اس کی جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ "ہمارے پاس اس سے چھوٹا نوٹ نہیں ہے۔ ویسے جاتے جاتے نیک مشورہ دے رہے ہیں۔ ہمارے جانے کے بعد پھر کسی کے لئے دروازہ نہ کھولیں آپ کی یہ شرافت اور مسیحائی بہت مہنگی پڑے گی۔"

وہ ڈاکٹر کا کوئی جواب سنے بغیر مکان سے باہر آ گئے۔ پھر کار میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگے۔ کامی نے کہا۔ "ڈاکٹر بہت ہی تجربہ کار ہے۔ پتہ نہیں کیسی دوا دی ہے۔ اب زخم سے ٹیسیں نہیں اٹھ رہی ہیں۔"

وکی نے کہا۔ "مجھے بھی آرام آ گیا ہے۔ اب ہمیں اس ہوٹل کی طرف جانا چاہئے۔ ہم وہاں تیس لاکھ کی کار چھوڑ کر آئے ہیں۔ یہ کار پتہ نہیں کس منحوس کی ہے؟ ہم نے بہت نقصان اٹھایا ہے۔"

کامی نے کہا۔ "میں نے اس کار سے ایک نوجوان کو اترتے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ ہوٹل کے اندر اور باہر اچھے خاصے گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم وہاں واردات نہیں کر سکتے تھے۔ ورنہ اس لڑکی کو ضرور اٹھا لیتے۔"

"آج ہمارے نصیب میں ناکامی لکھی ہوئی ہے۔ سلمان کی سو کولڈ وائف بھی ہمارے ہاتھ نہیں لگی۔"

"اور اب بھی کوئی ہمارے ہاتھ نہیں آئے گی۔ ہم نہتے ہو گئے ہیں۔"

"فی الحال ہمیں موج مستی کے متعلق سوچنا بھی نہیں ہے۔ وہاں سے اپنی کار لے کر گھر جانا ہے اور آئندہ قانون کی گرفت سے بچنے کی تدبیر کرنی ہے۔"

تدبیریں لاکھ کرو۔ تقدیر کے آگے بالآخر بے بس ہونا پڑتا ہے۔ ان دونوں کی پھر شامت آ گئی۔ ایک گلی سے نکل کر مین روڈ پر آتے ہی اچانک ایک شخص دوڑتا ہوا بیچ سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک ریوالور دبا ہوا تھا اور اس کا رخ ان کی طرف تھا۔ اگر وہ گاڑی آگے بڑھاتے تو اس سے پہلے ہی وہ فائر کر کے کئی گولیاں چلا دیتا۔ وہ حرام موت مرنا نہیں چاہتے تھے۔ کامی نے اچانک ہی بریک لگا کر گاڑی روک دی۔

اب ایک نئی مصیبت آ گئی تھی۔ پتہ نہیں وہ صرف دھمکیاں دینے والا تھا یا انہیں موت کے گھاٹ اتار کر ان کی کار لے جانے والا تھا؟

وکی نے چیخ کر کہا۔ "فائر نہ کرنا۔ ہم کار سے اتر کر دور چلے جائیں گے۔ تم اسے لے جا سکتے ہو۔"

کامی نے کہا۔ "ہاں۔ اگر تم کہیں جانا چاہتے ہو تو ہم تمہیں لے جائیں گے۔ ہمارے پاس ہتھیار نہیں ہیں۔ ہم خود مصیبت کے مارے ہیں۔ تمہارے لئے مصیبت نہیں بنیں گے۔"

وہ بڑے خوفناک انداز میں انہیں نشانے پر رکھتے ہوئے کار کے قریب آ رہا تھا۔ اس کے شانے پر ایک بہت ہی وزنی بیگ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے کار کی اسٹیرنگ سیٹ کے قریب آ کر انہیں دیکھا۔ پھر کہا۔ "میں پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ رہا ہوں۔ خبردار! ہوشیاری نہ دکھانا۔ اچانک کار اسٹارٹ کر کے نہ جانا۔ میرا نشانہ کبھی نہیں چوکتا۔ میں گاڑی

کے وہیل پنکچر کردوں گا تو آگے نہیں جاسکو گے۔"

وہ دونوں چپ چاپ ہاتھ اٹھا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کار کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ پھر دروازے کو بند کرتے ہوئے بولا۔ "گاڑی چلاؤ۔ مجھے جیل تک جانا ہے۔"

انہوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر کامی نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے عقب نما آئینے میں اس پر نظر ڈالی۔ پریشان ہو کر پوچھا۔ "تم...تم جیل جانا چاہتے ہو؟"

وہ ڈپٹ کر بولا۔ "ہاں۔ کہہ جو دیا۔ کیا بہرے ہو؟ اب کوئی سوال نہ کرنا۔ چپ چاپ چلو۔"

وکی نے کہا۔ "برادر! تم دیکھ رہے ہو' ہم نہتے ہیں اور بزدل بھی ہیں۔ لڑنا جھگڑنا نہیں جانتے۔ پلیز ہم سے باتیں کرو۔"

کامی نے کار کی رفتار دھیمی رکھی تھی۔ وہ بولا۔ "اگر ہم سے بات نہیں کرو گے تو یہ گاڑی جیل تک نہیں جاسکے گی۔ ہم تو تمہارے ہاتھوں مریں گے مگر تم بھی یہیں رہ جاؤ گے۔"

وہ گرج کر بولا۔ "بکواس مت کرو۔ یہ گاڑی وہاں تک کیوں نہیں جاسکے گی؟"

"اس لئے کہ اس میں پیٹرول نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہم تمہیں جیل تک پہنچا سکتے ہیں۔"

وہ غصے سے بولا۔ "یہ کیا بدمعاشی والی باتیں کررہے ہو؟ پیٹرول نہیں ہے تو مجھے وہاں تک کیسے پہنچاؤ گے؟"

"ہماری دوسری گاڑی ڈولفن ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑی ہے۔ ہم اس کے ذریعہ تمہیں کہیں بھی پہنچا سکتے ہیں۔"

"میں کیسے مان لوں' تم سچ بول رہے ہو؟"

وہ ریوالور کی نال کامی کی گردن سے لگاتے ہوئے بولا۔ "سچ بولو۔ کیا اس کا پیٹرول ختم ہورہا ہے؟"

اس نے کہا۔ "سامنے ڈیش بورڈ پر دیکھ رہے ہو۔ فیول کی مقدار بتانے والا کانٹا صفر پر ہے۔ ہم جھوٹ بول کر تمہارے ہاتھوں مرنا نہیں چاہیں گے۔"

اس نے ڈیش بورڈ کی طرف دیکھا۔ واقعی ایندھن کی مقدار بتانے والا کانٹا صفر پر تھا۔ جبکہ ٹنکی فل تھی۔ وہ کانٹا ناکارہ ہوچکا تھا۔ کام نہیں کررہا تھا۔ اجنبی دھوکا کھا گیا۔ اس نے کہا۔ "پورا شہر بند پڑا ہے۔ وہ ڈولفن ریسٹورنٹ بھی بند ہوگا۔ تمہاری دوسری گاڑی وہاں کیسے پہنچ گئی؟"

"ہمارا ڈرائیور اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ اس نے ہمیں فون پر اطلاع دی ہے کہ ہم وہاں سے گاڑی لے آئیں۔"

"اچھی بات ہے۔ چلتے رہو۔ مگر یاد رکھو! مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو دوسری سانس لینے کا موقع نہیں ملے گا۔ خواہ مخواہ اپنی جان سے جاؤ گے۔"

کامی نے اطمینان کی سانس لی۔ تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا اس ہوٹل کی طرف جانے لگا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شائد وہاں پہنچ کر اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر کرسکے گا۔ اگر کچھ نہ کرسکا' تب بھی اپنی تیس لاکھ کی گاڑی حاصل کرلے گا۔ پھر اس اجنبی کو جیل پہنچا کر خیریت سے اپنے گھر پہنچ سکے گا۔

اس نے کہا۔ "برادر! ہماری بات کا برا نہ مانو تو اتنا بتا دو' جیل کیوں جارہے ہو؟ ہم وہاں کسی مصیبت میں تو نہیں پھنسیں گے؟"

"اگر کوئی چالاکی نہیں دکھاؤ گے' مجھے دھوکہ نہیں دو گے تو زندہ سلامت رہو گے اور اپنے اپنے گھر واپس جاسکو گے۔ اس سے آگے کوئی بات نہ کرو۔"

اس کا نام شرف الدین تھا۔ شرفو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بچپن سے پٹاخے پھوڑنے اور کھلونا بندوق چلانے کی عادت تھی۔ جوانی میں سچ مچ کی بندوقیں چلانے لگا۔ اب تک اٹھائیس قتل کرچکا تھا۔ سال چھ ماہ میں جیل جاتا تھا پھر چھوٹ کر واپس آجاتا تھا۔

تعزیراتی قوانین کی ایک دہشت ہوتی ہے۔ مجرموں کو صرف لات جوتے نہیں مارے جاتے۔ بلکہ ٹارچر سیل میں تھرڈ ڈگری کی اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں۔ کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ پھانسی پر لٹکایا جاتا ہے۔ یہ ایسی دہشت ہے کہ کوئی بھی امن وامان سے زندگی گزارنے والا شریف آدمی جرم کرنے کی جرات نہیں کرتا۔

لیکن پیشہ ور مجرموں کی دہشت ایسی طاری ہوتی ہے کہ تعزیراتی قوانین نافذ

کرنے والے بھی اپنی پناہ گاہوں میں چھپ کر رہ جاتے ہیں اور پورے شہر کو تخریب کاروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔

شام کو محترمہ کی شہادت کے بعد ہی فضا پہلے سوگوار ہوئی پھر ایسا لگا' جیسے عوام کا غم و غصہ بڑھتا جا رہا ہے اور وہ انتقامی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ جبکہ عوام میں انتقامی کارروائی کرنے کی صلاحیت ہوتی تو وہ پہلے ہی لیاقت علی خان کے قتل کے سلسلے میں بہت کچھ کر چکے ہوتے اور ہمارا ملک ہمیشہ بیدار رہنے والے عوام کا وطن کہلاتا۔

سیدھی سی بات ہے' جن کے دلوں پر صدمات گزرتے ہیں۔ وہ اپنا ماتم کرتے ہیں' اپنے کپڑے پھاڑتے ہیں۔ دوسروں کے گھر نہیں جلاتے۔ دوسروں کا گھر جلانے اور بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والے کوئی اور تھے۔ ان کی شرپسندی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پیشہ ور مجرم ہیں۔ ان کی دہشت سے قانون کے محافظ روپوش ہو گئے تھے۔ گویا قانون سے کھیلنے والوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی تھی۔

شرف الدین عرف شرفو جیل میں سزا کاٹ رہا تھا۔ اس جیسے درجنوں مہارت رکھنے والے مجرم نہ جانے کیسے جیل کی چار دیواری سے باہر آ گئے تھے؟

شرفو نے اپنے جیل کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اچھی خاصی وارداتیں کی تھیں۔ سب ہی نے خوب مال لوٹا تھا۔ اس کے پاس جو بیگ تھا۔ اس میں کرنسی نوٹ اور سونے کے زیورات بھرے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھی مختلف علاقوں میں وارداتیں کرتے پھر رہے تھے۔ وہ رات گیارہ بجے اپنے گھر آ گیا۔ دو چار گھنٹے اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ گزار کر واپس جانا چاہتا تھا۔

اس نے گھر آ کر دروازے پر دستک دی۔ بیوی نے دروازہ کھول کر اسے دیکھا تو خوشی سے کھل گئی۔ ایکدم سے لپٹ کر بولی۔ ''تم اچانک کیسے چلے آئے؟ کیا تمہاری سزا ختم ہو چکی ہے؟''

اس نے دروازے کو اندر سے بند کر کے بیوی کو جی بھر کر پیار کیا۔ پھر دوسرے کمرے میں آ کر بچے کو دیکھا۔ وہ چار برس کا تھا۔ گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ پاس بیٹھ کر اس کے سر کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''اسے سونے دو۔ جاگے گا تو مجھے دیکھ کر خوش ہوگا۔ مگر میرے

جاتے ہی رونے لگے گا۔''

بیوی نے پوچھا۔ ''کیا ابھی واپس چلے جاؤ گے؟''

''ہاں۔ بس صبح تک کے لئے موقع مل گیا ہے۔ میرا دل خوش کر دے پھر چلا جاؤں گا۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے۔ میں ماں بننے والی ہوں۔''

وہ ایکدم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ''تو ماں کیسے بن رہی ہے؟ میں تو جیل میں تھا؟''

''کیسی باتیں کرتے ہو؟ میں ایک ایک دن کا حساب رکھتی ہوں۔ تم دو ماہ بیس دن پہلے جیل گئے تھے۔ دوسرے ہی دن آثار پیدا ہوئے میں نے دائی ماں کو بلایا۔ اس نے میرا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ میں پھر تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔''

وہ اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا مجھے الو بننے والا مرد سمجھتی ہے؟ پہلے بھی جب میں سزا کاٹ کر باہر آیا تھا تو تیری گود میں یہ پہلا بچہ کھیل رہا تھا۔ ایک سال کی سزا کاٹ کر آیا تھا مجھے اچھی طرح حساب نہ مل سکا کہ بچہ کس کا ہے؟ اس بار بھی سال چھ مہینے کی سزا کاٹ کر آتا تو یہی کہتی کہ دوسرا بچہ بھی میرا ہی ہے۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''خدا کے لئے مجھے جتنا مارنا ہے مارو مگر ایسا شرمناک الزام نہ لگاؤ۔''

اس نے ایک زور کی لات ماری۔ ''سالی! سچ سچ بتا... یہاں کون آتا ہے؟''

''تم جانتے ہو' میرے میکے میں ماں بہنیں ہیں' ابا اور بھائی جان ہیں۔ ان کے سوا نہ کوئی یہاں آتا ہے' نہ میں کسی سے تعلق رکھتی ہوں۔''

''میکے والے تیرے ساتھ دن رات نہیں رہتے۔ کیا میں الو کا پٹھا ہوں کہ کچھ سمجھ نہیں پاؤں گا؟ جب بھی جیل جاتا ہوں' پیٹ نکال کر بیٹھ جاتی ہے۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں کیا کروں؟ جیل تو تمہارا گھر ہو گیا ہے۔ ہر سال یا چھ مہینے بعد چلے جاتے ہو۔ ان بچوں کا حساب کیسے دوں؟ دنیا کی کوئی عورت اپنے مجرم شوہر کو بچوں کا حساب نہیں دے پاتی ہوگی۔''

وہ لات کھانے کے بعد فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اسے ٹھوکر مار کر ریوالور

نکالتے ہوئے پوچھا۔ ''سچ بتا یہ کس کا بچہ ہے؟''

وہ تڑپ کر بولی۔ 'تمہارا ہے۔ خدا رسول ﷺ کی قسم! یہ تمہارا ہے۔''

وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''میں بالکل گدھا ہوں۔ اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ ڈکیتی اور قتل کے جرم میں پکڑا جاتا ہوں تو کبھی اقبال جرم نہیں کرتا۔ ہمیشہ خود کو بے گناہ کہتا ہوں۔ سالی! تُو بھی یہی کر رہی ہے۔ میں قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہوں۔ وہاں خدا رسول کی قسمیں کھاتا ہوں۔ عدالت میں کلام پاک اٹھا کر کہتا ہوں' جو کہوں سچ کہوں گا سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا اور ہمیشہ جھوٹ بولتا ہوں۔ تُو بھی سالی مجھ سے جھوٹ بول رہی ہے۔''

وہ جھوٹا تھا۔ کبھی اس کی سچائی پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بیوی کے پیٹ کو دیکھا پھر وہاں گولی ماردی۔ بچہ گہری نیند میں تھا۔ کسمسانے لگا۔ وہ اپنا بیگ اٹھا کر وہاں سے باہر چلا آیا۔ بچے سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے اس یقین کے ساتھ بیوی کو گولی ماری تھی کہ وہ اس کے گھر میں ناجائز بچے پیدا کرتی ہے۔

اگر پیدائش سے پہلے ناجائز ہونے کا حساب نہ کیا جائے تو اس ملک میں ستر فیصد افراد پیدا ہونے کے بعد ناجائز ہو جاتے ہیں' جھوٹ بولتے ہیں' ڈاکے ڈالتے ہیں' قتل کرتے ہیں' اپنے دین کی نفی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا وجود جائز نہیں ہوتا۔ دیکھا جائے تو اس ملک کے امن پسند شہری ایسے کروڑوں ناجائز لوگوں کے درمیان زندگی گزار رہے ہیں۔

☆☆☆

اریمہ اور سجاد ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے بیزار ہو گئے تھے۔ وہ ہوٹل بھی بند ہو چکا تھا۔ وہاں کے مالک نے ان کی وجہ سے ایک لائٹ آن رکھی تھی اور دروازے کو ذرا سا کھلا چھوڑ دیا تھا۔ سجاد نے ایک ملازم کو پانچ سو روپے دیتے ہوئے کہا۔ ''کہیں سے ایک ٹیکسی پکڑ کر لے آؤ۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔''

وہ پانچ سو روپے کی خاطر اپنی سائیکل پر دور تک گیا تھا۔ پھر ایک گھنٹے بعد واپس آ کر بولا۔ ''ٹیکسی یا رکشہ تو دور کی بات ہے۔ کوئی گدھا گاڑی بھی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔''

ٹی وی کے ذریعے خبروں میں بتایا گیا تھا کہ تین دنوں تک سوگ منایا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تین دنوں تک کوئی گاڑی سڑک پر نظر نہیں آئے گی۔ قانون سے

کھیلنے والوں کو کھلی چھٹی ملتی رہے گی۔

اریمہ نے کہا۔ ''میری وجہ سے آپ بری طرح پھنس گئے ہیں۔ آپ کے ممی اور ڈیڈی پریشان ہوں گے۔ ان سے رابطہ تو کریں۔''

''میں رابطہ کروں گا۔ انہیں میری پریشانی کا علم ہو گا تو ڈیڈ گاڑی لے کر یہاں چلے آئیں گے۔ میں نہیں چاہتا' وہ ایسے وقت گھر سے نکلیں۔''

اریمہ نے رونے کا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''جی چاہتا ہے' رونا شروع کر دوں۔ اگر تین دنوں تک سوگ منایا گیا اور ہڑتال رہی تو ہم کہاں جائیں گے؟ کیا کریں گے؟''

''دن نکلے گا تو گھر تک پہنچنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔''

ایسے ہی وقت کامی اس کی گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ وکی نے پیچھے بیٹھے ہوئے شرفو سے کہا۔ ''وہ دیکھو! ہماری کار وہاں کھڑی ہے۔ ہم اس میں جائیں گے۔''

وہ بولا۔ ''تو پھر اسے فوراً روکو اور اُس میں چلو۔''

کامی نے کہا۔ ''ہر کام فوراً ہی نہیں ہو جاتا۔ ہماری اُس گاڑی کی ٹنکی خالی ہے۔ پہلے پیٹرول ڈالیں گے' پھر چلیں گے۔''

شرفو نے غصے سے کہا۔ ''تم لوگ مجھے بیوقوف بنا رہے ہو۔ ابھی تو کہا تھا' اِس گاڑی کی ٹنکی خالی ہے؟''

''جھوٹ نہیں کہا تھا۔ اِس کی ڈکی میں پیٹرول سے بھرا ہوا ایک کین رکھا ہے۔ ہم اسے اپنی گاڑی میں استعمال کریں گے۔''

وہ جھنجلا کر بولا۔ ''تم لوگ مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لئے ہیرا پھیری کر رہے ہو۔ فوراً اترو اور اُس میں پیٹرول ڈالو۔ اگر ذرا بھی چالاکی دکھاؤ گے تو میں گولی چلا دوں گا۔''

وہ دونوں اس کے ساتھ باہر آ گئے۔ ڈکی کھول کر پیٹرول کا کین نکالنے لگے۔ وکی نے شرفو سے کہا۔ ''برادر! اب ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔ ہم سچ بات بتا رہے ہیں۔ اس گاڑی کی ٹنکی فل ہے۔ تم اسے لے جا سکتے ہو۔ کوئی تمہیں نہیں روکے گا۔''

شرفو نے کہا۔ ''تم دونوں گدھے ہو۔ اتنا نہیں سمجھ رہے ہو کہ مجھے گاڑی چلانی آتی۔ اگر آتی تو وہیں تم دونوں کو گولی مار کر اسے لے جاتا۔''

ایک ملازم ہوٹل کے دروازے سے باہر چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ یہ دیکھ رہا تھا کہ ایک شخص کے ہاتھ میں ریوالور ہے اور دو افراد اس کے سامنے بھیگی بلی بنے ہوئے ہیں۔

وہ چارپائی سے اتر کر زمین پر رینگتا ہوا ہوٹل کے اندر آیا پھر سجاد سے بولا۔ ”آپ کی گاڑی آگئی ہے۔ مگر کچھ گڑبڑ ہے۔“

وہ بتانے لگا کہ باہر کیا ہو رہا ہے؟ سجاد نے اریبہ سے کہا۔ ”تم یہاں بیٹھی رہو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

وہ ریوالور نکال کر زمین پر جھک گیا۔ وہاں سے انہیں دیکھنے لگا۔ شرفو ان سے کہہ رہا تھا۔ ”اپنی گاڑی کی ٹنکی بعد میں فل کرنا۔ پہلے مجھے اسی کار میں لے چلو۔ دیر ہو رہی ہے۔ مجھے صبح سے پہلے وہاں پہنچنا ہے۔“

کامی نے کہا۔ ”ہم پانچ منٹ کے اندر اپنی گاڑی میں پیٹرول بھریں گے اور تمہیں لے چلیں گے۔“

”بکواس مت کرو۔ تم لوگ مجھ سے بچ نکلنے کے لئے یا کسی طرح مجھے مار ڈالنے کے لئے بہانے بنا رہے ہو۔“

پھر وہ کامی کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ ”ابھی چلتے ہو یا گولی ماروں؟“

وہ ایکدم سے گھبرا کر بولا۔ ”چلتا ہوں۔ ابھی چل رہا ہوں۔“

وکی نے کہا۔ ”کامی! تم اسے لے جاؤ۔ میں اپنی گاڑی میں پیٹرول ڈال کر تمہارے پیچھے آتا ہوں۔“

کامی نے کہا۔ ”زیادہ چالاک نہ بنو۔ مجھے اس مجرم کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگنا چاہتے ہو؟ نہیں۔ تمہیں میرے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔“

شرفو نے کہا۔ ”مجھے تم دونوں کی بحث سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے صرف ایک ڈرائیور کی ضرورت ہے۔“

یہ کہتے ہی اس نے وکی کو گولی ماردی۔ کامی نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے نہ مارنا۔ میں۔ میں تمہارا ڈرائیور بن کر رہوں گا۔ ابھی لے چلتا ہوں آؤ.....!“

سجاد کی گاڑی پھر ہاتھ سے نکلنے والی تھی۔ اب وہ کسی طرح کے نقصان کا متحمل

نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے وہیں سے شرفو کا نشانہ لیا۔ وہ لوگ دس گز کے فاصلے پر تھے۔ نشانہ چوک نہیں سکتا تھا۔ ٹریگر کو دباتے ہی گولی شرفو کو جا کر لگی۔ وہ ایکدم سے چیخ مارتا ہوا لڑکھڑاتا ہوا پیچھے گیا۔ پھر زمین پر گر پڑا۔

اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا تھا۔ کامی نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اس ریوالور کو اٹھانا چاہا۔ سجاد نے دوسری گولی چلائی۔ کامی ایکدم سے اچھل کر دور چلا گیا۔ پھر وہ ان کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ”ریوالور کو اٹھانا چاہو گے تو حرام موت مرو گے۔“

اس نے آگے جھک کر شرفو کے ریوالور کو اٹھا لیا۔ وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ کامی نے سجاد سے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے گولی نہ مارنا۔ ہم تمہاری گاڑی لے گئے تھے۔ مگر دیکھو ٹنکی فل کر دی ہے۔ یہ بالکل صحیح سلامت ہے۔ پلیز مجھے جانے دو۔“

سجاد نے کہا۔ ”میں خواہ مخواہ تمہاری جان نہیں لوں گا۔ تم جا سکتے ہو۔“

وہ فوراً ہی پیٹرول کا کین اٹھا کر اپنی کار کی طرف چلا گیا۔ سجاد نے اریبہ کو آواز دی۔ وہ ہوٹل سے باہر آگئی۔ پھر شرفو کی لاش کو دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولی۔ ”یا خدا! کیا آپ نے اسے مار ڈالا ہے؟“

وہ بولا۔ ”بہت مجبوری تھی۔ اسے نہ مارتا تو یہ مجھے اور اُس شخص کو مار ڈالتا۔ ہم گناہوں کی نگری میں سانسیں لے رہے ہیں۔ یہاں درندوں کو موت کے گھاٹ اتارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔“

کامی نے اپنی کار میں پیٹرول ڈالتے ہوئے کہا۔ ”برادر! تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ شخص جیل سے نکل کر واردات کرنے آیا ہے۔ اس کی طرح پتہ نہیں اور کتنے پیشہ ور قیدی فرار ہو چکے ہیں اور شہر میں تخریبی کارروائیاں کرتے پھر رہے ہیں؟ جاؤ... جتنی جلدی ہو سکے اپنے گھر پہنچنے کی کوشش کرو۔“

وہ دونوں کار کی اگلی سیٹوں پر آگئے۔ سجاد نے اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھایا۔ اریبہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے آیتیں پڑھنے لگی۔ سجاد نے فون کے ذریعے اپنی مام اور ڈیڈ سے رابطہ کیا۔ پھر کہا۔ ”آپ میری وجہ سے اب تک جاگ رہے ہیں۔ پلیز۔ سو جائیں۔ میں جلد ہی آنے کی کوشش کروں گا۔ خدا کے فضل و کرم سے بخیریت ہوں۔ پریشانی

کوئی بات نہیں ہے۔"

باپ نے پوچھا۔"بیٹا! جب کوئی پریشانی نہیں ہے تو آنے میں دیر کیوں کر رہے ہو؟"

"ڈیڈ! پہلے میں اریبہ کو گھر لانے والا تھا۔لیکن اچانک ہی اس کے گھر میں ٹریجڈی ہوگئی ہے۔اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ابھی اسے وہاں پہنچانا ضروری ہے۔میں صبح تک واپس آسکوں گا۔"

اس کی ماں نے کہا۔"بیٹے! سرجانی ٹاؤن بہت دور ہے۔تم اتنی دور جانے کا رسک نہ لو۔اس لڑکی کو یہاں لے آؤ۔ہمارا ڈرائیور اسے وہاں پہنچادے گا۔"

اس نے اریبہ کو دیکھا۔پھر کہا۔"او کے۔میں آپ کی بات سے انکار نہیں کروں گا۔اریبہ کے ساتھ آرہا ہوں۔مگر حالات ایسے ہیں کہ ہماری مرضی کہیں چل نہیں سکتی۔جس راستے سے جانا چاہتے ہیں۔وہ اچانک ہی بند ہوجاتا ہے۔ہم ادھر سے ادھر بھٹک رہے ہیں۔راستہ اریبہ کے گھر کا ہو یا میرے گھر کا.....جو بھی آسان ہوگا' وہاں سے گزرتا ہوا چلا آؤں گا۔آپ میری فکر نہ کریں۔انشاءاللہ جلد ہی آپ کے پاس پہنچوں گا۔"

اس نے رابطہ ختم کردیا۔وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔وہ بولا۔"مام اور ڈیڈ چاہتے ہیں' میں اتنی دور سرجانی نہ جاؤں۔تمہیں گھر لے آؤں۔پھر ہمارا ڈرائیور تمہیں وہاں پہنچادے گا۔"

"ماں باپ کے دلی جذبات کو سمجھنا چاہئے۔آپ یہی کریں۔مجھے اپنے گھر لے چلیں۔میں وہاں سے ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

وہ بولا۔"ماں باپ گھر میں ہیں اور یہاں ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔تم اپنے اور میرے دلی جذبات کی بات کرو۔کیا مجھ سے بچھڑ جانا چاہتی ہو؟"

"ہم بچھڑنے کے بعد پھر کسی دن مل سکتے ہیں۔"

"ابھی ....ان لمحات کی بات کرو۔کیا تمہارا جی چاہتا ہے' میں تم سے دور ہوجاؤں؟"

وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔خاموشی سے سر جھکالیا۔سجاد نے ونڈ اسکرین کے پار

دیکھتے ہوئے کہا۔"میرا دل ایسا نہیں چاہتا۔قدرت کو بھی یہی منظور ہے۔شاید اسی لئے ہماری گاڑی چھن گئی تھی اور ہم تقریباً تین گھنٹے تک ہوٹل میں بیٹھے رہے۔ذرا سوچو! آج رات تقریباً سات بجے سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔تقدیر ہمیں ادھر سے ادھر لئے پھر رہی ہے۔"

وہ بولی۔"پھر بھی ہر کہانی کا ایک انجام ہوتا ہے۔ملنے والے کبھی عارضی طور پر بچھڑ جاتے ہیں اور کبھی دائمی جدائی ہوجاتی ہے۔گھر پہنچ کر ہمیں جدا ہونا ہی ہے۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ آگے چل کر کیا ہونے والا ہے اور کیا نہیں ہونے والا؟ سب ہی اپنی اپنی زندگی میں بہت کچھ سوچتے ہیں۔لیکن اچانک ہی سوچ کے خلاف کوئی ایسی بات ہوجاتی ہے کہ ہم حیران رہ جاتے ہیں۔"

اریبہ نے دل ہی دل میں تسلیم کرتے ہوئے بے اختیار دعا مانگی۔"اللہ کرے... کچھ ایسا ہوجائے' میں سجاد سے کبھی جدا نہ ہو پاؤں۔"

لڑکیاں شائد اسی ایک گھڑی کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔اس گھڑی کوئی آئے تو پھر وہ ساری عمر اسی کے ساتھ جوانی کی رُت میں بھیگتی رہیں۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔"کاش! ہمارے درمیان کوئی ایسی گرہ پڑجائے' جسے دانتوں سے کھولنا چاہیں تب بھی نہ کھلے۔"

سجاد اسے کن اکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔اس نے پوچھا۔"یہ ٹھنڈی سانس کیوں لے رہی ہو؟" اس نے چونک کر اسے دیکھا۔پھر کہا۔"آپ بہت اچھے ہیں۔میری خاطر اس شہر کے آخری سرے تک جارہے ہیں۔پلیز میری بات مانیں۔ماں باپ کا دل رکھیں۔پہلے مجھے اپنے گھر لے چلیں۔میں ڈرائیور کے ساتھ....."

وہ بات کاٹتے ہوئے بولا۔"راستے میں کوئی نہ کوئی ٹیکسی مل جائے گی۔میں اسے ہزار روپے دوں گا تو وہ بھی تمہیں لے جائے گا۔ہمارا ڈرائیور بھی تنخواہ دار ہے۔مجبور ہے۔وہ خطرہ مول لے کر تمہیں وہاں پہنچانے جائے گا۔"

وہ اریبہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔"انسان یا تو پیٹ سے مجبور ہوتا ہے یا دل سے...وہ ڈرائیور پیٹ سے مجبور ہوکر تمہیں لے جائے گا اور میں دل سے مجبور ہوکر تمہارے ساتھ چلنا

چاہتا ہوں۔ پیٹ کی مجبوری پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ دل کی مجبوری جوانی سے شروع ہوتی ہے اور یہ مجبوری پہلی بار مجھے گدگدا رہی ہے۔ مسرتوں سے مالا مال کر رہی ہے۔ کیا ڈرائیور کے ساتھ جا کر مجھ سے میری مسرتیں چھین لینا چاہتی ہو؟''

اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ مسرتوں سے سرشار ہو گئی۔ سر جھکا کر بولی۔ ''آپ مجھے جہاں لے جانا چاہتے ہیں' لے جائیں۔ میں کچھ نہیں بولوں گی۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''آج پہلی بار معلوم ہو رہا ہے' ایک محبت کرنے والی لڑکی اپنے آپ کو ہمارے حوالے کرتی ہے تو دل کا موسم اچانک ہی بدل جاتا ہے۔ دنیا سر سبز و شاداب ہو جاتی ہے۔''

وہ اس کی باتیں سن رہی تھی اور نہال ہو رہی تھی۔ دل اندر ہی اندر گنگنا رہا تھا۔

''میں نے اپنی محبت سپرد کی ہے تجھے
سو دیکھ! میری امانت سنبھال کے رکھنا
اسے بہار کی نرم ہاتھوں نے پالا ہے
سو اس کو گرم ہوا سے بچا کے رکھنا....''

وہ ڈرائیو کرتے ہوئے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا۔ ''زندگی اچانک کتنی خوبصورت ہو جاتی ہے۔ آج قیامت کی اندھیری رات ہے۔ ہمارے آگے پیچھے' دائیں بائیں بلائیں منڈلا رہی ہیں۔ اس کے باوجود دلوں میں پھول کھل رہے ہیں۔''

''مجھے بھی ایسی خوشی کبھی نہیں ملی' جیسی آج مل رہی ہے۔ آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

''ہاں۔ ضرور کہو۔ دل کی بات زبان پر لاؤ۔''

وہ بولی۔ ''میں پروین شاکر کو بہت پڑھتی ہوں۔ وہ شاعرہ میرے دل کی زبان سے بول رہی ہے۔

تیرے آئینہ فن میں
سراپا دیکھ کر اپنا

بہت حیران ہوں
اور بارہا پلکیں جھپکتی ہوں
کہ یہ میں ہوں
(یا کوئی اور لڑکی ہے)
میری آنکھوں میں پہلے بھی شرارت تھی
مگر اب تو ستارے جھلملاتے ہیں
میرے لب اس سے پہلے بھی تبسم آشنا تھے
لیکن اب تو بے ضرورت مسکراتے ہیں
میں اس کی خوش نما آنکھوں سے
دنیا دیکھتی ہوں
مسکرا کر سوچتی ہوں
زمیں یک لخت کتنی خوبصورت ہو گئی ہے''

''آہ...!'' سجاد نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ''ہمارے وطن کی زمین کب خوبصورت ہو گی؟''

وہ بولی۔ ''میرا دل کہتا ہے' ضرور خوبصورت ہو گی۔ ہمارے پاکستانی جوان' بوڑھے بچے سب ہی اپنے سینوں میں خوبصورت دل رکھتے ہیں۔ حالات نے انہیں بدگمان کر دیا ہے۔ وہ مجبور ہو گئے ہیں۔ محبت کو بھول کر ضرورت کے پیچھے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''محبت کے بغیر ضرورتیں پوری تو ہو جاتی ہیں۔ مگر ذلیل و خوار کرتی ہیں۔ جیسا کہ آج ہمارا ملک' ہماری پوری قوم دنیا کی نظروں میں تماشہ بن رہی ہے۔''

''ایک عجیب سا خیال آتا ہے کہ جب گناہ اور جرائم بڑھ رہے ہوں۔ رو کے نہ رک رہے ہوں تو ایسے وقت خدا کچھ ایسا کرے کہ ہر بوڑھا ہر جوان اپنی ماں کی گود میں واپس چلا جائے یک لخت اس کی معصومیت واپس آ جائے گی۔ وہ جس زبان سے دودھ کے چٹخارے لے گا' اس زبان سے کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔ ماں کے آنچل میں رہ کر کسی کی

عزت نہیں لوٹے گا۔"

معصومیت ابھی مری نہیں ہے۔ بس گم ہوگئی ہے۔ ہم سب کے لئے ماں کی گود لازمی ہو چکی ہے۔

☆☆☆

بوڑھے ڈرائیور نے اسے بڑی چالاکی سے روک رکھا تھا۔ حماد غصے سے جھنجھلا رہا تھا۔ اچانک ہی اس کی گردن دبوچتے ہوئے بولا۔ "اے بڈھے! یہ تُو کیا چالاکی دکھا رہا ہے؟ ڈھائی گھنٹے گزر چکے ہیں۔ یہ گاڑی چلتی کیوں نہیں....؟"

وہ پھنسی ہوئی آواز میں بولا۔ "گردن تو چھوڑو۔ تب ہی تو جواب دے سکوں گا۔"

وہ گردن چھوڑتے ہوئے بولا۔ "تم نے کہا تھا' گیس ختم ہو چکی ہے۔ دوسرا سلنڈر لگانا ہوگا۔ اب اتنی دیر سے گاڑی کی کونسی خرابیاں دور کر رہے ہو؟ تم ضرور مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔"

"میرے بوڑھے گھٹنوں میں اتنا دم نہیں ہے کہ یونہی شوقیہ کھڑا رہوں۔ دیکھ نہیں رہے ہو' محنت کر رہا ہوں۔ پتہ نہیں' کیا بات ہے' سلنڈر لگا دیا ہے۔ پھر بھی اسٹارٹ نہیں ہوتی؟"

"یہ اچانک خرابی کیسے پیدا ہوگئی؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ ڈرائیور ہوں' مکینک نہیں ہوں۔ جس طرح سمجھ میں آ رہا ہے۔ اسی طرح ٹھیک کرنے کی کوششیں کر رہا ہوں۔"

وہ بے بسی سے بولا۔ "دیکھو! مجھے ہر حال میں اس کیمیکل فیکٹری کو تباہ کرنا ہے۔ اگر ناکامی ہوئی اور میں وہاں تک پہنچ نہ سکا تو تم نہیں بچو گے۔ صبح کی اذان ہوتے ہی میں تمہیں لے مروں گا۔"

گاڑی کا بونٹ اٹھا ہوا تھا۔ وہ انجن پر جھکا ہوا اپنی مصروفیت ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "تم اس طرح ڈراؤ گے تو ذہن کام نہیں کرے گا۔ خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔ مجھے سکون سے سمجھنے دو' یہ خرابی کیسے دور ہوگی؟"

خرابی پہلے کوئی نہیں تھی۔ اس نے خود ہی اپنی ٹیکسی کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ عقل نے

سمجھایا تھا' حماد سے پیچھا نہ چھڑا سکا تو اس کے ساتھ اسی جگہ اپنی جان دے دے گا۔ مگر اسے فیکٹری کی طرف جانے نہیں دے گا اور نہ ہی کسی رہائشی علاقے میں خودکش دھماکہ کرنے دے گا۔

یہ بھی امید تھی کہ ادھر سے کوئی گاڑی گزرے گی تو وہ گاڑی والے شائد اس کی کوئی مدد کر سکیں گے۔ اگر نہ کر سکے اور حماد نے خطرہ محسوس کیا تو وہ اپنے ساتھ سب کو لے مرے گا۔ قصہ وہیں تمام ہو جائے تو اچھا ہے۔ اس چوراہے کے آس پاس جو عمارتیں تھیں۔ وہ کافی فاصلے پر تھیں۔ انہیں کم سے کم نقصان پہنچ سکتا تھا۔ وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر اسے الجھا رہا تھا۔

دوسری طرف حماد بھی کسی گاڑی کا منتظر تھا۔ سوچ رہا تھا' ادھر سے گزرنے والی کسی بھی گاڑی سے لفٹ لے کر اسے یرغمال بنائے گا۔ پھر اپنے ٹارگٹ کی طرف لے جائے گا۔ اس لئے وہ بڑے صبر و تحمل سے ٹیکسی کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس طرف کوئی گاڑی نہیں آئی تھی۔ چند گاڑیاں دور سے گزرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ لیکن وہ اس راستے پر آنے کے بجائے دوسری طرف مڑتی چلی گئی تھیں۔

بوڑھے ڈرائیور نے کہا۔ "ایک ہی راستہ ہے۔ میں اپنی گاڑی درست کر رہا ہوں۔ تم اُس چوراہے پر چلے جاؤ۔ ادھر سے اب تک کئی گاڑیاں گزر چکی ہیں۔ تمہیں کسی نہ کسی گاڑی میں لفٹ مل ہی جائے گی۔"

وہ بولا۔ "میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں کہ تمہیں چھوڑ کر ادھر جاؤں اور ادھر تم گاڑی ٹھیک کر کے فرار ہو جاؤ...."

"مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں بھاگوں گا۔ اس لئے کہ میری گاڑی میرا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔"

وہ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ معلم اعلیٰ نے جو ہدایت دی تھی' اُس کے مطابق اسے ہر حال میں فیکٹری کو تباہ کرنا تھا۔ یہ بھی تاکید کی گئی تھی کہ غیر ضروری جگہ خودکش حملہ کر کے اپنی جان پر نہ کھیلا جائے۔ جنت کے دروازے اسی وقت کھلیں گے' جب وہ ٹارگٹ کے

مطابق خودکش حملہ کرے گا۔

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے.....

حماد کا صبر وتحمل کام آیا۔ دور چوراہے سے ایک گاڑی مڑ کر ان کی طرف آ رہی تھی۔ وہ چیخ کر بوڑھے سے بولا۔ ”وہ دیکھو! گاڑی ادھر آ رہی ہے۔ اسے کسی طرح روکو۔“

وہ دوڑتا ہوا بیچ سڑک پر آ گیا۔ ڈرائیور بھی اپنی جان چھڑانے کے لئے اس کے ساتھ آیا۔ دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر گاڑی کو روکنے کا اشارہ کرنے لگے۔ اس میں اریبہ اور سجاد تھے۔

سجاد نے کہا۔ ”تم سنبھل کر بیٹھو۔ اگر وہ دونوں راستے سے نہ ہٹے تو میں انہیں ٹکر مارتا ہوا گزر جاؤں گا۔“

اریبہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ ہماری طرح مجبور ہوں گے۔ انہیں گاڑی نہیں مل رہی ہو گی۔ وہ دیکھیں... شاید ان کی ٹیکسی خراب ہو گئی ہے۔ اس کا بونٹ اٹھا ہوا ہے۔“

”انہوں نے دکھاوے کے لئے بونٹ اٹھایا ہو گا۔ فراڈ ہو سکتا ہے۔ ہم دھوکہ کھا سکتے ہیں۔“

گاڑی ان دونوں کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے ہی وقت ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اریبہ نے حماد کو دیکھا تو ایکدم سے چیخ کر کہا۔ ”گاڑی روکیں سجاد! پلیز۔ گاڑی روکیں۔ یہ دشمن نہیں ہے۔ میرا کزن ہے۔“

گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ سجاد نے زوردار بریک لگائی۔ وہ جیسے چیختی چنگھاڑتی اور احتجاج کرتی ہوئی ان سے ذرا فاصلے پر آ کر رک گئی۔

اریبہ نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”حماد! گھر سے بھاگنے والے بھگوڑے! یہاں کیا کر رہے ہو؟ اور... یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟“

حماد گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی ٹھٹک کر بولا۔ ”اریبہ...؟“

بوڑھے ڈرائیور نے چونک کر اسے دیکھا۔ حماد سفر کے دوران اپنی محبوبہ اریبہ کا ذکر

کرتا رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی ہاتھ اٹھا کر چیختے ہوئے کہا۔ ”بی بی! رک جاؤ۔ اس کے قریب نہ آنا۔ اس نے خودکش جیکٹ پہنی ہوئی ہے۔ یہ پاگل ہے۔ خودکش حملہ آور ہے۔“

سجاد بھی کار سے نکلا ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی آ کر اریبہ کو پکڑ لیا۔ ”رک جاؤ... دیکھو یہ بوڑھا شخص کیا کہہ رہا ہے؟“

اریبہ کو یقین نہیں آیا کہ جو کچھ سن رہی ہے، وہ درست ہے۔ جسے بچپن سے جانتی تھی، اس کے لئے کیسے یقین کر لیتی کہ وہ خودکش حملہ آور بن گیا ہے۔

دوسری طرف حماد اسے وہاں پا کر بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس کی خاطر گھر چھوڑ چکا ہے، اس سے یوں سامنا ہو جائے گا۔ وہ حیرانی سے جھجکتے ہوئے بولا۔ ”تم... تم اتنی رات کو کہاں سے آ رہی ہو؟“

وہ بولی۔ ”یہ بوڑھے بابا کیا کہہ رہے ہیں؟ تم نے خودکش جیکٹ پہنی ہوئی ہے؟“

وہ اسے بڑی بے بسی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یا خدا! تم یہاں کیوں آ گئیں؟“

وہ اس کے سامنے ہمیشہ بڑی بن کر رہتی تھی۔ ڈانٹ کر بولی۔ ”جو پوچھ رہی ہوں، اس کا جواب دو...؟“

جواب تو دینا ہی تھا۔ بات نہ چھپ سکتی تھی، نہ وہ چھپا سکتا تھا۔ نہ وہاں سے جا سکتا تھا۔ وہ اسے کبھی جانے نہ دیتی۔ اس نے بڑی بے بسی سے قمیص کا دامن اوپر اٹھایا۔ اریبہ اور سجاد کے ذہن کو ایک زبردست جھٹکا سا لگا۔ وہ ایکدم سے چونک کر پیچھے ہٹ گئے۔

انہوں نے اخبارات میں اور ٹی وی پر موت کا دھماکا کرنے والی ایسی جیکٹ کی تصویریں دیکھی تھیں۔ اریبہ کو تو آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ حماد اب بھی اس کے لئے بھولا بھالا بے وقوف سا لڑکا تھا۔

سجاد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ”اریبہ! یہاں سے بھاگو.....“

وہ ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر بولی۔ ”نہیں... یہ بچپن سے ایسا ہی بیوقوف ہے۔ الٹی سیدھی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ حرام موت مرنے کے راستے پر نکل پڑے گا۔“

پھراس نے حماد سے پوچھا۔''کیاتم ہمیں مار ڈالو گے؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔اریبہ سے نظریں چرانے لگا۔وہ اس کے قریب آ کر سینہ تان کر بولی۔''تم میرے عاشق ہو ناں؟ میرے ساتھ جینا اور مرنا چاہتے ہو؟ کیا محبت ایسی ہوتی ہے؟ جسے اپنی جان' اپنی زندگی کہا جاتا ہے۔اسے حرام موت مار ڈالا جاتا ہے؟''

وہ اٹک اٹک کر بولا۔''میں۔تمہارے ساتھ مرنے کے لئے نہیں نکلا ہوں۔میں تو شرکے' شیطان کے اور کفر کے خلاف جہاد کر رہا ہوں۔کافروں کو نابود کروں گا تو ہمارے دین اسلام کا بول بالا ہوگا۔میرے لئے جنت کے دروازے کھل گئے ہیں۔یہ دیکھو.....! میرے پاس جنت میں داخل ہونے کی رسید ہے۔''

وہ اپنے گریبان سے شناختی کارڈ جیسی ایک رسید نکال کر اریبہ کو دکھانے لگا۔وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولی۔''یہ کیا مذاق ہے؟ بچوں کو کھلونا دے کر بہلایا جاتا ہے۔تم اس رسید سے بہل رہے ہو؟ پتہ نہیں کیسے فریبی ملاؤں کے ہتھے چڑھ گئے ہو؟ کیا تمہیں آیت الکرسی کی یہ بات یاد نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کوئی کسی کی سفارش نہیں کر سکتا؟ جنت کی یہ رسید تمہارے کسی کام نہیں آئے گی۔''

وہ ذرا توقف سے سر جھٹک کر بولی۔''تم صحیح دینی تعلیم کے بغیر گمراہ ہو گئے ہو۔یہ کیوں نہیں سمجھتے' ہمارے مذہب میں خودکشی حرام ہے؟''

وہ بولا۔''کیا کافروں سے جنگ لڑتے ہوئے شہادت حاصل کرنے والے جنت میں نہیں جاتے؟''

وہ بولی۔''بیوقوف! جب ہم پر جنگ مسلط کی جاتی ہے۔ہمیں اپنی اور اپنے دین کی بقاء کے لئے لڑنے پر مجبور کیا جاتا ہے' تب ہم لڑتے ہیں اور شہید ہوتے ہیں۔تم مسلمانوں کے اس ملک میں کن کافروں کے خلاف مرنے نکلے ہو؟''

''وہی جو یہودیوں سے دوستی کرتے ہیں۔عیسائیوں کے غلام بنتے ہیں اور جو دولتمند عیاش ہوتے ہیں۔عورتوں کو بے حیاء بناتے ہیں۔گناہوں کا بازار گرم کرتے ہیں۔انہیں ہلاک کرنا ایک جہاد ہے۔''

''لعنت ہے تم پر.....اتنا بھی جانتے' ہمارے دین میں گناہ گاروں کو مارنے کا حکم

نہیں ہے۔انہیں ہدایت دینے اور صراط مستقیم کی طرف لانے کا حکم دیا گیا ہے۔''

''مجھے نہ سمجھاؤ اریبہ! تم ہمارے معلم اعلیٰ سے زیادہ دینی معاملات کو نہیں سمجھ سکتیں۔میں تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گا۔مجھے یہاں سے سائٹ کے علاقے میں جانا ہے۔یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ تم اس کے ساتھ کہاں سے آ رہی ہو؟''

پھر وہ سجاد سے بولا۔''تم جو کوئی بھی ہو۔مجھے ایک کیمیکل فیکٹری میں لے چلو۔''

وہ بولی۔''تم کہیں نہیں جاؤ گے۔میرے ساتھ گھر چلو گے۔''

بوڑھے ڈرائیور نے کہا۔''بیٹی! اسے کسی طرح گھر لے جاؤ۔اس کی جیکٹ اتار دو۔یہ اس فیکٹری کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔اس کے معلم نے سمجھایا ہے' تم اسے جنت میں ملو گی۔یہ تمہیں پانے کے لئے ایسا ضرور کرے گا اور اس کے ساتھ ساتھ ہم سب ہی بے موت مارے جائیں گے۔''

سجاد نے ذرا ٹھٹک کر اسے دیکھا۔اریبہ نے حماد سے کہا۔''حالات ہمیں کم پریشان کر رہے ہیں' جواب تم بھی پریشانی کا سبب بن رہے ہو؟ میں اسی دنیا میں تمہارے سامنے ہوں۔تمہارے ساتھ ہوں۔پھر جنت میں جانے کا خواب کیوں دیکھ رہے ہو؟''

وہ بولا۔''تم نے میری محبت کو ٹھکرا دیا ہے۔مجھے کم عمر کہتی ہو۔خود دادی اماں بنتی ہو۔جنت میں ایسا نہیں ہوگا۔یہاں تم نے میرا دل توڑ دیا۔مجھے گھر چھوڑ کر جانا پڑا۔جنت میں ہم کبھی جدا نہیں ہوں گے۔اللہ تعالیٰ کی مرضی کو سمجھو...اُسے یہ منظور ہے کہ تم میرے ساتھ جنت میں جاؤ۔اس لئے یہاں اچانک میرے پاس آ گئی ہو۔''

اریبہ نے سجاد کی طرف دیکھا۔وہ اس بوڑھے ڈرائیور سے کچھ باتیں کر رہا تھا۔وہ بولی۔''حماد! کیا تم میری خوشیاں نہیں چاہتے؟ یہ جو میرے ساتھ ہیں' ان کا نام سجاد ہے۔بڑے بزنس مین ہیں۔ان کے پاس کوٹھیاں ہیں' کاریں ہیں۔یہ میرے لئے اسی دنیا کو جنت بنا رہے ہیں۔کیا تم اس قدر خود غرض ہو کہ مجھ سے یہ جنت چھین لو گے؟''

اس نے سجاد کی طرف دیکھا۔پھر کہا۔''معلم اعلیٰ نے کہا ہے' ہمیں اپنی مرضی سے نہیں' خدا کی مرضی کے مطابق چلنا چاہئے اور اس کی رضا یہی ہے کہ تم میرے ساتھ جنت میں جاؤ گی۔اس سے آگے میں کچھ نہیں جانتا۔''

"ہماری دنیا میں آنے والے کسی بھی پیغمبر نے‘ کسی بھی مذہبی پیشوا نے یہ نہیں کہا کہ اس دنیا کو یا اپنی عاقبت کو جنت بنانے کے لئے دوسروں کی جان لے لو۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ کیا تم مجھے زبردستی مار کر جنت میں لے جاؤ گے؟"

وہ نظریں چرانے لگا۔ اس نے کہا۔ "میری طرف دیکھو! مجھ سے نظریں ملاؤ۔"

وہ انکار میں سر ہلانے لگا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا...؟ کترا کیوں رہے ہو؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "تم ....تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ تمہاری باتیں بھی اچھی لگتی ہیں۔"

"جب باتیں اچھی لگتی ہیں تو کیوں میری بات نہیں مانتے؟"

وہ دوسری طرف گھوم گیا۔ سر جھکا کر بولا۔ "یہ بات اب سمجھ میں آ رہی ہے کہ میں خود غرض ہوں۔ تم کہتی ہو‘ تمہیں اس دنیا میں ہی جنت مل رہی ہے۔ تم اس شخص کو چاہتی ہو۔ یہ بات مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی ہے۔"

وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ منہ پھیر کر ایک ضدی بچے کی طرح بول رہا تھا۔ عقل سمجھا رہی تھی‘ اس کے ساتھ ایک بچے جیسا ہی سلوک کرنا چاہئے۔ اریمہ نے ایک نظر سجاد پر ڈالی۔ پھر حماد کے قریب آ کر کہا۔ "اگر میں اُس سے دور رہوں تو....؟"

اس نے سر گھما کر اسے بے یقینی سے دیکھا۔ وہ بولی۔ "میں تمہیں خوش کرنے کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ ابھی اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ کر آئی ہوں۔ اب تمہارے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھوں گی۔ آؤ... گھر چلو۔"

ادھر سجاد بوڑھے ڈرائیور سے باتیں کرنے کے دوران حماد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس بوڑھے نے کہا۔ "آپ دیکھ رہے ہیں‘ اس کا ایک ہاتھ ہمیشہ قمیص کے اندر اُسی پن پر رہتا ہے۔ وہ پلک جھپکتے ہی اس پن کو ہٹا کر دھماکہ کر سکتا ہے۔"

سجاد پریشان ہو کر سوچنے لگا‘ اگر اسے گولی ماری جاتی تو وہ مرتے مرتے بھی دھماکا کر سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ "کسی بھی بہانے اس کا ہاتھ وہاں سے ہٹا کر اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔"

بوڑھے نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "مشکل ہے۔ یہ کئی گھنٹوں سے میرے ساتھ

ہے اور میں دیکھتا آ رہا ہوں‘ اپنا ہاتھ وہاں سے ہٹاتا نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے‘ اس پن سے چپک کر پیدا ہوا ہے اور اسی کے ساتھ مرے گا۔"

اریمہ نے کہا۔ "سجاد! میں حماد کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھوں گی۔ آپ کار ڈرائیو کریں۔"

حماد نے اریمہ سے پوچھا۔ "یہ ہمیں کیمیکل فیکٹری لے جائے گا ناں؟"

وہ اسے گھور کر بولی۔ "زیادہ نہ بولو۔ میرے ساتھ کار میں بیٹھو۔ وہیں باتیں ہوں گی۔"

بوڑھے نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اریمہ سے کہا۔ "میری ایک جوان بیٹی ہے۔ میں اسے سہاگن بنانے کے لئے راتوں کو بھی ٹیکسی چلاتا ہوں۔ اس کا گھر بسانے تک زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ حماد سے کہو... خدا کے لئے مجھے جانے دے۔ میری بچی انتظار کر رہی ہو گی۔"

اریمہ نے کہا۔ "ٹھیک ہے بابا جی! آپ اپنے گھر جائیں۔"

حماد نے کہا۔ "یہ یہاں سے جاتے ہی پولیس کو ہمارے پیچھے لگا دے گا۔ ہم اس فیکٹری تک پہنچ نہیں پائیں گے۔"

بوڑھے نے اپنے دونوں کانوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی جوان بیٹی کی قسم کھا کر کہتا ہوں‘ کسی سے تمہارا ذکر بھی نہیں کروں گا۔ چپ چاپ گھر چلا جاؤں گا۔"

اریمہ نے حماد کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "میرا حماد بہت اچھا ہے۔ آپ اس سے نہ ڈریں۔ گھر جائیں۔"

وہ اریمہ کے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے تقریباً ایک برس کی جدائی کے بعد اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ ایسا لگ رہا تھا‘ جیسے اچانک ہی پیار کی پناہ گاہ میں چلا آیا ہو۔

وہ بوڑھے کے جانے پر اعتراض نہ کر سکا۔ اریمہ اس کے ساتھ کار کے پچھلی سیٹ پر آ گئی۔ وہ جیسے سحر زدہ سا ہو کر کبھی اسے اور کبھی اس کے ہاتھ کو دیکھتا رہا۔ اس کے لمس کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتا رہا۔

وہ بلا شبہ اس کا دیوانہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی ایک ضدی بچے کی طرح مچل جاتا تھا۔ کار تیز رفتاری سے جا رہی تھی اور وہ بھول گیا تھا کہ اسے کدھر جانا ہے؟ بس وہی ایک

ہاتھ اس کی زندگی کا حاصل تھا۔ وہ جدھر لے جا رہا تھا' ادھر وہ چلا جا رہا تھا۔

اریبہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر اپنا دوپٹہ سنبھالنے لگی۔ پلک جھپکتے یوں لگا' جیسے ساتھ چھوٹ گیا ہو۔ اس کی نظریں پھر اسے طلب کر رہی تھیں۔ اریبہ اس کے مزاج کو اور دیوانگی کو ایک عرصے سے سمجھتی آ رہی تھی۔

وہ سجاد سے بولی۔ ''یہ میرے چچا کا بیٹا ہے۔ میں عمر میں اس سے بڑی ہوں۔ مگر یہ نہیں مانتا۔ بچپن سے ساتھ کھیلتا آیا ہے۔ اب جوان ہو کر مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

سجاد نے پوچھا۔ ''کیا میں حماد سے کچھ باتیں کر سکتا ہوں؟''

اریبہ نے کہا۔ ''نہیں... آپ اسے کچھ نہ کہیں۔ یہ اپنے ماں باپ کی بات نہیں مانتا۔ صرف میری مانتا ہے۔''

پھر وہ حماد سے بولی۔ ''کیوں حماد...؟ تم میری باتیں مانتے ہو ناں؟''

''مجھ سے کیا پوچھتی ہو؟ تم خود جانتی ہو۔ میں نے تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کیا۔ لیکن مجھے یقین دلاؤ' یہ سب خواب تو نہیں ہے؟ تم میرے ساتھ ہو۔ کیا ہمیشہ ساتھ رہو گی؟''

سجاد نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اریبہ! یہ کیسی باتیں کر رہا ہے؟''

وہ بولی۔ ''میں جانتی ہوں' اس کی باتوں سے آپ کو تکلیف پہنچ رہی ہوگی۔''

''کیا تمہیں تکلیف نہیں پہنچ رہی ہے؟''

''اس وقت مجھے بہت بڑی ذمہ داری پوری کرنی ہے۔ صرف اپنی اور آپ کی ہی نہیں' حماد کی بھی جان بچانی ہے۔ اسے دین کا صحیح علم دینا ہے۔ حرام موت سے بچانا ہے۔''

''میں تمہارے انسانی جذبوں کو سمجھ رہا ہوں۔ یہ بھی یقین ہو رہا ہے کہ یہ تمہاری بات مان لے گا۔ خودکشی سے باز آ جائے گا۔ مگر اس کے بعد... اس کے بعد کیا ہوگا؟''

وہ حماد کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ جو چاہے گا' وہی ہوگا۔ میں اسے گھر سے بھاگنے اور گمراہ ہونے کے لئے نہیں چھوڑوں گی۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر سجاد کے فون سے کال بیل سنائی۔ وہ ننھی سی اسکرین کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اریبہ! تمہارے گھر سے کال ہے۔''

اس نے پچھلی سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اریبہ نے فون لے کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو ابو...! آپ یقیناً میرے لئے پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی دوسری طرف سے چچی کی آواز سنائی دی۔ حماد کی ماں ناگواری سے بول رہی تھی۔ ''پریشان ہونے کی تو بات ہے۔ شام سے نہ جانے کس کے ساتھ گل چھرے اڑا رہی ہو؟ کیا گھر کا راستہ بھول گئی ہو؟''

''آپ کو تو مجھ خدا واسطے کا بیر ہے۔ کبھی تو سیدھے منہ بات کر لیا کریں۔''

''کیا بھول گئیں' کبھی میں تمہاری بہت عزت کرتی تھی۔ اپنی بہو بنانا چاہتی تھی۔ مگر تم نے میرے بیٹے میں سو طرح کے عیب نکال دیئے اور چھوٹے بیٹے کو اپنا دیوانہ بنا کر گھر سے بھگا دیا۔''

''فکر نہ کریں۔ ابھی میں آپ کے اسی چھوٹے بیٹے کے ساتھ ہوں اور گھر آ رہی ہوں۔''

وہ ایکدم سے حیران ہو کر بولی۔ ''کیا سچ کہہ رہی ہو؟ میرا احماد مل گیا ہے؟ واپس آ رہا ہے؟ وہ ایک برس سے کہاں تھا؟ اس سے میری بات کراؤ۔''

''ابھی کراتی ہوں۔ پہلے آپ ابو کو فون دیں۔''

وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ''ہاں... وہ... تمہارے ابو گہری نیند میں ہیں۔''

''یہ فون ابو کے پاس رہتا ہے۔ آپ وہاں سے بول رہی ہیں۔ انہیں جاگنا چاہیے۔ وہ بہت کچی نیند سوتے ہیں۔''

''وہ میری آواز نہیں سن رہے ہیں۔''

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟''

وہ پھر ہچکچانے کے انداز میں بولی۔ ''کک۔ کچھ نہیں۔ وہ... بات دراصل یہ ہے کہ میں اس فون کو اپنے فلور پر لے آئی ہوں۔ اپنے کمرے میں بات کر رہی ہوں۔ تم حماد کو فون دو۔''

یہ اطمینان دلانے والی بات تھی کہ باپ گہری نیند سو گیا ہے اور حماد کی ماں اس کا فون اپنے کمرے میں لے آئی ہے۔ اریبہ نے مطمئن ہو کر حماد کی طرف فون بڑھاتے

ہوئے کہا۔ ''اپنی امی سے بات کرو۔''

وہ اسے لے کو کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''ہیلو امی! میں بول رہا ہوں۔''

وہ ایکدم سے خوش ہو کر تقریباً چیختے ہوئے بولی۔ ''میرے بچے! تُو کہاں ہے؟ اس نک چڑھی کے پیار میں پاگل ہو کر گھر سے چلا گیا ہے۔ ایک برس ہو چکا ہے۔ کیا یہ پیدا کرنے والی ماں تجھے یاد نہیں آتی؟''

''میں سب ہی کو یاد کرتا ہوں۔ زندگی کھونے اور پانے کا نام ہے۔ میں نے اریبہ کو کھو دیا تھا۔ اب پھر اسے پا رہا ہوں۔ اس لئے واپس آ رہا ہوں۔''

''کیا یہ تجھ سے راضی ہے؟ شادی کرنے کو تیار ہے؟''

اس نے اریبہ کو دیکھا پھر فون پر کہا۔ ''ہاں۔ شاید میری محبت رنگ لا رہی ہے۔ شاید ایسا ہونے والا ہے۔''

''شاید نہ کہو۔ پورے یقین سے کہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے' اس کی سوتیلی ماں زینت بیگم مر چکی ہے۔ میں نے اریبہ کو ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ اس کا باپ بھی چل بسا ہے۔ تم اسے شادی کے لئے راضی کر لو پھر اس مکان کا اوپر والا حصہ تمہارے نام ہو جائے گا۔''

''آپ نے اریبہ کو یہ بات کیوں نہیں بتائی؟''

اریبہ ذرا ٹھٹھک کر حماد کو دیکھنے لگی۔ ادھر اس کی ماں نے کہا۔ ''بیٹے! میرا دل گھبرا رہا ہے۔ آج ہمارے گھر میں دو موتیں ہو چکی ہیں۔ اریبہ کو پتہ ہے کہ زینت بیگم کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔ لیکن باپ کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی۔ وہ... میں کیا بتاؤں؟ آج کی رات سب ہی کے لئے قیامت کی رات ہے۔ کوئی نہیں جانتا' کون کس وقت بے موت مرنے والا ہے؟ اریبہ کا باپ بھی کیسے مر گیا؟ یہ کوئی جان نہیں پائے گا۔ قانون کی گرفت میں لینے والی پولیس بھی نہیں ہے۔ کل کلاں کو پولیس والے آئیں گے تو یہ نہیں جان پائیں گے کہ کون کیسے مر گیا اور کس نے کس طرح کی واردات کی ہے؟''

حماد نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''آپ سچ سچ بتائیں' تایا ابا کی موت کیسے ہوئی ہے؟''

اریبہ نے ایکدم سے فون کی طرف دیکھتے ہوئے حماد سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ میرے ابو...''

وہ بولا۔ ''ہاں۔ تمہارے لئے بری خبر ہے۔ امی بتا رہی ہیں' وہ وفات پا چکے ہیں۔ میں ان سے یہی معلوم کر رہا ہوں' آخر ان کی موت کیسے ہوگئی؟''

اس نے حماد سے فون چھین کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''چچی جان! ابھی آپ کہہ رہی تھیں' وہ گہری نیند سو رہے ہیں۔ سچ بتائیں' وہ صحیح سلامت ہیں یا نہیں...؟''

''میں نے فون پر بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ سوچا تم آ رہی ہو تو یہاں خود ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگی۔''

اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔ ''انہوں نے مجھ سے فون پر باتیں کی تھیں۔ اس وقت تو وہ بالکل ٹھیک تھے۔''

''ٹھیک کہاں تھے؟ برسوں کے بیمار تھے۔ بستر پر پڑے رہتے تھے۔ آج تو سڑکوں گلیوں میں چلنے پھرنے والے پٹاپٹ مر رہے ہیں۔ ان کا بھی دم نکل گیا ہے۔ میں کیا کروں؟''

وہ ایکدم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سجاد نے کار روک لی۔ پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ حماد اس سے فون لے کر ماں سے کہہ رہا تھا۔ ''کیسی الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہیں؟ میری اریبہ کو رُلا رہی ہیں۔ سچ بتائیں' آپ لوگوں نے کیا کیا ہے؟''

ماں نے کہا۔ ''اے لڑکے! کیا ہمیں ان کا قاتل سمجھ رہا ہے؟''

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''ہاں۔ آپ نے کہا تھا' اریبہ بھائی جان سے شادی کرنے کے لئے راضی نہیں ہے اور مجھ سے عمر میں بڑی ہے۔ اس لئے کترا رہی ہے۔ مگر آپ لوگ اسے باہر شادی نہیں کرنے دیں گے۔ کسی باہر والے کو آ کر مکان کے اوپری حصے کا مالک بننے نہیں دیں گے۔ اگر یہ کسی بھی طرح راضی نہ ہوئی تو اس کے باپ کا گلا گھونٹ کر مار ڈالیں گے۔ کیا آپ نے اور ابو نے ایسا نہیں کہا تھا؟''

وہ ذرا چپ ہوا۔ پھر ہیلو ہیلو بول کر فون کو دیکھنے لگا۔ اریبہ شدید حیرانی سے اس کی باتیں سنتی رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''اُدھر سے فون بند کر دیا گیا ہے۔ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔''

وہ آنچل میں چھپا کر رونے لگی۔ ''یا خدا! یہ کیا ہو رہا ہے؟''

سجاد نے کہا۔ ''اریبہ! حوصلہ کرو۔ خود کو سنبھالو۔ میں جلد سے جلد تمہیں گھر تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

وہ پلٹ کر اپنی سیٹ پر سیدھی طرح بیٹھ گیا۔ پھر کار اسٹارٹ کر کے تیزی سے آگے بڑھانے لگا۔ وہ رو رہی تھی۔ حماد اسے بڑی محبت اور بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''خدا کے لئے اپنے آنسو پونچھ لو۔ انہیں دیکھ کر تکلیف ہو رہی ہے۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''ہمارا وہ تین منزلہ مکان کیا ہے؟ بارود کا ڈھیر ہے۔ بشارت چچا کہنے کو آتش بازی کا کاروبار کرتے ہیں۔ لیکن پٹاخے چھوڑنے، بم پھوڑنے اور آگ لگانے کا دھندہ کرتے ہیں۔ تمہارے امی اور ابو پورے مکان پر قبضہ جمانے کے لئے سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ میری وہ سوتیلی ماں زینت بیگم بھی یہی کرتی تھی۔ وہ تو حرام موت مر گئی۔ لیکن میرے ابو کو کس گناہ کی سزا دی گئی ہے؟ میں یقین سے کہتی ہوں، وہ طبعی موت نہیں مرے ہیں۔ انہیں مارا گیا ہے۔''

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ حماد تلملانے لگا۔ غصے سے مٹھیاں بھینچنے لگا۔ رونے کے انداز میں کہنے لگا۔ ''چپ ہو جاؤ اریمہ! میں تمہارے آنسو پونچھنے کے لئے، تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹیں لانے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اس دنیا کو چھوڑ سکتا ہوں۔ اب اندازہ ہو رہا ہے، میں یہ خودکشی والی موت کیوں قبول کر رہا تھا؟ صرف اس لئے کہ معلم اعلیٰ نے کہا تھا، تم مجھے جنت میں ملو گی۔ بس تمہیں پانے کے لئے ایک غلطی کر رہا تھا۔''

وہ پہلو بدلتے ہوئے اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''بولو اریمہ! بولو.... میں تمہارے لئے کیا کروں؟''

اریمہ نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''ابو تو واپس نہیں آئیں گے۔ میں تمہیں زندگی کی طرف لانا چاہتی ہوں۔ تم زندہ رہو اور دوسروں کو زندگی دو۔ بس اتنا ہی چاہتی ہوں۔''

وہ اپنا دوسرا ہاتھ قمیص میں سے نکالتے ہوئے بولا۔ ''میں سلامتی دے رہا ہوں۔ تمہیں اور سجاد صاحب کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

سجاد نے عقب نما آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں مان گیا۔ میری محبت سے کہیں زیادہ شدت تمہاری محبت میں ہے۔ کسی بھی شک و شبہ کے بغیر تم اریمہ کے سچے عاشق ہو۔''

وہ حماد کے ہاتھ کو اپنے قریب لا کر اسے چوم کر بولی۔ ''بس۔ یہ جیکٹ اتار کر

پھینک دو۔''

اریمہ نے پہلی بار اس کے ہاتھ کو چوما تھا۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے یوں آنکھیں بند کر لیں، جیسے ہواؤں میں اڑ رہا ہو۔ وہ پھر بولی۔ ''پلیز۔ اسے اُتار دو۔''

اس نے آنکھیں کھول کر اسے بڑی محبت سے دیکھا۔ پھر کہا۔ ''میں اس جیکٹ کو اتار نہیں پاؤں گا۔ جنہوں نے پہنایا ہے، وہی جانتے ہیں کہ اسے کس طرح اتارا جاتا ہے؟''

سجاد نے کہا۔ ''ایسی کیا بات ہے؟ میں ابھی کار روک کر چیک کرتا ہوں۔ معلوم تو ہو، اسے کیسے اتارا جا سکتا ہے؟''

''معلومات حاصل کرنے میں ذرا بھی غلطی ہوئی تو اسے اتارتے وقت تم بھی میرے ساتھ فنا ہو جاؤ گے اور میں ایسا نہیں چاہوں گا۔''

اریمہ نے رونے کے انداز میں کہا۔ ''حماد! میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔ پلیز بتا دو، یہ کیسے اترے گی؟''

''میں نے کہا ناں... جنہوں نے پہنائی ہے، وہی جانتے ہیں۔ میں ابھی ان کے پاس جاؤں گا۔''

سجاد نے کار روکتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر پہلے اسی طرف چلو۔ مجھے بتاؤ کدھر جانا ہے؟''

وہ بولا۔ ''تم کار چلاتے رہو۔ پہلے میں اپنے ماں باپ سے ملنے جاؤں گا۔ اس کے بعد ایک شرط پر جیکٹ اتارنے کے لئے معلم اعلیٰ کے پاس جاؤں گا۔''

اریمہ نے پوچھا۔ ''کیسی شرط...؟''

''میں چاہتا ہوں، پہلے تنہا اس گھر میں قدم رکھوں۔ معلوم کروں، وہاں کیا ہو رہا ہے؟ مجھے اندیشہ ہے، تمہارے خلاف سازش ہو سکتی ہے۔ جب تک مجھے اطمینان نہیں ہوگا، میں تمہیں وہاں جانے نہیں دوں گا۔''

سجاد نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''یہ درست کہہ رہا ہے۔''

''آپ اس کی حمایت میں نہ بولیں۔ یہ کبھی کوئی درست کام نہیں کرتا۔ اگر مجھے اس کے ساتھ نہیں جانا چاہئے تو آپ جائیں۔ میں اسے تنہا نہیں جانے دوں گی۔''

حماد نے کہا۔ ''اریمہ! میری بات مانو۔ سجاد صاحب ہماری فیملی کے لئے اجنبی

ہیں۔انہیں ہمارے معاملات میں نہیں پڑنا چاہئے۔میں تنہا وہاں جاؤں گا۔مجھے کچھ نہیں ہوگا۔کوئی میرے خلاف سازش نہیں کرے گا۔معلوم تو کرنے دو آخر تایا ابا کی موت کیسے ہوئی ؟ان کے ساتھ کیا ہوا ہے اور آئندہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ دیکھو اریبہ...!تم میری بات نہیں مانو گی تو میں یہ جیکٹ نہیں اتاروں گا۔"

سجاد نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔"اریبہ!یہ دیکھو کہ حماد تمہاری ہر بات مان رہا ہے۔نہ جانے ایسے کتنے خودکش حملہ آور ہوں گے، جنہیں آج بھی صحیح راستہ دکھا دیا جائے تو زندگی کی طرف لوٹ آئیں گے۔ہمارا تمہارا حماد واپس آرہا ہے۔اس کی بات مان لو۔"

وہ شکست خوردہ انداز میں حماد کو دیکھتے ہوئے بولی۔"اچھی بات ہے۔یہ بتاؤ کتنی دیر میں واپس آؤ گے؟"

"جلد سے جلد حقیقت معلوم کرکے واپس آنے کی کوشش کروں گا۔"

"جلدی نہ آئے تو میں آجاؤں گی۔"

"نہیں۔کسی وجہ سے دیر ہوگی تو میں وہاں سے فون کروں گا۔اپنے حالات بتاؤں گا۔اس کے بعد ہی تم وہاں آؤ گی۔"

وہ قائل ہوکر بولی۔"تم سمجھداری کی باتیں کررہے ہو۔اس لئے مان لیتی ہوں۔"

وہ سرجانی ٹاؤن پہنچ گئے۔حماد نے کہا۔"شاہ جی کے ہوٹل کے پاس گاڑی روک دو۔وہاں سے سوڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ہمارا مکان ہے۔"

سجاد نے اریبہ کی رہنمائی کے مطابق شاہ جی کے ہوٹل سے کچھ فاصلے پر گاڑی روک دی۔ہوٹل کے آس پاس کچھ دکانیں تھیں اور پیچھے مکانات دکھائی دے رہے تھے۔ایک طرف کھلے میدان میں ادھورا پارک بنا ہوا تھا۔اس پارک سے پرے کئی مکانوں کے درمیان ان کا تین منزلہ مکان دکھائی دے رہا تھا۔

اریبہ نے حماد سے کہا۔"میں نے تمہارا ہاتھ بڑی دیر سے اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا ہے۔"

وہ بولا۔"اور میں جو چاہتا تھا، مجھے مل رہا ہے۔کیا ہمیشہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں رکھو گی؟"

اریبہ نے چور نظروں سے سجاد کو دیکھا۔پھر ایک سرد آہ بھر کر کہا۔"ہم اکثر نہ چاہنے کے باوجود بعض فرائض کی ادائیگی اس لئے کرتے ہیں کہ اس سے انسانیت کا بول بالا ہوتا ہے۔"

اس نے پھر کن اکھیوں سے سجاد کو دیکھتے ہوئے کہا۔"دل کسی اور طرف کھنچتا ہے....."

پھر وہ حماد کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام کر بولی۔"اور فرائض کسی اور طرف کھینچتے ہیں...جاؤ حماد!اس یقین کے ساتھ کہ میں تمہارا ہاتھ کبھی نہیں چھوڑوں گی۔"

وہ کار سے اتر کر تین منزلہ مکان کی طرف جانے لگا۔چاندنی رات تھی اور کسی دم صبح ہونے والی تھی۔اسٹریٹ لائٹ میں وہ محلہ، وہ مکان واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔

سجاد اگلی سیٹ پر اس کی طرف منہ پھیرے بیٹھا ہوا تھا۔وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔اس نے کہا۔"تم چاہتی تھیں، ہم کبھی جدا نہ ہوں۔میں بھی یہی چاہتا تھا۔مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ تقدیر ہمارے ساتھ کیسا مذاق کرنے والی ہے؟یہ صاف طور پر نظر آرہا ہے، ہم ملتے ملتے بچھڑنے والے ہیں۔"

حماد اپنے مکان کی طرف جارہا تھا اور سوچ رہا تھا۔"آج اریبہ کو پاکر میں نے سب کچھ پالیا ہے۔میں کوئی نادان بچہ نہیں ہوں۔اچھی طرح سمجھ رہا ہوں، وہ سجاد کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہے۔لیکن میرے لئے بہت بڑی قربانی دے رہی ہے۔"

اس نے پلٹ کر کار کی طرف دیکھا۔ان کے درمیان تقریباً پچاس گز کا فاصلہ قائم ہوگیا تھا۔وہ پھر پلٹ کر جانے لگا اور سوچنے لگا۔"وہ میری زندگی اور میری بہتری چاہتی ہے۔اسی لئے حرام موت سے بچا رہی ہے۔مجھے کیا چاہنا چاہئے....؟"

وہ ایک ایک قدم چلتا ہوا کسی فیصلہ کن نتیجے تک پہنچنا چاہتا تھا۔آخری نتیجہ یہ تھا کہ وہ جیکٹ اس کے بدن سے کھل نہیں سکتی تھی۔اگرچہ یہ ناممکن بات نہیں تھی۔جسے پہنا جاتا ہے، اسے اتارا بھی جا سکتا ہے۔مشکل یہ تھی کہ اس جان لیوا جیکٹ کا پورا سسٹم ایک پن سے منسلک تھا۔معلم اعلیٰ کے حواریوں نے اسے پہنانے کے بعد نہ جانے کس طرح اس کے جسم سے باندھ رکھا تھا؟اسے کس طرح کھولا جا سکتا تھا اور کھولتے وقت کیسی احتیاط کی ضرورت تھی؟وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

اس جیکٹ سے نجات پانے کے لئے معلم اعلیٰ کے پاس جانا ضروری تھا اور وہ اچھی طرح جانتا تھا' وہ لوگ جنت کی طرف جانے والے راہی کو اریمہ کی طرف آنے کا راستہ نہیں دیں گے۔

وہ اریمہ اور سجاد سے بھی یہ کہنا نہیں چاہتا تھا کہ اسے کسی بھی طرح اس جیکٹ سے نجات دلائیں۔ وہ ایک ذرا سی غلطی کے باعث اس سے ہمدردی کرنے کے دوران مارے جاسکتے تھے۔ اگر وہ کسی طرح معلومات حاصل کرتا ہوا بم ڈسپوزل کے ماہرین تک پہنچتا تو وہ بھی اس خودکش جیکٹ کو دیکھ کر یا تو بھاگ جاتے' یا اس سے نجات دلانے کے بعد اسے ٹارچر سیل میں پہنچا دیتے۔ قانون کے محافظ کبھی یہ تسلیم نہ کرتے کہ وہ راہِ راست پر آچکا ہے۔ اسے طرح طرح کی اذیتیں پہنچا کر دیگر دہشت گردوں اور خودکش حملہ آوروں کے پتے ٹھکانے معلوم کرنے کی کوششیں کی جاتیں۔ جبکہ وہ کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ صرف معلم اعلیٰ کی ذات تک محدود تھا۔ اس معلم کے پیچھے پھیلی ہوئی دہشت گردی کے نیٹ ورک کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔

اس کے دل نے کہا۔ ''اریمہ نے اپنی محبت مجھے دی ہے۔ اپنا ہاتھ دے رہی ہے۔ اپنا سارا وجود بھی دے گی لیکن میں اس چاہنے والی کی روح کو نہ پاسکوں گا۔ اسے اندر سے زخمی کرتا رہوں گا.... نہیں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ وہ میرے لئے قربانی دے رہی ہے۔ کیا میں اس کے لئے قربانی نہیں دے سکتا....؟''

اس نے دروازے پر پہنچ کر کال بیل کا بٹن دبایا۔ تھوڑی دیر بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ بشارت چچا نے حماد کو دیکھتے ہی اس کی ماں کو آواز دی۔ ''بھابی! یہ تمہارا بیٹا آگیا ہے... آؤ حماد! اندر آؤ۔''

اس دروازے کے ساتھ ہی آتش بازی کا سامان فروخت کرنے والی دکان تھی۔ اس کے پیچھے ایک بہت بڑا ہال کمرہ تھا۔ وہاں شورئ' گندھک اور پٹاس وغیرہ کا ذخیرہ رہتا تھا۔ حماد وہاں چلا آیا۔ بشارت نے کہا۔ ''ارے بیٹا! وہاں کیوں جارہے ہو؟ اندر کمرے میں چلو۔''

ایسے ہی وقت اس کی ماں روتی ہوئی آئی۔ آگے بڑھ کر بیٹے سے لپٹنا چاہتی تھی۔

وہ پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''رو کیوں رہی ہیں؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہئے۔ بیٹا واپس آگیا ہے۔ اریمہ بھی بہو بن کر آئے گی تو اس مکان کا اوپری حصہ ہمارے نام ہوجائے گا۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''بیٹے! ایک بہت بڑا صدمہ پہنچانے والی بات ہے۔ تمہارے ابو کو نشے کی طلب ہورہی تھی۔ وہ پڑیا لانے کے لئے باہر گئے تھے۔ کسی نے انہیں قتل کردیا۔''

حماد نے ایکدم سے ٹھٹک کر بشارت چچا کو گھورتے ہوئے دیکھا۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''تم۔ تم مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟''

''کیا تم سب مجھے نادان بچہ سمجھ رہے ہو؟ کیا میں نہیں جانتا' تم میری ماں کے ساتھ پورے مکان پر قبضہ جمانے کے لئے کیسا گیم پلے کررہے ہو؟ میرے ابو کو کسی اور نے نہیں' تم نے قتل کیا ہے۔ یا کسی سے کرایا ہے۔''

بشارت نے اس کی ماں سے کہا۔ ''بھابی! سن رہی ہیں' آپ کا بیٹا کیا کہہ رہا ہے؟ مجھ پر کتنا بڑا الزام لگا رہا ہے؟''

حماد نے قمیص کے دامن کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں زیادہ وقت برباد نہیں کروں گا۔ یہ دیکھو۔ بشارت چچا! تم نے اس کمرے میں بارود کا ذخیرہ کیا ہے۔ اس مکان پر قبضہ جمانے کے لئے پہلے تایا ابا کے اور پھر میرے ابو کے قدموں تلے بارود بچھائی ہے۔''

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے خوفزدہ ہوکر اس خودکش جیکٹ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی ماں نے گھبرا کر پیچھے ہٹتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ... یہ کیا ہے؟''

بشارت نے رونے کے انداز میں چیخ کر کہا۔ ''یہ... تمہارا بیٹا خودکش حملہ آور بن گیا ہے۔ ہماری موت کا سامان لے کر یہاں آیا ہے۔''

''زیادہ نہ بولو۔ یہ بتاؤ' تایا ابا کی موت کیسے ہوئی؟''

ماں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''بیٹے! ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ ہا.... ہم نے تمہاری بھلائی کے لئے ایسا کیا ہے۔ تم اریمہ سے شادی کرکے اس مکان کے اوپری حصے کے مالک بن جاؤ گے۔ پھر تمہارے ابو بھی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔''

وہ گرجتے ہوئے بولا۔ ''زیادہ مت بولو۔ اپنے جرم کا اعتراف کرو' کیا ابو کو بھی قتل

کیا گیا ہے؟"

بشارت نے کہا۔ "بیٹے! ہمیں غلط نہ سمجھو۔ ہم نے تمہارے ابو کو قتل نہیں کیا..."

وہ بلاسٹ کرنے والی پن کو چٹکی سے پکڑتے ہوئے بولا۔ "یہ ابھی اپنی جگہ سے ہٹے گی اور ہم سب کے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔ دنیا اپنی جگہ رہے گی مگر ہم نہیں رہیں گے۔ سچ بولو ورنہ...."

وہ جلدی جلدی ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "ہاں۔ ہاں۔ ہم نے تمہارے ابو کو ٹھکانے لگایا ہے...لیکن بیٹا! یہ بات کسی سے نہ کہنا۔ اس میں تمہاری بھی بہتری ہے۔"

وہ غصے سے بولا۔ "لعنت ہے ایسی بہتری پر...بہتری تو وہ ہے' جو اریمہ مجھ سے کر رہی ہے۔ تم سب پر تو ہمیشہ کے لئے تھوک دینا چاہئے....آخ تھو...."

اس نے ان کی طرف تھوکتے ہوئے پن کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا۔

یکبارگی اریمہ کے حلق سے چیخ نکلی۔ دور وہ تین منزلہ مکان ایک دھماکے سے تنکوں کی طرح اڑ رہا تھا۔ محلے سے شور بلند ہو رہا تھا۔ لوگ اپنے مکانوں سے نکل کر بھاگ رہے تھے۔ وقفے وقفے سے آتش بازی کے بم بھی پھٹ رہے تھے۔ دہشت زدہ لوگوں پر اور زیادہ دہشت طاری کر رہے تھے۔

اریمہ کار سے نکل کر بھاگتی ہوئی اُدھر جانا چاہتی تھی۔ سجاد نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا....اسے سجاد نے نہیں...بچپن سے چاہنے والے نے اپنی طرف آنے سے روک دیا تھا۔

ہماری دنیا میں آگ اور خون کے دریا بہتے رہتے ہیں۔ دھماکے بھی گونجتے رہتے ہیں۔ مگر یہ ساری آوازیں' سارے دھماکے آخر کو دم توڑ دیتے ہیں۔ اگر دم ہے تو صرف ایک ہی آواز میں ہے اور وہ پانچوں وقت گونجتی رہتی ہے....دور کسی مسجد سے فجر کی اذان گونج رہی تھی۔ "اللہ اکبر۔ اللہ اکبر....آؤ نماز کی طرف آؤ...آؤ بہتری کی طرف آؤ...."

ختم شد